رجسٹرڈ نمبر اے ۴۲۶

داغ نمبر (سالنامہ ۱۹۵۳ء)

نگار

ہندوستان وپاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۶؎

سالانہ چندہ پاکستان وہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا، اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ لغہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے ۱۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و رہان ہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود و عمر

ضخامت ۳۶۲ صفحات کاغذ سفید سنہ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ ۴

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات بہ تشریح تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں کچھ حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

داغ نمبر

(سالنامہ سنہ ۵۳ء)

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۳ | مضامین جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۳ء | شمارہ ۱-۲

داغ کا فن	نیاز فتحپوری	۲
داغ (تاریخ ولادت سے ورود رام پور تک)	کلب علی خاں فائق رامپوری	۹
داغ — ترجمان و رہنمائے دور	پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین	۱۷
فصیح الملک حضرت داغ دہلوی	جناب نوح ناروی	۲۵
داغ کی شاعری میں لب و لہجہ کی اہمیت	پروفیسر اختر ارینوی	۳۵
رام پور اور داغ	محمد علی خاں اثر رامپوری	۴۳
داغ کے غیر مطبوعہ خطوط	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۴۶
داغ اور ان کے معاصرین	پروفیسر نفیس سندیلوی	۵۳
طرزِ داغ میں رنگِ مومن کی جھلکیاں	پروفیسر وقار عظیم	۶۵
داغ عظیم آباد میں	ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی	۸۵
کلامِ داغ میں محبوب کا تصور	پروفیسر شریف انصاری لاہور	۹۰
داغ	پروفیسر فراق گورکھپوری	۹۸
داغ کی عشقیہ شاعری میں رندی اور شاہد پرستی	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۰۱
داغ کی شاہد پرستیاں	یاسین علی خاں بی۔ اے	۱۱۰
داغ کی اصلاحیں	سخاوت مرزا بی اے، ال، ال، بی۔ اور یاسین علی خاں بی، اے	۱۱۵
داغ (بیک نظر)	علی کاظمی حیدر آباد (دکن)	۱۲۰
داغ کی شخصیت	پروفیسر شوکت سبزواری	۱۲۱
داغ کے بعض مشہور تلامذہ	پروفیسر نفیس سندیلوی	۱۳۱/۱۳۶

داغ کا فن

(نیاز فتحپوری)

اب سے تقریباً ۵۲ سال پہلے کی بات ہے۔ میرے والد پنشن لینے کے بعد رامپور میں وکالت کر رہے ہیں اور میرا قیام بھی بہ سلسلۂ تعلیم وہیں ہے۔ داغ ابھی زندہ ہیں لیکن حیدر آباد میں، امیر مینائی کا دو سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔ نواب حامد علی خاں کا دورِ حکومت ہے، اساتذہ میں امیراللہ تسلیم، جلال لکھنوی وغیرہ زندہ ہیں اور دربار رام پور سے وابستہ۔ نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں جو شاعرانہ فضا رام پور کی تھی وہ تو خیر نہیں ہے، پھر بھی شعر و شاعری کا کافی چرچا ہے، عام مشاعروں کے علاوہ سرکاری مشاعرے بھی گاہ گاہ ہوتے رہتے ہیں جن میں نواب خود بھی شریک ہوتے ہیں، شعراء کے کلام کی داد دیتے ہیں اور اپنے کلام کی بھی دوسروں سے بے پناہ داد لیتے ہیں۔ مشاعرہ کے دوران ہی میں نواب خاصہ بھی کھاتے ہیں (رات کا خاصہ وہ عموماً بہت دیر میں کھاتے تھے) چائے کا دور بھی چلتا ہے اور شام سے صبح تک یہ چہل پہل قائم رہتی ہے۔ میں خود بھی بعض مشاعروں میں تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا ہوں

فارسی کہنے والے شعراء میں مولوی فرخی (نواب صاحب کے استاد) سنجر ایرانی اور میرے والد کے درمیان (جنھیں امام بخش صہبائی سے تلمذ حاصل تھا) اکثر فارسی شعر و سخن کا چرچا رہتا اور اس صحبت میں عرب محمد طیب (جو مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل اور غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے انسان تھے) اور حکیم محمد اجمل خاں بھی شریک ہوتے ہیں

رام پور کا یہ وہ دور تھا جب شعراء کے علاوہ اچھے اچھے علماء، وفضلاء بھی وہاں موجود تھے اور اکثر علمی و ادبی صحبتیں برپا ہوتی رہتی تھیں۔ امیر مینائی سے میرے والد کو بڑی عقیدت تھی، غالباً اس لئے کہ وہ بڑے زاہد و متقی تھے، شاہ مینا کی اولاد میں سے تھے اور ہر چند اُس وقت ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے بلندیِ اخلاق اور زہد و ورع کی داستانیں عام تھیں۔ میرے والد نے ہمیشہ فارسی میں شاعری کی اور وہ بھی صرف نعت و منقبت کے قصاید تک۔ غزل انھوں نے کبھی نہیں کہی، لیکن اردو شاعری میں امیر مینائی کے وہ بڑے مداح تھے اور "صنمخانۂ عشق" کا مطالعہ کبھی کبھی کرلیتے تھے

میرا عنفوانِ شباب تھا، اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا، لیکن شعر کہنے سے زیادہ مجھے سننے کا شوق تھا اور جب کبھی کسی صحبت میں داغ و امیر کا ذکر آجاتا تھا (اور یہ ذکر اکثر آتا) تو میں ہمیشہ داغ کی طرفداری کیا کرتا تھا، جس کا علم میرے والد کو بھی تھا۔ رامپور میں اس وقت بڑی جماعت مداحین امیر ہی کی تھی اور داغی بہت کم تھے

میرے والد داغ کے متعلق بڑا بُرا خیال رکھتے تھے۔ پرانی وضع کے صاف گو پٹھان تھے اس لئے جب کبھی داغ و امیر کا ذکر آتا تو وہ نہایت آزادی سے گرم لہجہ میں کہہ دیا کرتے تھے کہ "داغ اوباش تھا، اسے شعر و شاعری سے کیا تعلق" میں ان سے یہ تو نہ کہہ سکتا کہ غزل اوباش ہی اچھی کہہ سکتا ہے، لیکن دبی زبان سے یہ ضرور کہہ دیتا کہ "آپ صنمخانۂ عشق کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی گلزار داغ کو بھی دیکھ لیا کیجئے، ممکن ہے کوئی شعر آپ کو پسند آجائے" فرماتے "میں عامی و جاہل کا کلام نہیں دیکھتا"

میرے والد صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے، اوراد و وظایف سے بھی دلچسپی تھی اور عموماً بہت تڑکے اپنے تمام فرایض ادا کرکے دہیں نماز کی چوکی پر قبل طلوع آفتاب کھانا کھا لیتے اور اس کے بعد مطالعہ یا نوشت و خواند میں مصروف ہوجاتے

ایک صبح وہ حسب معمول چوکی پر بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے اور میں سامنے ہی چارپائی پر گلزار داغ کھولے شہر آشوب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک ان کی نگاہ اُٹھی اور میرے ہاتھ میں کتاب کھلی ہوئی دیکھ کر بولے "کونسی کتاب ہے"۔ مینے کہا "گلزار داغ"۔ پیشانی پر ہلکی سی شکن ڈال کر خاموش ہوگئے، لیکن فوراً اس کے بعد ہی فرمایا کہ "کون سی غزل پڑھ رہے ہو" میں نے کہا "اسوقت تو میں اس کا "شہر آشوب" پڑھ رہا ہوں"۔ فرمایا "سناؤ" میں نے پڑھنا شروع کیا :۔

فلک جناب و ملایک جناب تھی دلّی   بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کا ہیکو تھا لاجواب تھی دلّی   مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا   یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا   یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانند صبح نورانی   یہاں کے ذرے میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تھا تیرہ لعل رمانی   یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی
یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رشک تجلیِ طور تھا اس کا

میں تین بند پڑھ کر سانس لینے کے لئے رکا ہی تھا کہ وہ بے اختیار بول اُٹھے۔ "حرامزادہ اچھا کہتا ہے، پوری نظم سناؤ" میری زندگی میں یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ داغ کی اتنی اچھی داد میں نے کسی سے سُنی ہو۔ وہ اگر "حرامزادہ" نہ کہتے تو شاید میں اتنا خوش نہ ہوتا لیکن اس بے اختیار داد نے میرے حوصلے بڑھا دئے اور میں نے پورا مسدس لہک لہک کر سنایا۔

اس تمہید سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ امیر کے مقابلہ میں داغ کی شاعری کو میں شروع ہی سے پسند کرتا تھا لیکن کیوں؟ اس کا جواب میں شاید اُسوقت نہ دے سکتا

داغ کی شاعری کی طرف میرا رجحان اس لئے نہ تھا کہ میں اسے بہترین غزل گو سمجھتا تھا، میر، غالب، مومن اور اساتذۂ قدیم میں متعدد شعراء ایسے تھے جن کے ذکر کے ساتھ داغ کا نام لینا بھی مناسب نہ سمجھتا تھا، لیکن جس وقت امیر و داغ کا سوال سامنے آتا (اور اکثر آتا) تو میں داغ ہی کو ترجیح دیتا۔ یوں میں امیر کے علم و فضل اور ان کی اخلاقی بلندیوں کا ضرور معترف تھا، لیکن شاعری میں ان کا کیا ناسخی سلسلے اور خاندانِ اسیر کے کسی شاعر کا قایل نہ تھا۔ لوگ گلزار داغ کے جواب میں امیر کے صنمخانۂ عشق کو پیش کرتے تھے، حالانکہ میرے نزدیک امیر کی کمزوری یہی تھی کہ انھوں نے داغ کی مقبولیت دیکھ کر خود بھی وہی رنگ اختیار کرنا چاہا جو انکے حال کے لحاظ سے کسی طرح موزوں نہ تھا

الغرض جس فضا میں اول اول مجھے داغ کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا وہ وہی تھی جس میں داغ اور امیر کا نام ساتھ ہی ساتھ لیا جاتا تھا اور اسی لئے اس فضا کے ذکر میں مجبوراً مجھے یہ ظاہر کرنا پڑا ورنہ میرا مقصود اس وقت در اصل داغ و امیر کا موازنہ نہیں ہے

اُس وقت تو نہیں لیکن بہت دنوں کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ داغ کا کلام مجھے کیوں پسند آتا تھا۔ میں یقیناً داغ کو بلند غزلگو نہ جانتا تھا، بلکہ سچ پوچھئے تو عامیانہ شاعری کے سلسلہ میں انھیں میں جرأت سے بھی کم سمجھتا تھا، لیکن باوجود اس کے میں ان کے بعض شعروں سے کافی لطف اُٹھاتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ناسخی رنگ، لکھنؤ میں تو خیر مقبول تھا ہی، دہلی میں بھی ٹکسال باہر نہ سمجھا جاتا تھا اور مجھے اس رنگ سے طبعی نفرت تھی، لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور تھا کہ اگر کسی شعر میں زبان کی سلاست و صفائی کے ساتھ ساتھ کوئی تیور بھی ہوتا تھا تو وہ میری توجہ حاصل کر لیتا تھا اور داغ کے کلام میں مجھے یہ چیز اکثر ملجاتی تھی

داغ کی شاعری کا نشو و نما یقیناً دہلی اسکول کی فضا میں ہوا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی مع اپنی تمام خصوصیات کے اُجڑ چکا تھا اور غالب و مومن کے ساتھ شاعری کی بساطِ محفل بھی ہمیشہ کے لئے الٹ چکی تھی۔ اس لئے داغ کو کچھ زمانہ تک غالب و مومن کا ماحول تو میسر آیا، لیکن وہ اس سے کوئی فایدہ نہ اُٹھا سکے، کیونکہ ان کی پرورش قلعہ کے اندر ہو رہی تھی جہاں باوصف تاراجی خزاں کے بہار کے کچھ کچھ نشانات باقی تھے اور چنگ و رباب ہنوز ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا۔ قلعہ کی بیگمات، قلعہ کی خواصیں اور مغلانیاں، ان کی زبان اور چوچلے، قلعہ کی رنگ رلیاں، یہ تھی وہ فضا جس میں داغ کی شاعری کی بنیاد پڑی پھر لطف یہ کہ اسی کے ساتھ استاد ملا انھیں ذوق ایسا شاعر جو زبان اور محاورات ہی کا شاعر تھا، اس لئے داغ کی شاعری کو زبان کی شاعری ہونا ہی تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس باب میں ان کی خدمات بڑی گرانقدر ہیں

جب دہلی اُجڑنے کے بعد وہ رامپور پہونچے تو خوش قسمتی سے یہاں بھی شاعری کا وہی دور تھا جس میں زبان کے چوچلوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ سازگار فضا ان کے لئے اور کیا ہوسکتی تھی۔ اس لئے وہ یہاں جلد جم گئے اور خوب پھلے پھولے۔

داغ نے اپنی جس رنگ کی شاعری سے شہرت حاصل کی وہ صرف داغ کے لئے مخصوص نہ تھا، اس وقت کے تمام شعراء ایک ہی حمام کے نہانے والے تھے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ داغ سے زیادہ کوئی دوسرا شاعر مقبول نہ ہوسکا۔ کوچہ و بازار اور محافلِ رقص و سرود میں ہر جگہ داغ ہی کا سکہ چلتا تھا اور انھیں کی غزلوں پر دنیا سر دھنتی تھی

داغ کے ہمعصر شعراء میں اس وقت علاوہ امیر کے منیر شکوہ آبادی، جلال لکھنوی اور تسلیم لکھنوی بھی زندہ تھے، لیکن داغ سے زیادہ قبولِ عام کسی کو حاصل نہ ہوسکا اور اس کے کچھ اسباب بھی تھے

منیر اس میں شک نہیں بڑے پُرگو شاعر تھے، لیکن ان کے کلام میں تکلف و آورد کے سوا کچھ نہ تھا اور ان کی دور از کار تشبیہات و استعارات سے عوام کیا خواص کو بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، زبان و بیان کا کوئی لطف ان کے یہاں نہ تھا اور سطحی و عامیانہ قسم کے جذباتِ محبت بھی ان کے کلام میں پائے جاتے تھے۔ اس لئے داغ کے سامنے ان کو کون پوچھتا، جلال اور تسلیم بیشک بڑے خوش فکر و خوشگو شاعر تھے، لیکن داغ کے سامنے ان کا چراغ بھی نہ جل سکا، کیونکہ تسلیم کی شاعری بڑی حد تک دہلی اسکول کی جذباتی شاعری تھی اور اس کی مانگ اُس زمانہ میں نہ تھی۔ جلال بیشک فن کا بڑا ماہر تھا اور اس حیثیت سے داغ اس سے بہت فروتر تھے لیکن جس حد تک زبان و بیان کا تعلق ہے داغ ان کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب تھے اور اسی لئے وہ جلال سے بھی بازی لے گئے، حالانکہ استاد اور ماہرِ فن ہونے کی حیثیت سے جلال بڑے مرتبہ کا شاعر تھا

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا داغ کے کلام میں زبان و بیان کے لطف کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے جس نے اسے مشہور کر دیا اور وہ اس کا تیور ہے۔ تیور سے کیا مراد ہے، اس کی صراحت ضروری ہے

شاعری میں تیور کا تعلق دو چیزوں سے ہے، لب و لہجہ اور اظہارِ خیال کا ڈرامائی طریقہ۔ لب و لہجہ کا تعلق زبان و محاورہ سے ہے اور اظہارِ خیال میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے الفاظ کی نشست اور ان کی سلاست و روانی سے۔ اور ان دونوں باتوں کیلئے

ایک خاص ذوق درکار ہے، جو موقع و محل کے لحاظ سے اظہارِ خیال کے لئے مناسب زاویہ کے انتخاب کی طرف رہبری کرسکے اور داغ میں بہ نسبت اپنے ہمعصر شعراء کے یہ ذوق و سلیقہ زیادہ پایا جاتا تھا

غزل میں قافیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس کے نباہنے کے مختلف طریقے ہوسکتے ہیں، بعض بالکل سامنے کی بات لیکر قافیہ کا صرف کرتے ہیں، بعض اس کے لئے نیا خیال، نیا زاویۂ اظہار ڈھونڈھتے ہیں لیکن الفاظ ایسے تلاش کرتے ہیں کہ بات بالکل عامۃ الورود نظر آنے لگتی ہے

داغ کو اس بات میں بڑا ملکہ حاصل تھا، بات خواہ وہ کیسی ہی معمولی کہے لیکن اس میں ایسی بے تکلفی، ایسا تیور اور تیکھاپن ہوتا تھا کہ قافیہ جاگ اٹھتا تھا اور پورا شعر بیچ کر رہ جاتا تھا

داغ کی ایک غزل ہے جس میں ردیف و قافیہ دونوں غیر شگفتہ ہیں — "سم کی طرح - دم کی طرح"— ایسی زمین میں رواں و سلیس اشعار نکالنا مشکل ہے، لیکن داغ نے اپنے رنگ کی خصوصیت اس میں بھی قایم رکھی۔ مثلاً اسی زمین میں ارم قافیہ کو لیجئے اس سلسلہ میں باغِ ارم بالکل سامنے کی چیز ہے جو ہر شخص کے ذہن میں آسکتی ہے اور پھر اس کے ساتھ ایک باغ کی جو خصوصیات ہوسکتی ہیں وہی سامنے آنا چاہئے، لیکن داغ نے اس قافیہ کو نظم کرنے کے لئے ایک ایسا زاویہ تلاش کیا جو ہر شخص کے ذہن میں نہ آسکتا تھا اور اس کو یوں نظم کیا:-

کوچۂ دشمن کو وہ جنت کہیں !!

مٹ نہ گیا باغِ ارم کی طرح

دوسرے مصرعہ کو اُسی تیور سے پڑھئے جس تیور سے کہا گیا ہے تب آپ سمجھ سکیں گے کہ ایسی غیر شگفتہ زمین ایسے خشک قافیہ کو اس خوبی اور ایسے دلکش تیور سے نظم کرنا ہر شاعر کا کام نہ تھا

داغ کی ایک اور غزل ہے — "کام نہیں، قیام نہیں"— اس زمین میں کلام کا قافیہ بالکل سامنے کا ہے اور اسکو نظم کرنے کی صورتیں بھی مختلف ہوسکتی ہیں، لیکن داغ نے جس پہلو سے اسے صرف کیا وہ انھیں کا حصہ تھا، لکھتے ہیں:-

سنائی جاتی ہیں در پردہ گالیاں مجھ کو

کہوں جو میں تو کہیں "آپ سے کلام نہیں"

اس قافیہ کے نظم کرنے میں داغ کا خیال محبوب کی جس تیکھی ادا کی طرف منتقل ہوا ہے اگر وہ عملی زندگی میں اس سے دوچار نہ ہوا ہوتا تو قیامت تک اس پہلو سے یہ قافیہ نظم نہ کرسکتا

اسی زمین کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے :-

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا

کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں

پہلا مصرعہ نہایت معمولی ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں قافیہ نے خاص لطف پیدا کر دیا۔ بجائے یہ کہنے کے کہ "ان کی ذات سے دُنیا میں فتنہ و فساد برپا رہتا ہے"، صرف یہ کہنا کہ "کچھ ان کی ذات سے دُنیا کا انتظام نہیں"۔ بڑی لطیف بات ہے

بالکل اسی طرح کا بلکہ اس سے زیادہ کامیاب شعر داغ کا ایک اور ملاحظہ ہو:-

چلے جو وہ تو قیامت بپا تھی چار طرف

ٹھہر گئے تو زمانہ کو انقلاب نہ تھا

دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو۔ اگر یوں کہا جاتا کہ "زمانہ میں سکون ہی سکون تھا" تو یہ لطف پیدا نہ ہوتا، داغ کا

یہی وہ انداز بیان ہے جسے میں اس کا تیور یا تیکھاپن کہتا ہوں

داغ کی اس خصوصیت کا پتہ اس وقت زیادہ چل سکتا ہے جب ایک ہی ردیف و قافیوں میں دوسروں کے اشعار کے ساتھ داغ کے اشعار کا مقابلہ کیا جائے۔ پروفیسر نفیس سندیلوی کے ایک مضمون سے جو اسی پرچے میں "داغ اور اُنکے معاصرین" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، ہم چند اشعار لیکر بتاتے ہیں کہ داغ کا زاویۂ فکر دوسروں سے کسقدر مختلف، اچھوتا اور دلکش ہوتا تھا

ایک زمین ہے۔ "آہ میں – چاہ میں"۔ اس میں نگاہ کے قافیہ کو داغ، امیر اور جلال سبنے نظم کیا ہے۔

امیر کا شعر ہے:-
آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے
جس کے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ میں

علاوہ اس کے کہ دوسرے مصرعہ میں "ہیں" اور "ہے" کے قرب کی وجہ سے پڑھنے میں صوتی تنافر پیدا ہوگیا ہے، یوں بھی قافیہ سے ایک پیش پا اُفتادہ مضمون کو ظاہر کیا گیا ہے

جلال کہتے ہیں:-
شوخی، فریب، سحر، فسوں، لاگ، شعبدہ
کتنے کرشمے دیکھے تری اک نگاہ میں،

شعر میں تکلف ہی تکلف ہے۔ تاہم امیر کے شعر سے اچھا ہے گو کوئی خاص بات نہیں، برخلاف اس کے داغ کی اُپج ملاحظہ ہو کتے ہیں:-

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

داغ نے جس زاویۂ نگاہ کو سامنے رکھکر اس قافیہ کو نباہا ہے وہ بالکل نیا اور اچھوتا ہے

اسی زمین میں راہ کے قافیہ کو امیر نے اس طرح نظم کیا ہے:-

اُٹھتا نہیں ہے اب تو قدم مجھ غریب کا
منزل سے کہدو دوڑ کے لے مجھ کو راہ میں

امیر کا زاویۂ نظر اس قافیہ میں ضرور نیا ہے لیکن خود منزل کا دوڑکر کسی کو راہ میں لینا، حقیقت سے متباعد اور یکسر تکلف و تصنع ہے، برخلاف اس کے داغ کو دیکھئے کہتے ہیں:-

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار،
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

پورا شعر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور ایک ایسے تجربہ کو پیش کر رہا ہے جو محبت میں اکثر پیش آتا ہے۔ امیر کو چونکہ محبت اور بیقراری محبت کی سعادت کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اس لئے ان کا ذہن اس طرف منتقل ہو ہی نہ سکتا تھا

ایک زمین ہے — "رواں کی طرح، جہاں کی طرح"— اس میں خزاں کے قافیہ کو امیر و داغ دونوں نے نظم کیا ہے لیکن داغ کے یہاں یہ قافیہ شعر کی جان ہے اور امیر کے یہاں بے جان - امیر کا شعر ہے:-

نویدِ وصل مٹاتی ہے دل کے داغوں کو	بہار لوٹتی ہے باغ کو خزاں کی طرح

داغ کہتے ہیں:-
جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا	بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

آخری مصرعہ دونوں کے یہاں قریب قریب ایک سے ہیں، لیکن داغ کا مصرعہ بہت صاف ہے اور امیر کے یہاں قافیہ بیکار سا ہوگیا ہے۔ کیونکہ جب لوٹنے کا ذکر پہلے کر دیا گیا تو پھر خزاں کی قید کے کیا معنی، داغ کے یہاں یہ عیب نہیں ہے۔ اس نے لوٹنے کا اظہار کہیں نہیں کیا، بلکہ صرف اندازِ بیان سے یہ مفہوم پیدا کر دیا

ایک زمین ہے — "باتوں میں - گھاتوں میں"۔
خراباتوں کو امیر و داغ دونوں نے نظم کیا ہے
امیر کا شعر ہے :-

مسجدوں میں ہیں یہ ہو حق کے کہاں ہنگامے
رنگِ توحید اُچھلتا ہے خراباتوں میں

خرابات میں رنگِ توحید اُچھلنے کا کوئی ثبوت موجود نہیں، محض ہو حق کو سامنے رکھ کر انھوں نے یہ بات بنائی ورنہ جو چیز مسجد میں ہو حق ہے، وہ خرابات میں "ہنگامۂ نوشا نوش" ہے۔ ہو حق کے معنے ہنگامہ کے بھی ہیں لیکن ہر ہنگامہ ہو حق نہیں کہلاتا
داغ کہتے ہیں :-

ابرِ رحمت ہی برستا نظر آیا زاہد
خاک اُڑتی کبھی دیکھی نہ خراباتوں میں

اسی رنگ کے چند اور شعر سنئے جن سے کلام داغ کی برجستگی، سلاست و روانی، شوخی اور خصوصیت کے ساتھ لب و لہجہ کی ڈرامائی کیفیت بخوبی ظاہر ہوتی ہے :-

شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل کو پیدا کرو حیا کے لئے

اس کے ہاتھوں سے یہی ذلت و خواری ہوگی
غیر اپنی تو خبر لیں مجھے کیا کہتے ہیں

اب کی کچھ منھ سے نکالا تو تمھیں جانو گے
داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برا بر نہ کہوں

✓ ناروا کہئے ناسزا کہئے
کہئے کہئے مجھے بُرا کہئے

ہوش جاتے رہے رقیبوں کے
داغ کو اور باوفا کہئے

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

لے ہی تو آئیں گے اسے ہمدم
میرے ہی نام سے تو آئے گا

✓ ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مر گئے
چٹکی میں تھا جو تیر، وہ لب پر سخن ہوا

یہ داغ رند کب آلودۂ شراب نہ تھا،
خراب آج ہوا، آج تک خراب نہ تھا؟

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا،
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا،

ہاں امتحانِ برقِ تجلی ضرور تھا
کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا

✓ جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
تجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

گالیاں غیر کو دیتا ہوں، سنو تم خاموش
میں بھی دیکھوں تو بڑے بات نہ کرنے والے

✓ تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

تمام بزم جسے سن کے رہ گئی مشتاق
کہو وہ تذکرۂ ناتمام کس کا تھا،

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے
تمھیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

آپ ان اشعار کا لطف اسوقت تک حاصل ہی نہیں کر سکتے جب تک آپ انھیں ایک خاص لب و لہجہ سے نہ پڑھیں، پڑھنے کا وہ مخصوص تیور اختیار نہ کریں جو داغ نے شعر کہتے وقت اختیار کیا تھا۔ طعن و تشنیع، ہزل و استہزاء، جلی کٹی، حسرت و یاس، نفرت و بیزاری، غصہ و برہمی، زیادہ تر یہی وہ چیزیں ہیں جن کو داغ کی شاعری کے عناصر ترکیبی کہہ سکتے ہیں اور ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ شاعر کے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے کہ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ داغ شعر میں باتیں کرتا ہے اور باتیں بھی معمولی، لیکن اپنی بات سنانے اور منوانے کے لئے وہ کہتا اس طرح ہے کہ بے اختیار سننا اور ماننا پڑتا ہے۔ داغ ایک ایسا فن کار ہے جو صرف اپنے مخصوص

فن کی نمایش کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہیں رکھتا، وہ اس فن کار کی طرح ہے جو ایک برہنہ عورت کا مجسمہ پیش کرتا ہے اور صرف فن کے نقطۂ نظر سے اس کی داد چاہتا ہے اور ان لوگوں سے اس کا خطاب نہیں، جو اس عریاں مجسمہ کو اخلاقی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں

داغ جس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، وہ تمام دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف تھا۔ اب تک کسی نواب خاندان کے کسی بچّہ کو کبھی یہ سعادت نصیب نہ ہوئی تھی کہ وہ قلعۂ معلیٰ میں پرورش پا سکے، لیکن داغ کے لئے یہ فخر بھی مقسوم ہوچکا تھا اور وہ بہت کمسنی ہی میں قلعہ کی اس فضا میں پہونچ گئے تھے، جہاں انسان قبل از وقت جوان اور جوانی سے پورا فایدہ اٹھانے پر مجبور ہوجاتا ہے اس فن میں عشق و محبّت کا کیا ذکر دل میں کسک پیدا کر دینے والی ہلکی چوٹیں بھی میسر نہیں آتیں

داغ نے تقریباً ۲۰ سال اپنی عمر کے اسی فضا میں بسر کئے، یہیں جنسی جذبات ان میں پیدا ہوئے، یہیں ان کی خاطر خواہ تسکین ہوتی رہی اور انھیں کا بیان ان کی شاعری کا موضوع قرار پایا۔ اس کے بعد جب رام پور گئے تو وہاں بھی عیش و نشاط کا یہی رنگ انھیں نظر آیا، اور پھر جب اخیر میں حیدر آباد میں پہونچے تو قسمت نے زیادہ یاوری کی اور اب عورتوں کا التفات خرید کرنے کی استطاعت بھی ان میں پیدا ہوگئی۔ الغرض شروع سے اخیر تک داغ کی شاعری عیاشانہ حدود سے آگے نہ بڑھ سکی اور نہ داغ نے اس سطح سے بلند جانے کی کوشش کی۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا اور یہی ان کا کمال

غالب عمر بھر میں صرف "ایک ڈومنی کو مار رکھنے" کے علاوہ اور کچھ نہ کرسکے، مومن کو کسی پردہ نشین خاتون سے عشق ہوا اور ساری عمر اپنی ناکامی کا ماتم کرتے رہے، جرأت کی محبوبہ نے ہمیشہ ان کو دھوکا دیا اور یہ کچھ نہ کرسکے۔ داغ کا مسلک یہ تھا کہ:-

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں

اور اس لئے ان کے لگاؤ میں کبھی عجز و نیاز کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی، وہ جس سے تعلق پیدا کرتے تھے اس کو اپنا محکوم بھی رکھنا چاہتے تھے اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہوتا تھا تو سودا کسی اور سے ہوجاتا تھا، الغرض داغ کی شاعری اس جنسی تعلق کی شاعری تھی جسے ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے اور جس کو ترک کرکے زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی، لیکن یہ سمجھنا کہ اس قسم کی شاعری کوئی جان نہیں رکھ سکتی غلط ہے۔۔۔ عیاشانہ زندگی اختیار کرنا اور اسے نباہنا آسان بات نہیں اس میں بھی خدا جانے کتنے نئے موڑ سامنے آتے ہیں، کن کن پیچیدہ راہوں سے گزرنا ہوتا ہے اور کتنے وار روکنے پڑتے ہیں

کوٹھے کے نیچے "غریبانہ آہ کرکے بیٹھ رہنے والے"، کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کوٹھے تک پہونچ جانے والے کیسی کیسی مشکلیں جھیل چکے ہیں اور زانوئے یار دبا کر بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ کن کن مخالف قوتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ الغرض عیاشی آسان نہیں، ایک مستقل فن ہے اور اسی فن کی نمایش داغ نے اپنی شاعری میں کی ہے

اس میں شک نہیں جس حد تک جذبات کی بلندی اور فکر و تخیل کی گہرائی کا تعلق ہے، داغ کی شاعری کچھ نہیں، لیکن جس حد تک زبان کی صفائی و بیان کی سلاست، محاورات کی برجستگی، اور بے تکلفانہ اظہار خیال کا تعلق ہے بہت کم شاعر ایسے ہیں جو داغ کے مقابلہ میں پیش کئے جاسکیں اور یہ داغ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ادب اُردو کا کوئی مورخ اس کو نظر انداز کرکے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے بعض حضرات کے مقالے سالنامہ میں شامل نہ ہوسکے۔ خصوصیت کے ساتھ جناب تمکین کاظمی کے دو مقالے جو انھوں نے "داغ اور حیدرآباد"۔ "داغ اور نظام" کے عنوان سے لکھے تھے۔ (نیاز)

داغ

(تاریخ ولادت سے ورود رامپور تک)

(کلب علی خاں فایق رام پوری)

نواب[1] مرزا خاں داغ دہلوی بتاریخ ۱۲[2] ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء بدھ کے دن دو بجے دہلی محلہ چاندنی چوک میں پیدا ہوئے، والد کا نام نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ کہا جاتا ہے۔

احسن[3] مارہروی کا بیان ہے:-

"جبکہ آپ کے والد کا انتقال ہوا تو اُس زمانہ میں مرزا صاحب اتنے خورد سال تھے کہ آپ کو اُن کے متعلق اُسوقت کی کوئی بات بھی یاد نہیں، بہرحال اس پریشانی کے عالم میں مرزا صاحب کی والدہ ماجدہ نے صاحبِ عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کے دامن عاطفت میں پناہ لی اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ محل شاہی میں گزارا، اور نواب شوکت محل بیگم صاحبہ خطاب پایا، مرزا صاحب اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ شاہی میں پہونچے اور گویا وہیں آپ کی تعلیم کی بسم اللہ ہوئی، اگرچہ تعلیم کا سلسلہ اس سے پہلے شروع ہوچکا تھا اور رام پور میں مولوی غیاث الدین، صاحب غیاث اللغات سے فارسی کی کتابیں پڑھی تھیں مگر پھر قلعہ میں آکر مستقل طور سے مولوی سید احمد حسین ولد میر غلام حسین شکیبا جو میر تقی میر کے شاگرد تھے، آپ کے معلم مقرر ہوئے، فارسی کی درسی کتابیں مرزا صاحب نے انھیں بزرگ سے تمام کیں ...... شاعری کا چرچا دیکھ کر مرزا صاحب کو شوق ہوا تو صاحبِ عالم مرزا ولی عہد نے حضرت ذوق کا شاگرد کیا، اُس وقت آپ کا سن گیارہ یا بارہ برس کا تھا مرزا صاحب نے پہلے پہل نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی۔"

یہ حالات مرزا صاحب کے بیان کردہ ہیں جو احسن مارہروی مرحوم نے قلمبند کئے، لیکن بیان واقعات میں عمداً ایسا اُلجھاؤ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اس بیان کو ہم صحیح مان لیں تو نہ تو مرزا صاحب کے حالات سے باخبر ہوسکیں گے اور نہ اُن کے حالات سے وہ نتائج برآمد کرسکیں گے جو اُن کی شاعری پر آیندہ زندگی میں اثر انداز رہے اس لئے مجبوراً ہم اُن کے ماحول کے اُن گوشوں کو بے نقاب کر رہے ہیں جس کے باعث نواب مرزا صاحب فصیح الملک نے غزل گوئی میں انفرادی مقام پیدا کیا- اور قیام رام پور کے زمانہ میں وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہوگئے، اُن کی والدہ کا اثر اُن کے کردار میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اسلئے تذکرہ نگاروں کی رائے ثبوت میں پیش ہے-

مولوی عبدالغفور نساخ صاحب سخن شعرا[4] لکھتے ہیں:-

"داغ تخلص، نواب مرزائے دہلوی ولد چھوٹی بیگم شاگرد شیخ محمد ابراہیم ذوق ملازم نواب رام پور، راقم نے اس شخص کو دہلی میں دیکھا ہے"

---

[1] اصل نام نواب ابراہیم تھا شادی کے بعد اُن کے احباب نے نواب مرزا سے ان کو ملقب کیا اور آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہوئے۔ آئینہ داغ ص۸۶۱

[2] جلوۂ داغ ص۸ -[3] جلوۂ داغ صفحات ۱ تا ۱۳ - [4] سخن شعرا- طبع نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء

نساخ سے داغ کے خصوصی تعلقات سفر کلکتہ ۱۸۸۲ء کے بعد بڑھے، نساخ نے دہلی کی عام روایت کو سادگی سے ظاہر کر دیا۔ یعنی نواب شمس الدین احمد خاں کو فصیح الملک کا والد نہ لکھا۔ چھوٹی بیگم کا اصل نام وزیر بیگم اور عرف چھوٹی بیگم ہے، باپ کا نام محمد یوسف کشمیری سادہ کار تھا، کشمیری النسل ہونے کے باعث قدرت نے اُن کے حسن و جمال غیر معمولی عطا کیا تھا۔ اسی باعث نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکہ کی پہلی نظر انتخاب ان پر پڑی، یہ واقعہ ۱۲۴۵ھ یا آغاز ۱۲۴۶ھ کا ہوسکتا ہے۔ اس تعلق کی یادگار نواب مرزا خاں داغ تھے لیکن اسی عہد میں مسٹر فریزر ایجنٹ گورنر جنرل دہلی میں تعینات ہوا یہ حسن پرست واقع ہوا تھا غالباً وہ بھی چھوٹی بیگم کے دامِ حسن میں اسیر ہوگیا نواب شمس الدین احمد خاں کی ہندوستانی غیرت اس رقابت کو برداشت نہ کرسکی اور یہ کانٹا راہ سے ہٹا دیا گیا، اس واقعہ کو مولوی بشیر الدین احمد اس طرح لکھتے ہیں[1]:-

"۲۲ر مارچ ۱۸۳۵ء (مطابق ۲۲ر ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ) مسٹر فریزر ایجنٹ گورنر جنرل متعینہ دہلی قتل ہوئے۔ اور اسی سال بماہ اکتوبر ۱۸۳۵ء (۸ر یا ۱۰ر مطابق ۱۵ر یا ۱۷ر جمادی الآخر ۱۲۵۱ھ) فیروز پور کے نواب صاحب کو بہ سازش قتل مذکورۂ بالا پھانسی دی گئی۔"

فریزر کے مارے جانے کا واقعہ یوں ہے کہ فیروز پور جھرکہ کے نواب شمس الدین احمد خاں سے اور فریزر صاحب سے رنجش ہوگئی تھی رنجش کے دو وجوہ بیان کئے جاتے ہیں انگریز تو کہتے ہیں کہ نواب اول درجے کا بدچلن شخص تھا اور فریزر صاحب چونکہ ہمیشہ صلاح و مشورہ سے اُس کی روک تھام کرتے رہتے تھے یہ اُسے ناگوار تھا، ہندوستانی اس واقعہ کی بنا یہ بتلاتے ہیں کہ فریزر صاحب نواب کی کسی رشتہ کی بیگم سے جو خواجہ نواب (لفظ خواجہ کے بجائے خود ہوگا) کی منظورِ نظر تھی ناجائز تعلقات رکھتے تھے چنانچہ یہ بات بچے بچے کی زبان پر ہے بلکہ لوگوں نے اس کا ایک گیت بھی بنایا ہے جو طوائف گاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ریاست فیروز پور جھرکہ ضبط ہوگئی مگر نواب ضیاء الدین احمد خاں اور امین الدین خاں برادران نواب شمس الدین احمد خاں صاحب کی ریاست لوہارو کی برقرار رہی خاندانی شرافت کا تقاضا تو یہ تھا کہ دونوں چچا اپنے یتیم ساڑھے چار سالہ بھتیجے کی سرپرستی کرتے، مگر اُن کی پہلو تہی سے اس شبہ کو تقویت پہونچتی ہے کہ وہ نواب مرزا خاں داغ کو اپنانے پر طیار نہ تھے، صاحبِ گلستانِ سخن جو اُن کے خصوصی دوست تھے وہ کبھی والد کا نام نہیں لیتے، اور صرف نواب مرزا داغ کی تعریف پر اکتفا کرتے ہیں، نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی پانے کے بعد ۱۸۳۵ء سے ۱۸۴۴ء تک یہ یقینی نہیں کہا جاسکتا کہ چھوٹی بیگم اس یتیم بچے کو لے کر کس کس کی سرپرستی میں رہیں لیکن جلوۂ داغ سے اس مسئلہ پر روشنی ضرور پڑ رہی ہے۔ قلعہ میں داخلہ سے پہلے رام پور میں مولوی غیاث الدین رام پوری، صاحب غیاث اللغات سے تعلیم حاصل کرنا ظاہر کر رہا ہے (۱۸۳۵ء سے ۱۸۴۰ء تک دہلی میں رہے) کہ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۴ء تک ضرور رام پور میں رہے۔

نثار علی شہرت مصنف[2] سوانح عمری داغ کا یہ بیان معنی خیز ہے:-

"جب نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور دہلی میں بہت عرصہ رہے تھے حضور ممدوح سے داغ صاحب نے سکندر نامہ پڑھا تھا۔"

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی حصۂ اول صفحہ ۶۹۳ و حصۂ دوم صفحات ۴۹۲ و ۴۹۳ - از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی

[2] سوانح عمری داغ المعروف آئینۂ داغ جلد اول مطبوعہ ۱۹۰۵ء

قیام دہلی کے سلسلہ میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب[1] مکاتیب غالب تحریر فرماتے ہیں :-

نواب فردوس مکان (یوسف علی خاں) اپنے والد کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے طالب علمی کا زمانہ ان کے چچا نواب سید عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ اور نواب سید عبدالرحمن خاں بہادر، میرزا صاحب (غالب) کے محب تھے ان دونوں کے حسب ارشاد نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب سے فارسی کی تعلیم پائی، علوم عربیہ و حکمیہ میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خاں خیر آبادی سے تلمذ تھا۔

نواب غلام محمد خاں کے خاندان کے بہت سے افراد دہلی میں مقیم تھے نواب کریم اللہ خاں خلف نواب فیض اللہ خاں اپنے روزنامچہ[2] میں لکھتے ہیں :-

"چہارم ربیع الاول ۱۲۴۷ھ ایں ماہ برخورداران راہی شاہجہاں آباد شدند، مظفر علی خاں و جعفر علی خاں ابنائے نواب نظام علی خاں - عبدالعلی خاں، حفیظ اللہ خاں اخلاف نواب غلام محمد خاں و عنایت اللہ خاں"۔

صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب بن صاحبزادہ عبدالعلی خاں کا قیام دہلی ۱۲۵۰ھ سے قبل شیفتہ[3] کے بیان سے ثابت ہے :-

"جوانیست نیکو منظر، زیبا شمائل، مدتے در لکھنؤ گذر افگندہ، اکنوں چند سالست کہ مایۂ نازش جہاں آباد دارم تزئین است"۔

صاحب گلستانِ سخن[4] کا بیان ہے کہ :- نواب محمد سعید خاں کی تخت نشینی پر بیتاب رام پور چلے گئے - نواب یوسف علی خاں کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ مطابق ۵ مارچ ۱۸۱۶ء میں ہوئی، وہ ۱۲۵۰ھ میں مقیم دہلی تھے - نواب یوسف علی خاں کے اعزا مقیم دہلی کے تعلقات وہاں کے ارباب علم و فضل سے خصوصی تھے - نواب یوسف علی خاں اور ان کے چچا زاد بھائی عباس علی خاں بیتاب وغیرہ نوجوان تھے داغ کو نواب یوسف علی خاں کا سکندر نامہ پڑھانا اُن روابط کو ظاہر کرتا ہے جو چھوٹی بیگم اور عمدہ خانم اُن کی بہن سے تھے عمدہ[5] خانم کو ایک سو روپیہ نواب یوسف علی خاں اپنی تخت نشینی (اپریل ۱۸۵۵ء تا اپریل ۱۸۶۵ء) کے بعد سے دیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ پرورش نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بھی جاری رہا، اس طرح دہلی کے قیام کے زمانہ میں بھی نواب یوسف علی خاں نے داغ کی تربیت میں یک گونہ حصہ لیا، جب ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو نواب محمد سعید خاں تخت نشین ہوئے تب نواب یوسف علی خاں وغیرہ رام پور چلے گئے فصیح الملک داغ بھی اپنی خالہ عمدہ خانم کے ساتھ رام پور روانہ ہوئے اور قریباً چار سال رام پور رہے جس کے وہ خود بھی مقر ہیں (مولوی غیاث الدین رام پوری سے سلسلۂ تلمذ)۔ خاندان نواب غلام محمد خاں کی روانگی رام پور کے بعد اگست ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ) کے بعد ہی چھوٹی بیگم نے آغا تراب علی کا گھر بسا لیا، ان کی یادگار محبت آغا مرزا شاغل رہے جو ۱۸۴۱ء ۱۲۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ انتخاب[6] یادگار میں امیر مینائی ۱۲۹۰ھ میں نواب مرزا خاں داغ کی عمر چوالیس[44] سال اور شاغل کی عمر تینتیس[33] سال بیان کرتے ہیں یعنی گیارہ سال داغ سے شاغل چھوٹے تھے۔

---

[1] مکاتیب غالب طبع اول حاشیہ ص۴ (۱) و ص۶

[2] سیر کریمی فارسی مخطوطہ۔

[3] گلشنِ بے خار - نولکشور پریس ۱۸۷۴ء ص۳۴

[4] گلستانِ سخن - مرزا قادر بخش صابر - مطبع مرتضوی ص۱۶۳

[5] مکاتیب غالب ص۱۰ حاشیہ (۲) و مکتوب ۱۱ و ۱۲ بنام خلد آشیاں ص۱۰ و ۳ انشائے داغ احسن مارہروی و خمخانۂ جاوید ج ۳ ص۱۰۲

[6] انتخاب یادگار صفحہ ۱۲۸ و ۱۷۷۔

آغا تراب علی کے بعد پھر تقدیر نے یاوری کی اور اب کے مرزا فخرو خلف شاہ ظفر نے ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں انتخاب کرلیا اس تقریب کا نقشہ مولانا محمد حسین آزاد نے کھینچا ہے :-

"مرزا فخرو شاہزادے اواخر سلطنت میں ولی عہدی کے حق دار ہوئے تھے وہ بھی اُستاد سے اصلاح لیتے تھے شہر میں[2] چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحبِ جمال، اپنے ہنر کی باکمال تھیں عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی اور کتنے ہی امیروں کو مار کر ہضم کر چکی تھیں، اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چنتی تھیں، مرزا فخرو کی ۲۴ - ۲۵ برس کی عمر تھی زنڈی کو نوکر رکھ کر غلام ہو گئے، مرزا نے ایک دن استاد کو بلا بھیجا، یہ گئے اُنھوں نے غزل عنایت کی اور کہا اُستاد اسے یہیں اصلاح دیدیجئے، استاد غزل بنانے لگے، مرزا نے ایک تصویر صندوقچے سے نکالی اُسے دیکھا اور کہا کہ استاد ذرا اسے دیکھئے، استاد سمجھ گئے کہ اُسی کی تصویر ہے کہا بہت خوب، مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی پھر کہا دیکھئے تو سہی ...."

مرزا فخرو کے بارے میں اسی زمانہ کا ایک اور بیان قابلِ ملاحظہ ہے :-

رمز صاحب عالم مرزا فتح الملک شاہ بہادر ان کو مرزا فخرو بہت لوگ کہتے ہیں۔ شعر گوئی کا ان کو بہت شوق ہے عمر قریب بیس یا بائیس برس کے ہوگی .... گانا بجانا سننے کا اور رقص دیکھنے کا بہت ذوق ہے ....

بائیس تاریخ ماہ شوال (۱۲۶۱ھ) کو یہ غزل اُن کی پڑھی گئی :-

اُس بے وفا سے دیدہ و دانستہ چاہ کی ہم نے تو اپنی آپ ہی حالت تباہ کی

اس طرح قلعہ میں باریاب ہوکر نواب مرزا خاں کی یاد بھی آئی چنانچہ یہ بھی ۱۸۴۴ء میں قلعہ معلٰے (تیرہ چودہ سال کی عمر) میں داخل ہوگئے۔ مرزا فخرو سے ۱۲۶۱ھ میں "مرزا خورشید عالم" پیدا ہوئے"۔

اب نواب مرزا خاں کی زندگی آرام سے گزرنے لگی رقص و سرود کے جلسوں اور بزم شعر و ادب سے قلعۂ معلیٰ کی فضا گونج رہی تھی ایسے میں کون خاموش رہ سکتا تھا اور اس محفل عیش و طرب سے کیا کچھ نہ سیکھا جاسکتا تھا، چنانچہ نواب مرزا صاحب نے بھی شاعری میں حصہ لیا مرزا فخرو کی بدولت ذوق کی شاگردی کا امتیاز پایا جو مرزا فخرو اور ظفر شاہ دہلی دونوں کے اُستاد تھے ذوق کی نسبت تلمذ اور مرزا فخرو کے رشتہ نے شہرت میں بہت جلد چار چاند لگا دئے، صہبائی و آزردہ اور غالب اور شاہ ظفر دادِ سخن دینے لگے، غدر سے قبل نوجوان شعرا میں نواب مرزا خاں داغ مقام امتیاز پیدا کر رہے تھے۔ ظہیر دہلوی کا

---

[1] دیباچہ دیوان ذوق صفحہ ۱۴ محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۲ء۔

[2] مرزا فخرو ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو انتقال کرگئے، چھوٹی بیگم کی عمر اس وقت قریب تینتالیس یا چوالیس سال تھی دس ماہ بعد غدر ہوگیا، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی حُسن کی چمک دمک باقی تھی، چنانچہ اسی ہنگامۂ غدر میں حاکم قوم کے ایک فرد کے ساتھ بھی انھیں زندگی گزارنا ہی پڑی اور اس کی نشانی ایک لڑکی ہوئی، تذکرہ ماہ درخشاں میں ابوالقاسم محتشم اس لڑکی کا ذکر کرتے ہیں: "خفی تخلص مسیح جان عرف بادشاہ بیگم نام۔ دختر بلاک صاحب انگریز، صاحبِ وقار است و مادرش بنت محمد یوسف کشمیری سادہ کار، علاوہ شعر گوئی و لطیفہ سنجی، خط خفی و جلی خوب می نگارد و فارسی و انگریزی نیز مہارتِ کامل دارد ایں ہمشیرہ اخیافی نواب مرزا خاں داغ است"۔ غدر کے ہنگامہ میں کچھ حسین مسلمان عورتیں انگریزوں کے گھروں میں بیٹھ گئی تھیں۔ عروج عہد سلطنت انگلشیہ صفحہ ۱۲۱، مولوی ذکاءاللہ

[3] تذکرہ شعرائے اُردو۔ کریم الدین و ڈاکٹر فیلن مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ء صفحہ ۴۱۶۔

[4] خمخانۂ جاوید جلد سوم صفحہ ۱۰۴ و صفحہ ۷۹۔ از سری رام۔

بیان ہے[1] :-

"جب سر جان لارنس دہلی آئے تو انھوں نے مارچ ۱۸۵۸ء میں دہلی میں مسلمانوں کے آباد ہونے کا حکم دیا سرٹیفکٹ آباد ہونے کے گھروں میں دئے .... ۱۸۵۹ء تک مسلمانوں کے مکانات سرکاری ضبطی سے چھوٹے نہیں اور نہ اُن کے اخراج کا حکم منسوخ ہوا وہ شہر میں بغیر کسی افسر کے پاس کے نہیں آسکتے تھے۔"

متذکرہ بالا حوالے اس لئے دئے گئے ہیں کہ دہلی میں قیام شاہ ظفر کی حکومت جاتے رہنے کے بعد ناممکن ہوگیا تھا اور ۱۸۵۹ء تک بھی عام اجازت مسلمانوں کو آباد ہونے کی نہ تھی تاوقتیکہ سرٹیفکٹ حاصل نہ کرلیں اب سوال یہ رہتا ہے کہ داغ دہلوی اس ہنگامہ غدر میں کہاں رہے۔

نثار علی شہرت کا بیان ہے کہ وہ اس ہنگامۂ غدر میں حکیم ولایت علی خاں صاحب خلف حکیم سعادت علی خاں جنرل افواج ریاست رام پور کے پاس آنولے پہونچ گئے اور وہاں مہمان رہے اور سفارشی خط حاصل کرکے وہ دہلی جاکر رام پور پہونچے اور نواب یوسف علی خاں کے مہمان رہے اور بعدہٗ مصاحب ولیعہد ریاست نواب کلب علی خاں کے ہوگئے۔

یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا نواب مرزا خاں اپنی خالہ عمدہ خانم کا سفارشی و تعارفی خط لےکر رام پور پہونچے اور نواب یوسف علی خاں کے مہمان ہوئے رہی مصاحبت ولیعہد ریاست (نواب کلب علی خاں) تو یہ درست معلوم ہوتی ہے، چونکہ مصاحبت ان کو تا قیام رام پور ہمیشہ حاصل رہی اب سوال یہ رہتا ہے کہ نواب مرزا خاں کب رام پور آئے اس سلسلہ میں ظہیر دہلوی کا بیان تاریخ غدر میں کافی اہمیت رکھتا ہے نیز داغ دہلوی کے مسئلۂ داخلۂ رام پور کو بھی واضح کرتا ہے اور وہ یہ ہے[3] :

"دہلی سے جھجر، سونی پت، پانی پت، نجیب آباد، مراد آباد ہوکر بریلی پہونچے پندرہ روز بریلی میں رہے یہاں فیروز شاہ اور دوسرے سردار جمع تھے رام پور جانے والے راستوں کی ناکہ بندی ریاست کی طرف سے تھی رام پور کے تیس ہزار سوار فوج باغی میں ملازم تھے میر غلام عباس دہلوی کے مشورے پر آنولے چلے وہاں احمد خاں جرنیل جھجر سے ملاقات ہوئی دوسرے دن شاہ آباد (تحصیل رام پور) پہونچے وہاں مقیم تھے کہ مغرب سے فوج آتے دیکھی آبادی کے باہر ٹھہری فوج کے آدمی آئے اور گاؤں والوں پر تشدد کیا ...... اُس دن وہاں رہ کر صبح کو فوج آنولہ چل دی، اور ہم رام پور کو چل نکلے ..... قریب شام رام پور پہونچے دروازے شہر کے بند تھے ..... چور دروازے سے داخل شہر ہوئے ... پھر میر ابراہیم دہلوی (ظہیر دہلوی کے رشتہ دار تھے) کے توسط سے نواب فصیح اللہ خاں خلف نواب نصراللہ خاں کے یہاں مہمان رہے اور اُن کی سفارش پر نواب یوسف علی خاں نے رام پور میں رہنے کی اجازت دیدی اور معافی نامہ انگریزوں سے دلانے کا اقرار کیا ..... غرض اس کے بعد ہم کو اطمینان کلی حاصل ہوگیا اور اپنے بے خوف و خطر رہنے لگے، داغ صاحب کو خبر ہوئی وہ اُس روز آکر ملے انھوں نے یہ حُسنِ سلوک کیا کہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا انور کو صاحبزادہ محمد رضا خاں داماد نواب یوسف علی خاں بہادر مرحوم کی سرکار میں نوکر رکھوا دیا .... عرصۂ چار سال کے قریب ہم رامپور میں رہے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ ظہیر دہلوی کون سی تاریخ رام پور آئے - فیروز شاہ ۲۲ اپریل ۱۸۵۸ء مطابق ۷ رمضان ۱۲۷۴ھ

---

[1] داستان غدر مطبوعہ مصنف ظہیر دہلوی صفحہ ۸۰ و ۱۱۶ و ۱۱۷

[2] مکاتیب غالب - مولانا امتیاز علی خاں عرشی - [3] داستانِ غدر - مطبوعہ صفحات ۱۳۲ تا ۱۵۰

[4] اخبار الصنادید جلد دوم مؤلفہ نجم الغنی خاں رام پوری صفحات ۸۲ و ۸۴ و ۸۵ و ۸۹ -

مراد آباد میں داخل ہوگیا شہر کو لوٹ لیا رامپوری فوج بھاگ آئی ۲۳ر اپریل ۱۸۵۸ء کو سات آٹھ ہزار فوج رام پور سے گئی بعد مغرب آدھے تو راستہ میں سے لوٹ آئے ۔۔۔۔ ۲۴ر اپریل ۱۸۵۸ء کو لڑائی ہوئی رامپوری فوج نے شکست کھائی، جنرل جونس کی خبر پاکر فیروز شاہ بھاگ نکلا ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵ر اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل جونس مراد آباد آگیا، ریاست کی فوج نے انتظام سپرد کردیا نواب مجو خاں مقابلہ میں مارے گئے۔"

بریلی[1] میں ۵ر مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں سے افواج انگریزی کا مقابلہ ہوا چھ گھنٹے کی لڑائی میں ہزاروں غازی مارے گئے، ۶ر مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں کچھ سپاہ لے کر بھاگ گیا شہر میں جنرل جونس توپیں مارتا داخل ہوا ، ۷ر مئی ۱۸۵۸ء کو مکمل قبضہ ہوگیا۔"

ظہیر دہلوی نے شاہ آباد میں جس فوج کو آنولہ کی طرف جاتے دیکھا وہ انگریزی فوج ہی ہوگی جو ۲۵ر اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد میں داخل ہوچکی تھی اور بریلی کی کمشنری میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ ۳۰ر اپریل کو بدایوں کے نواح میں انگریزی فوج کی مڈبھیڑ ہوئی تھی، ۲۶ر اپریل ۱۸۵۸ء کو غالباً یہ فوج شاہ آباد سے گزری اس طرح ظہیر دہلوی ۲۷ر اپریل ۱۸۵۸ء کو رام پور میں داخل ہوئے اور یہاں داغ صاحب کی سفارش سے نواب یوسف علی خاں کے داماد صاحبزادہ محمد رضا خاں کے یہاں ملازمت بھی مل گئی، اس سفارش سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی سے روانہ ہوئے تو سیدھے رام پور آئے یا آنولہ ہوکر رام پور آئے ہوں جس طرح ظہیر دہلوی راستوں کی ناکہ بندی کے باعث بریلی آنولے ہوکر رام پور آئے، لیکن اُنکی آمد کو اتنی مدت گزر چکی تھی کہ وہ نواب صاحب کے خاندان میں کافی بارسوخ تھے۔

احسن صاحب کا یہ بیان[2] درست ہے کہ: - "نواب صاحب موصوف (نواب یوسف علی خاں) اپنی حیات تک ہمیشہ بطور مہمان نوازی کے سلوک کرتے رہے۔ اب وہ رام پور میں اطمینان سے رہنے لگے جب قدرے سکون ہوا تو وہ ماہ مارچ ۱۸۵۹ء میں دہلی گئے۔"

غالب تحریر[3] فرماتے ہیں: -

"نواب مرزا نے دلی آکر پہلے نوید بزم آرائی سُنائی چاہتا تھا کہ اُس کی تہنیت لکھوں کل اُس نے از روئے خط آمد رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سُنائی۔"

غرض کبھی دلّی رہے اور کبھی رام پور۔ ۱۷ر مارچ[4] ۱۸۶۰ء کے مکتوب داغ بنام نواب یوسف علی خاں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دہلی میں تھے اور نواب صاحب کے حسب ارشاد سنگ باسی تلاش کر رہے تھے ۲ر نومبر ۱۸۶۰ء کے خط سے بھی قیام دہلی پایا جاتا ہے، ۲۱ر اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا اب نواب کلب علی خاں (خلد آشیاں) تخت نشین ہوئے لیکن اس زمانہ میں بھی وہ بطور مہمان ریاست ہی رام پور میں رہے اُن کے خصوصی تعلقات کا اندازہ مکتوب غالب نمبر ۵۱ مورخہ ۱۳ر اگست ۱۸۶۵ء و مکتوب نمبر ۶۰ مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۸۶۶ء بنام نواب کلب علی خاں سے ہوسکے گا: -

---

[1] تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ تتمہ حصہ سوم صفحات ۸۷ و ۸۸ و ۸۹

[2] جلوۂ داغ صفحہ ۲۰

[3] مکاتیب غالب طبع اول ص۱۸ مکتوب غالب بنام یوسف علیخاں (فردوس مکاں) ۲۸ر مارچ ۱۸۵۹ء مکتوب ۱۵ و مکتوب ۲۰ ص۹۵ و ۹۶

[4] انشائے داغ - احسن مارہروی صفحات ۱ تا ۷

"برخور دار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدہ کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے وہ مسموع و مقبول ہو۔"

انشائے داغ میں پہلا خط جو بنام خلد آشیاں (نواب کلب علی خاں) پایا جاتا ہے وہ ۸ر فروری ۱۸۶۶ء کا ہے وہ اس وقت تک ملازم نہیں ہوئے تھے اُن کا تقرر بزمرۂ ملازمان ۱۴ر اپریل ۱۸۶۶ء کو ہوا مصاحبت کے ساتھ فراش خانہ و اصطبل وغیرہ کی داروغگی سے اختصاص پایا اور ۱۲۸۹ھ میں خلد آشیاں کے ساتھ شرفِ حج بھی حاصل کیا۔ ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۲ء میں سفر کلکتہ اختیار کیا اور حجاب کی محبت میں بے حجاب ہو گئے۔ مارچ ۱۸۸۱ء کے میلۂ بے نظیر میں منی بائی حجاب آئی، اور نواب مرزا خاں کے زہد و تقویٰ نے شکست کھائی پچاس برس کی عمر میں عشق و محبت کی داستان دوسروں کی نظر میں حیرت انگیز ہو لیکن جو کھیل اُس عہد میں نواب و راجہ تو درکنار صوفی و عالم تک روا رکھ رہے تھے اُسے غیر مہذب اور سوقیانہ نہیں کہا جاسکتا۔ داغ کی زندگی اسی ماحول میں گزری تھی نواب کلب علی خاں اور نواب یوسف علی خاں کے دربار سے طوائفیں اور دوسرے ارباب نشاط وابستہ چلے آتے تھے میلۂ بے نظیر اول سال جلوس ۱۸۶۵ء سے نواب کلب علی خاں نے رائج کیا، اس میں مقامی ارباب نشاط کے علاوہ باہر سے بھی طوائفیں وغیرہ بلائی جاتی تھیں، غرض اب رقیب کی رقابت سے بھی واسطہ پڑا۔ اور منتِ دربان بھی کرنی پڑی، احباب کے طعنے اور محبوب کا ستم اور جور کیونکر نہ برداشت کرتے، غرض رفتہ رفتہ طبیعت بھر گئی اور چڑھی ندی اُتر گئی۔"

رام پور میں جس عیش و عشرت سے گزری تھی یکایک اُس میں رخنہ اندازی ہوئی نواب کلب علی خاں (خلد آشیاں) نے ۲۳ر مارچ ۱۸۸۷ء کو رحلت کی اور دربار رام پور کی سجی سجائی محفل علم و ادب منتشر ہوگئی چنانچہ جولائی ۱۸۸۷ء کے قریب وہ رام پور سے استعفیٰ دے کر چلے گئے۔"

قیام رامپور کی مدت بقول احسن مارہروی چالیس پینتالیس سال رہی اور مختلف اوقات میں بارہا سفر کا اتفاق ہوا جن میں اکثر بکار سرکار جانا پڑا اور کبھی کبھی اپنی ضرورتوں سے بھی سفر کیا۔--------

نواب فردوسِ مکاں کے بعد خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر نے اپنی قدر دانی اور لطفِ خسروانی سے مرزا صاحب کو ریاست میں باقاعدہ ملازم فرماکر اپنی مصاحبت میں رکھا اور بطور معتمد کار خانہ جات اصطبل و گاڑیخانہ

---

۵۱ مثنوی فریادِ داغ صفحہ ۸ سے

آ گیا بے نظیر کا میلہ
دلِ پابندِ وضع کھل کھیلا

۵۲ اخبار الصنادید جلد ۲ صفحہ ۱۳۹

۵۳ جلوۂ داغ۔ صفحہ ۳۴ و ۳۵ و ۲۰ تا ۲۲

۵۴ جلوۂ داغ صفحہ ۴۴ بالآخر........ حساب کتاب ۲۸ر دسمبر ۱۸۶۶ء اور تحویل دو چار مہینوں میں سمجھا بجھا کر رام پور کو خیر آباد کہا۔

۵۵ انشائے داغ۔ مکتوب ۲۲ر ستمبر ۱۸۹۶ء بنام محمود علی خاں محمود رام پوری

نوٹ:۔ میر قطب الدین اشک جلیسری... کہا کرتے تھے کہ رام پور میں چند اشخاص خصوصاً نواب حیدر علی خاں (برادر نواب کلب علیخاں) ایسے تھے جن سے حجاب کے معاملات میں مرزا صاحب سے رقیبانہ آویزش رہا کرتی تھی۔

وفراش خانہ وکنول خانہ وشترخانہ سپرد کیا۔ مرزا صاحب نے ۲۴ برس تک مصاحبت کے ساتھ ان سب کاموں کو نہایت خوبی اور عمدگی و دیانت سے سرانجام دیا اور بڑے نیک نام اور بے لوث رہے ...... ہمیشہ کلام کرتے وقت بھائی نواب مرزا خاں کہکر خطاب کیا کرتے تھے ...... بہ سلسلۂ ممبری کونسل کلکتہ کے سفر میں مرزا صاحب کو اپنے پاس رکھا اور فرمایا میرا محافظ سوائے تمھارے کون ہے"۔

قیام رامپور کی مدت چالیس پنتالیس سال مبالغہ ہے البتہ قریبًا ۳۴ سال رام پور میں رہے ۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۸ء بچپن کے چار سال اور آخر سال ۱۸۵۷ء تا جولائی ۱۸۸۷ء تیس سال۔ اس طرح چونتیس سال رام پور میں مہمان و ملازم رہکر گزارے۔

لہ اخبار الصنادید جلد ۲- صفحہ ۱۴۰ - ۲۰ شعبان ۱۲۸۳ھ رامپور سے روانہ سفر کلکتہ ہوئے۔

داغ کی بعض غزلوں کی شانِ نزول

(۱) ایک وقت ایک صاحب نے ان کے سامنے ایک تصویر پیش کی جس میں ایک نازنین جانے کا قصد کر رہی ہے اس کا عاشق ایک ہاتھ سے اس کا دامن پکڑے ہوئے ہے اور ایک ہاتھ سے اپنے دل کو سنبھال رہا ہے، یہ تصویر آجکل بھی بازاروں میں فروخت ہوتی ہے۔ اور کہا کہ اس کیفیت کو آپ اپنے کسی شعر میں ظاہر کیجئے، داغ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا ؎

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے　　دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے

مطلع کہنے کے بعد انھوں نے غزل کی تکمیل کرلی۔

(۲) نواب عزیز یار جنگ بہادر بیان فرماتے ہیں کہ داغ کے یہاں ایک طوائف ملازم تھی۔ عمر میں کوئی بیس بائیس برس کی ہوگی ایک دفعہ داغ نے اس کو اپنے کسی آدمی کے ذریعہ سے بلا بھیجا۔ اس نے آدمی سے یہ کہا کہ ان سے کہدے "میری بلا بھی نہیں آتی"۔ ملازم نے یہی جملہ داغ سے آکر دہرا دیا۔ داغ لطف اندوزی کی خاطر بار بار اس سے دریافت کرتے تھے کہ اس نے کیا کہا اور وہ اسی جملہ کو دُہراتا جاتا تھا اسی کیفیت میں انھوں نے نواب صاحب سے کہا لکھو:۔

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی　　کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

اور تھوڑی دیر میں غزل کہدی۔

(۳) داغ کے پاس ایک وقت مولوی ابوالحمید آزاد بیٹھے ہوئے تھے ان کو پیاس لگی اور انھوں نے پانی منگوایا۔ ایک چھوکری جسکی عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی پانی لے آئی اور ہوا کے زور سے اس کا دوپٹہ شانہ پر سے سرک گیا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ داغ کی نظر بھی اس سماں سے لطف اٹھا رہی تھی انھوں نے آزاد سے کہا کہ قلم لو اور لکھو:۔

بادِ صبا نے بھی نہ کیا مجھ کو بے حجاب　　سینے پہ ہاتھ آگئے جب شانہ کھل گیا

داغ — ترجمان و رہنمائے دور

(ڈاکٹر اعجاز حسین)

ادب میں بھی ایسے اہلِ قلم کم ہی ہوتے ہیں جو اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے زمانہ کو اتنا متاثر کرسکیں کہ لوگ ان ہی کے دل و دماغ سے سوچنے لگیں، ان ہی کی آنکھ سے دیکھنے لگیں، درحقیقت یہ بھی بڑی زبردست فتح ایک فرد کی ہے۔ خواہ آگے چل کر حالات بدل جائیں اور اس کا کارنامہ اپنی اہمیت کھودے مگر ایک دور کو اپنا کلمہ پڑھا دینا ہی کیا کم کامیابی ہے؟ اس کی وقتی کامیابی بھی شاندار اور قابلِ ذکر ہوتی ہے چنانچہ داغ کو آپ جو چاہے سمجھیں مگر وہ مقبولیت جو ان کو اپنے دور میں نصیب ہوئی متقاضی ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے اور غور کیا جائے کہ ان کی اس کامیابی کے راز کیا تھے۔

اُردو شاعری میں دورِ جدید سے پہلے جو لوگ ترجمان و ادبی رہنما کہے جاسکتے ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ وؔلی، میرؔ، ناسخؔ، انیسؔ و داغؔ کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا۔ غالبؔ کا نام ہم قصداً نہیں لے رہے ہیں کیونکہ وہ اپنے دور کو اپنی راہ پر نہیں چلا سکے بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وہ ذہنی لحاظ سے اپنے دور کے بہت آگے تھے ان کا شاعرانہ اقدام ان کے زمانہ میں اتنا مقبول نہیں ہوسکا کہ زیادہ تعداد میں شعراء ان ہی کی طرح سوچنے اور کہنے لگتے۔ اُن کی قدردانی کو جدید دور کا انتظار تھا جب ان کا کلام نہ صرف عہد آفریں ثابت ہوا بلکہ قابلِ پرستش بھی سمجھا گیا۔ ان کے دیوان کو الہامی کتاب سے تعبیر کیا گیا اور ان کو اُردو کے ممتاز ترین شعرا میں شمار کیا گیا۔

داغؔ بھی ہمارے خیال سے زبردست ترجمان و ادبی رہنما تھے انھوں نے اپنے دور کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اُردو ادب کے مزاج کو پوری طرح پرکھ لیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ہی کی طرح دوسرے شعرا بھی سوچنے لگے ان ہی کے رنگ میں غزلیں کہنے لگے یہاں تک کہ ان کے ادبی نقشِ قدم پر چلنا باعثِ فخر سمجھنے لگے اپنے زمانہ میں محفلِ ادب کو جتنا انھوں نے متاثر کیا شاید ہی کسی ایک شاعر نے کیا ہو اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کے ہمعصر اور زبردست حریف امیرؔ مینائی بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی نامشکور کرنے لگے تھے۔ امیرؔ کا مبلغِ علم، داغؔ کے علم سے کہیں زیادہ تھا فنی محاسن بھی کم نہ تھے لیکن داغؔ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ باوجود مولویت و مخالفت کے امیرؔ مینائی آخر آخر میں داغؔ ہی کے نقشِ قدم پر گامزن نظر آتے ہیں داغؔ کی اس کامیابی کے اسباب کیا تھے اس کو سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر اس زمانہ کی رفتار، گفتار، طرزِ معاشرت اور سماجی تاریخ کو دیکھنا پڑے گا تب اندازہ ہوگا کہ نصف صدی تک داغؔ نے اُردو زبان پر کیوں حکومت کی؟

داغؔ کی پیدائش ۱۸۳۱ء اور وفات ۱۹۰۵ء میں ہوئی گویا وہ ۷۴-۷۵ سال تک زندہ رہے۔ یہ زمانہ، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے کچھ عجیب سا تھا فتنۂ افرنگ سے دلّی کی مرکزی حکومت لرزہ براندام تھی۔ بادشاہِ وقت شاہ شطرنج کی حیثیت سے لال قلعہ میں پڑا تھا ایک بڑے انقلاب کے بادل امنڈ رہے تھے عوام کا تو ذکر ہی کیا، امراء اور نام نہاد شہزادے اپنی دولت و قسمت کی ناپائداری سے گھبرا رہے تھے، اُردو کا مرکز بجائے دہلی کے لکھنؤ ہو رہا تھا۔ جہاں کسی قدر سکون تھا

مگر زوال پذیر، نوابوں کا دربار مغل بادشاہوں کے نمونے پر سج رہا تھا - آرائش کے لئے علم وفضل کا بھی رجحان تھا، تعیش وتعشق کا بھی زور تھا - جابجا مخصوص افراد خوش حال تھے مگر بڑی تعداد لوگوں کی خستہ حال و دست نگر تھی، مغلیہ خان کے آخری دور یعنی اورنگ زیب کے بعد کے تماش بینی اور لا ابالی پن رؤسا کی زندگی کا جزو لاینفک ہوگیا تھا اور لوگ آنکھ بند کرکے ان ہی رئیسوں کی تقلید کر رہے تھے گویا عیاشی و سرمستی کسی قدر علمیت کا پہلو لئے ہوئے تفریح کا سب سے بڑا مرکز بن گئی تھی اور اس مرکز میں طوائف یا اسی قسم کی عورتوں کا خاص درجہ ہوگیا تھا ان سے دلچسپی لینا ہر رئیس کے لئے باعث فخر ہوگیا تھا، جیسے آج موٹر کار اہل دول کے لئے ضروری ہوگئی ہے اسی طرح زمانے میں طوائف بھی ضروری ہوگئی تھی ایک سے زیادہ طوائفیں یا اس قبیل کی دوسری عورتیں حرم کی زینت ہوتی تھیں کوئی محفل بغیر ارباب نشاط کے محفل نہیں ہوسکتی تھی، پورے دور کا جنسی وجمالیاتی ذوق اسی قسم کی عورتوں اور محفلوں سے متاثر تھا - ان سے دلچسپی لینا، ان کے متعلق گفتگو کرنا ان کے لئے مقابلہ میں سب کچھ لٹا دینے کی ہمت قابلِ داد سمجھی جاتی تھی غرض کہ جنسی بھوک کی آسودگی اور شانِ امارت کی نمائش زیادہ تر اسی طوائف سے ہوتی تھی - یہ روسا پڑھے لکھے ہوتے گھٹی میں ایک خاص تہذیب پڑی ہوتی - لوگ طوائفوں کو گھر بلاتے یا ان کے بالا خانوں پر جاتے، بہر حال کہیں نہ کہیں صحبتِ رازو نیاز ہوجاتی، شعروشاعری کا بھی چرچا رہتا - نیاز مندوں کو مسخر کرنے کے لئے طوائفیں بھی شعر وشاعری سے دلچسپی لیتی تھیں، اکثر ان میں پڑھی لکھی ہوتی تھیں بعض بعض شعر بھی کہتی تھیں اور سخن فہم بھی ہوتی تھیں - حُسن ونغمہ کے ساتھ شعریت ضرورت سے زیادہ لطف انگیز ہوجاتی اور چونکہ حسن وعشق غزل کا محور بھی ہے اس لئے، اس لئے اور باتوں کے ساتھ علمی مذاق بھی آسودہ ہوجاتا -

اس ماحول کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ داغ کا زمانہ آج کا زمانہ نہ تھا، حُسن کا بازار اور جنس خواہشات کا مرکز ہر جگہ نہیں بنتا تھا - پردہ کی رسم، مغربی طرز تعلیم کی کمی نے اُس زمانہ میں عورتوں کو آج کی طرح گھومنے پھرنے کا موقع نہیں دیا تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ اہلِ نظر ایک خاص سہولت کے ساتھ مختلف مقامات پر اپنی پیاس بجھا سکیں انکی اس خواہش کے لئے زیادہ تر طوائفوں کا گھر مخصوص تھا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص بقدر توفیق ان ہی سے ملنے کی کوشش کرتا تھا اور اس زندگی ووابستگی کو عشق سے تعبیر کرتا تھا - طوائفوں کی حرکات وسکنات کو اپنی شاعری کا مرکز بناتا - جو واقعات اپنے مزاج کے خلاف پاتا ان کو جور وجفا کے خانہ میں لکھدیتا اور اپنی خواہشات کے تحت میں جو کچھ خود کرتا اس کو وفا، ایثار وغیرہ سے تعبیر کرتا، اسی طرح بوالہوسی اور عشق کی سرحد ہمارے ایک دور کی شاعری میں ملتی نظر آتی ہے - چنانچہ اگر آپ بے لوث ہوکر ذرا غور کے ساتھ اُردو شاعری کے اس دور کا جایزہ لیں جو داغ سے ذرا پہلے اور کچھ بعد تک تھا تو آسانی سے یہ محسوس ہوگا کہ اس دور کا معشوق، طوائف ہے اور عاشق تماش بین ہے - وفا، جفا کی حکایتوں میں معشوق کے برتاؤ میں - لباس میں، طرزِ معاشرت میں، غرض کہ اکثر باتوں میں آپ کو اس کے تائیدی ثبوت مل جائیں گے -

ہمارا یہ مطلب نہیں کہ طوائف یا کسی بازاری عورت سے عشق نہیں ہوسکتا یا اگر کسی کو ہوگیا ہو تو اس کو برا سمجھا جائے نہیں برخلاف اس کے ہمارے نزدیک جہاں اور جس کسی سے بھی عشق ہو قابلِ احترام ہے - میر نے بہت پہلے کہدیا تھا

کیا عاشقی میں پوچھتے ہو ذات کے تئیں سید ہو یا چمار ہو اس جا وفا ہے شرط

جس دور کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس میں معشوق بازاری تھا یا نہیں اس سے بحث نہیں کہنا یہ ہے کہ لوگوں کا عشق بازاری تھا، اس زمانہ میں ''خواہش کا نام عشق، نمائش کا نام حسن' تھا، جن لوگوں کو واقعی عشق نہ تھا ان کی تعداد زیادہ تھی لیکن خیالات کے جواز اور ناکردہ گناہ کی داد ان ہی شعرا کے کلام میں ڈھونڈھتے تھے جو شاعری اور عاشقی کی سند لیکر بازار عام اور کبھی کبھی دربار خاص میں بھی جگہ پاتے تھے -

ان تمام حالات و بیانات کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت سماج جس سرچشمۂ حیات سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ وہی تھا جو آخری دور میں اورنگ زیب کے بعد محمد شاہ اور جہاندار شاہ وغیرہ چھوڑ گئے تھے۔ اسلاف کے بیم سے کمالات بھی اخلاف میں تھے اور معائب بھی۔ طرزِ تخیل وہی تھی، محسوسات وہی تھے، استطاعت کی کمی اور بدلے ہوئے حالات کے اثر نے کچھ فرق پیدا کر دیا تھا ورنہ معاشرت اور نظریات وہی تھے کہیں کہیں اگر سیلاب میں کوئی فرق نظر آتا ہے تو اس کو صرف انفرادی سمجھئے اسے سماج کا مجموعی رجحان نہیں کہہ سکتے۔ ہم کو جس رجحان سے اسوقت سروکار ہے اس کا بھی رنگ ڈھنگ یہی تھا اس طرزِ معاشرت اور سماجی زندگی کے ساتھ زبان و طرزِ بیان کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ داغ کی شاعری پوری اہمیت کے ساتھ سامنے آسکے۔ دورِ زیر بحث میں طرزِ بیان کی کئی لہریں ہمارے ادب میں نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ اندازِ بیان تھا جو ناسخ و آتش کا اسکول پیش کر رہا تھا جس میں فارسی الفاظ کی بھرمار تھی ہندی الفاظ کم ہو رہے تھے تشبیہ و استعارہ ضرورت سے زیادہ زبان پر آرہے تھے بیان میں بھونڈا اور طرزِ تخیل میں رنگینی کے بجائے سادگی جگہ پا رہی تھی خیالات سے زیادہ قافیہ پیمائی پر توجہ تھی، اس اندازِ بیان کا اثر شاہ نصیر اور ذوق بھی لے رہے تھے۔ دوسری وہ لہر ہے جو غالب کی ذات سے وابستہ تھی جس میں خیالات کی بلندی اور بیان کی ندرت اگلے پچھلے تمام شعرا سے زیادہ تھی اس کا اثر محدود تھا، چند وجوہ سے اس کا دائرہ اس وقت وسیع نہیں ہو سکا مگر رفتہ رفتہ اس کی جگہ ادب میں مستقل ہو رہی تھی تیسری لہر وہ تھی جو میر نے پیدا کی تھی اس کی مستقل جگہ دلوں میں تھی کیونکہ اس کے اتحادِ اثر اور طرزِ بیان دونوں اُردو شاعری میں بے مثال سمجھے جاتے تھے مگر حالات بدل چکے تھے زبان جوان ہو گئی تھی، رعنائی کا آنا ضروری تھا اس لئے باوجود اثر کے ماحول کی رنگینی سے متاثر ہو کر لوگ زیادہ ترمیر کی زبان و بیان کو تبرک کی جگہ دیتے تھے اس کو عام کرنے کی طرف مایل نہ تھے۔ ان اسلوب کے علاوہ اس غزل کی دنیا سے الگ ایک وہ لہر تھی جو میر انیس کے گھر سے اُٹھی تھی اور جس کو انیس نے معراجِ کمال پر پہونچا دیا تھا۔ جس میں زبان و بیان کی اتنی ہم آہنگی تھی کہ اس سے دنیا متاثر نظر آئی مگر انیس کا موضوع غزل کے موضوعات سے اتنا علٰحدہ تھا کہ غزل والوں نے باوجود پسندیدگی کے اس بیان و زبان کو اپنے کام کی چیز نہ سمجھی اور حقیقتاً مرثیہ کی زبان اور غزل کی عام زبان میں ان کو ایک تصادم نظر آیا کیونکہ لکھنؤ اسکول زبان میں رنگینی، بیان میں رنگینی غرض کہ ہر چیز میں رنگینی دیکھنا چاہتا تھا اور انیس کی زبان میں سادگی، صفائی اور بیان میں خلوص اور ابھار تھا ہر بات وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ یہاں تصنع سے کام نہ لیا گیا تھا، رعایتِ لفظی سے بھی کوئی خاص سروکار نہ تھا وہ لانے کے لئے بہت کم لائی گئی تھی اس لئے اس وقت کی غزلوں میں شعرا نے اس اندازِ بیان کو لانے کی بہت کم کوشش کی۔

ان سب اندازِ بیان و زبان کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ داغ کس سے زیادہ متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کشمکش میں کون سا راستہ اختیار کیا۔ داغ کی ابتدائی نشو و نما دہلی میں ہوئی، قلعۂ معلی میں رہے جہاں ٹکسالی زبان کا سکہ رائج تھا سیدھی سادی زبان اور سلجھا ہوا بیان عام طور سے مرغوبِ خاطر تھا۔ استاد ذوق کی رہنمائی میں داغ کو اسی زبان و بیان کا سامنا کرنا پڑا۔ سیدھی سادی باتوں کو صاف زبان میں بیان کر دینا ان کی گھٹی میں پڑ گیا اور اسی زبان کو لے کر وہ آگے بڑھے اور اس کو اپنے اندازِ بیان کی چاشنی دیکر ایک انفرادیت حاصل کر لی، اس سیدھی سادی زبان کو عوام کی پسندیدگی کا سہارا بہت پہلے سے مل رہا تھا اور اب مغربی تعلیم نے اس طرزِ گفتار کو اور زیادہ سراہنا شروع کیا، رنگینی اور تصنع سے انگریزی تمدن سے متاثر ہونے والے گریز کرنے لگے۔ تعلیم کا سلسلہ رفتہ رفتہ مکتب سے اسکول میں آرہا تھا، زبان کو آگے بڑھانے اور مذاق کو سدھارنے کی ذمہ داری نئے مذاق کے لوگوں سے وابستہ ہو رہی تھی۔ یہ طبقہ بھی سادگی پسند تھا عوام بھی یہی چاہتے تھے، ثبوت کے لئے ہم میر امن کی 'باغ و بہار' میں زبان کا بہاؤ دیکھیں اور غالب کی زبان ان کے

خطوط میں اور سرسید کی زبان تہذیب الاخلاق میں دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی زبان تیزی سے مقبول ہو رہی تھی برخلاف اس کے رجب علی بیگ سرور کی زبان جو 'فسانۂ عجائب' میں ہے اور دیگر اہلِ قلم کی زبان جو تقریظ وغیرہ کے سلسلہ میں ملتی ہے وہ ناپسندیدہ و زوال آمادہ تھی، بہرحال داغ نے ایک دور اندیش فنکار کی طرح مستقبل کا مذاق اور اپنے زمانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کو مدنظر رکھ کر زبان کو صاف اور بیان کو سلجھا رکھا لیکن اس کو پُرکار بنانے کے لئے فن کاری کے دوسرے حربے بھی استعمال کئے۔ یہ تھا اس زمانہ کا سماجی اور ذہنی ماحول اور ادبی رجحان جس میں داغ کی ذہنی نشو و نما ہو رہی تھی، ادب کو تلاش تھی ایک ایسے فن کار کی جو زبان کے مختلف راستوں میں سے ایک ایسا راستہ نکال لے جو شاہراہ بن جائے اور زمانہ کے مذاق کو پوری طرح آسودہ کر سکے، دقت یہ تھی کہ زبان کے مختلف راستے ایک دوسرے سے کبھی کبھی اتنا علٰحدہ نہ تھے کہ نمایاں فرق محسوس ہوتا، طرزِ تخیل میں البتہ نمایاں فرق تھا، ضلع جگت، تصنع غلو یہ سب ایک اسکول کے خاص جوہر تھے اور دوسرا اسکول سادگی، متانت، اور اخلاقیات کا دلدادہ تھا، جو لوگ انگریزی پڑھ رہے تھے ان کا ذہنی جھکاؤ موخرالذکر کی طرف تھا، لیکن کسی قدر ترمیم بھی چاہتا تھا، کلام میں جو پھیکاپن اور مبالغہ آگیا تھا اس کے بجائے واقعات کی چاشنی تلاش کرتا تھا اور خارجی پہلو کے بجائے داخلی پہلو کو ادب میں لانا چاہتا تھا، داغ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کو مناسب سمجھا کہ اپنی شاعری کو رعایت لفظی و مبالغہ سے حتی الامکان بچالیں اور سیدھی سادی زبان میں واقعات یا محسوسات کو قلم بند کردیں اس طرح انھوں نے اس وقت کے خاص اسکول ہی کو نہیں اپنایا بلکہ مستقبل قریب کے ادیب یعنی انگریزی داں طبقہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا، لیکن اگر اتنے ہی پر داغ رک جاتے تو انفرادیت مقبولیت سے ہمکنار نہ ہوتی، کیونکہ اس قسم کا اقدام اور شعراء بھی کر چکے تھے مگر کوئی خاص نام نہ حاصل کر سکے تھے زمانہ کے مذاق کو پوری طرح آسودہ کرنے کے لئے ایک چابکدست فن کار اور بیباک شاعر کی ضرورت تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایک تجربہ کار انسان کی بھی، جب تک یہ ساری خصوصیات بہم نہ ہوتیں ادبی دنیا پر حکمرانی ممکن نہ تھی، اتفاق سے داغ میں یہ سارے کمالات بیکوقت موجود تھے، فن کی تعلیم وہ استاد ذوق سے حاصل کر چکے تھے، اپنے بچپن میں اُردو کے مشہور و ممتاز شعرا اور قابل ترین استادوں سے کسب کمال کر چکے تھے، جوانی میں نوابوں اور امرا کے یہاں وہ رنگ رلیاں دیکھ چکے تھے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکتی تھیں، ایک جگہ خود بھی اس کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

حضرت داغ کو دلّی کی ہوا خوب لگی ‏ ‏ ‏ ‏ رات دن عیش ہے جلسوں میں بسر کرتے ہیں

وہ خود بھی حساس دل لے کر آئے تھے بارہا دل پر چوٹ کھا چکے تھے، خود بھی اسی خیال کی تائید ایک جگہ کرتے ہیں کہتے ہیں ؎

داغ نے دیکھے ہیں ہزاروں حسیں ‏ ‏ ‏ ‏ آپ نے کس شخص سے دعویٰ کیا

اتفاق سے ان کو قدر داں بھی ایسے مل گئے کہ ان کے تجربات و بیانات کو صدق دل سے سراہ سکتے تھے اس موقع سے انھوں نے بھی جی بھر کر فایدہ اُٹھایا۔ مثالی اخلاقیات اور فرسودہ روایات سے مغلوب ہو کر محسوسات قلم بند کرنے میں وہ جھجکے نہیں، اس زمانہ کے واقعات اور حسن و عشق کے اصلی و عملی پہلوؤں کو اشعار میں صاف صاف بے دھڑک نظم کرنا شروع کر دیا، اس وقت کے لوگ چاہتے بھی یہی تھے کہ کوئی دل کا چور نکال دے جو کچھ بزم نشاط میں گزرتی ہے اس کو سماج کے روایتی خوف سے نظر انداز نہ کرے بلکہ روز مرہ کی روداد کو شاعرانہ انداز میں پیش کر دے۔ واقعات کو مخرب اخلاق سمجھ کر چھوڑے نہیں بلکہ اصلیت کو بے محابا ایک حسن کے ساتھ غزل بنا دے۔ داغ نے اس نفسیاتی پہلو کو محسوس کر لیا اور اپنی غزلیں اس انداز سے کہنے لگے کہ جس میں لوگوں کے صحیح جذبات کی ترجمانی ہو اس اقدام میں انھوں نے اندازِ بیان پر خاص توجہ کی، تیور، تیکھاپن سب سے زیادہ شوخی کو اپنی غزلوں کا جوہر قرار دیا اور ان خصوصیات پر اتنا زور دیا کہ اُردو شاعری میں عدیم المثال سمجھے گئے۔

اردو شاعری کے لئے تیور، تیکھاپن، طنز یا شوخی کوئی بھی نئی بات نہ تھی، ابتداء آفرینش سے یہ سب چیزیں ادائے دلربانہ کی طرح غزلوں میں آرہی تھیں اور لوگوں کے علاوہ جرأت و انشا وغیرہ کے کلام میں یہ عناصر کافی پائے جاتے ہیں مگر داغ کے یہاں یہ سب جزو لاینفک ہوگئے ہیں، اور اس حسن کے ساتھ کہ نہیں معلوم ہوتا کہ محض آرایش کے لئے یہ باتیں لائی گئی ہیں مثال کے لئے سب سے نمایاں عنصر یعنی 'شوخی' لے لیجے۔ جرأت و انشا اپنی شوخی کے لئے بدنام یا مشہور ہیں مگر ان کے یہاں شوخی اشعار میں اتنی گھل مل نہیں گئی تھی کہ اور کا احتمال نہ ہو، صاف معلوم ہوتا ہے کہ عموماً لانے کے لئے یہ شوخیاں لائی گئی ہیں برخلاف اس کے داغ کے یہاں یہ خصوصیت ان کی شخصیت اور زندگی سے وابستہ نظر آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے شوخی ان کی فطرت میں شامل ہوگئی تھی وہ جو کچھ کہتے ہیں وہی سوچتے بھی ہیں اور وہی ان کا مطلب بھی ہوتا ہے اس میں نہ بناوٹ ہے نہ نمایش۔ مثال کے لئے جرأت اور انشاء کے چند اشعار دیکھئے اور پھر داغ کا کلام ملاحظہ فرماکر حقیقت کا فیصلہ کیجئے اور یہ بھی سوچئے کہ شعریت کس کے یہاں زیادہ ہے۔

جرأت :-

میرے گھر میں جو وہ آیا تو بپھر کے یوں بولا　　یہ جاتا تھا کہاں میں اور ہوا میرا کدھر جانا

حرف مطلب کو میرے سن کے یہ بصد ناز کہا　　ہم سمجھتے نہیں بکتا ہے تو سودائی ہے

جرأت و انشا کے اشعار پر ہم یہاں کوئی تنقید پیش نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی شوخی یا طنز اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنی واضح ہے کہ کچھ کہنے سننے کی گنجایش نہیں اس کے مقابلہ میں آپ داغ کے مختلف دیوان اٹھاکر دیکھ لیجئے فرق خود معلوم ہوجائے گا۔ احتیاطاً داغ کے بھی چند اشعار جابجا سے ہم اس ضمن میں پیش کئے دیتے ہیں کہ اگر چاہیں تو ابھی اندازہ کرسکیں۔

انکار مے کشی نے مجھے کیا مزہ دیا　　سینہ پہ چڑھ کے اس نے مے خم پلا دیا

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو　　وہ طریقہ تو بتاؤ تمھیں چاہیں کیونکر

دیکھو ادھر اٹھاؤ نظر ہوچکی حیا　　کیا جانتا نہیں کوئی اس بات کا لحاظ

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں　　صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ملے مجھ سے تو فرمایا تم ہی کو داغ کہتے ہیں　　تمھیں ہو ماہ کامل میں تمھیں رہتے ہو ہالے میں

یہ جاکر پوچھ آ تو ان سے قاصد　　کہ وہ خانہ خراب آئے نہ آئے

حضرت دل آپ ہیں جس دھیان میں　　مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں　　آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

غزل کے بعض اجزاء کو داغ نے اس طرح اسلوب بیان سے لذت آشنا کردیا کہ ان سے پہلے یہ بات نہ پیدا ہوسکی تھی۔ ان کے زمانہ کے لوگوں کو یہ چیز نئی نظر آئی کیونکہ اس میں ادبیت، اصلیت، اور نشتریت سب کچھ شامل تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اُسوقت کی ساری غزل پسند دُنیا داغ کی طرف سمٹ آئی۔ اس کی توجہ کا مرکز داغ کی شاعری بن گئی۔ علمی ادبی صحبتوں میں اس کا تذکرہ ہوتا۔ بزم نشاط میں طوائفیں زیادہ تر داغ کی غزلیں گاتیں۔ غرض کہ ہر جگہ داغ کی شاعری کا تذکرہ تھا۔ ہزاروں شاعر داغ کے شاگرد ہوگئے باقاعدہ رجسٹر کھُل گیا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو داغ کے کلام کو مخرب اخلاق اور مبتذل کہکر اپنی نفرت کا اظہار کرتے رہے لیکن زمانہ یہ کہکر آگے بڑھتا ہی رہا کہ ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور　　اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور

ذرا تو بیٹھئے نزدیک، گر کہوں اس سے ——— تو کس ادا سے وہ کہتا ہے چل یہاں سے دور
یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا ——— چنپئی رنگ اور بدن اس کا وہ گدرایا ہوا
ثواب ہے یہ جو کہئے کسی کا خوش کرنا ——— تو کیا کہے ہے کہ باز آئے اس ثواب سے ہم
محبت مجھ سے تم رکھتے ہو توبہ، ——— چلو کھاؤ نہ بس جھوٹی قسم تم،
مجھ کو رسوائے خلق کرنا ہے ——— اب ترے چاہنے کو آگ لگے

انشاء کی شوخی اور طنز پر تو عموماً ریختی کا گمان ہوتا ہے - چند اشعار ملاحظہ فرمایئے :-

انشاء :-
اختلاط آپ سے اور مجھ سے کہاں کا ایسا ——— واہ جی جان نہ پہچان یہ گالی دینا
ہوئے وعدے پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور ——— اے لو اور بھی تماشا یہ سنو حجاب اُلٹا
مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُلٹا ——— تو کیا بہک کے میں نے بھی اسے سلام اُلٹا
دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا ——— جب دھم سے آکہوں گا صاحب سلام میرا
میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشقِ شیدا اے کانِ ملاحت ——— فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشا یہ شکل یہ صورت
شیخ سے عید کو کیوں آپ ہم آغوش ہوئے ——— کوئی جاتا ہے بھلا ایسے بھی کھوسٹ سے لپٹ
یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر ——— بے تاب ہو کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر

داغ کو زبان و بیان کی صفائی و صناعی سے وہ مقبولیت ہوئی کہ ان کے زمانہ کے زیادہ تر شعراء ان ہی کی روش پر چلنے لگے حتیٰ کہ امیر مینائی سا مقدس و پُرگو شاعر اسی کوشش میں مصروف نظر آنے لگا لیکن چونکہ شوخی امیر مینائی کی فطرت میں نہ تھی، رندی و سرمستی سے بالطبع ان کو کوئی سروکار نہ تھا، ان کے تجربات زیادہ تر سمعی تھے مشاہدات رسمی تھے، ان کو حسن و عشق کے ان مراحل سے نہیں گزرنا پڑا تھا جن کو وہ داغ کی تقلید میں نظم کرنا چاہتے تھے اس لئے باوجود زبان و شاعری پر عبور ہونے کے وہ اس رنگ میں ناکامیاب رہے مگر داغ کی مقبولیت کی سند وہ بھی اپنے اس سعیٔ نامشکور سے دے گئے - ان ہی پر کیا منحصر ہے اس زمانہ کے کسی ممتاز شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھئے آپ کو داغ کی جھلک نظر آئے گی، جلال، اکبر، منیر وغیرہ سب ہی کے یہاں شعوری یا غیر شعوری تقلید داغ کی نظر آتی ہے -

زبان و بیان کے علاوہ داغ کے یہاں ایک اور چیز تھی جس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، اُردو شاعری ابتداء ہی سے غم و الم پر جان دئے ہوئے تھی اس سلسلہ میں اتنا زیادہ مواد اکٹھا ہوگیا تھا کہ لوگ گھبرانے لگے تھے، غم و الم برحق سہی اقبال کا فرمانا بھی درست سہی کہ "ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی" انسان پھر بھی انسان ہے - بقول غالب کے پیالہ و ساغر نہیں ہے وہ کبھی کبھی غم غلط کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر ہنس بھی لے - داغ کا کلام اس مطالبہ کو پورا کرتا تھا - ان کے یہاں اضمحلال و قنوطیت بہت کم ہے زیادہ تر دل بہلانے کی باتیں ہیں اس لئے بھی زمانہ نے ان کے کلام کو دل میں جگہ دی -

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ جن باتوں کو آج، لوگ داغ کی شاعری پر بدنما دھبہ سمجھتے ہیں وہی ان کی کامیاب شاعری کا ذریعہ بن گئی، عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ داغ کے کلام میں غیر معمولی شوخی ہے، متانت و سنجیدگی کا خون بہتا نظر آتا ہے، فلسفہ یا گہرائی اشعار میں نہیں، تصوف سے غزلیں معرا ہیں، مخرب اخلاق اشعار سے اُردو زبان کو نقصان پہونچا، یہ اور اس قسم کی دوسری باتوں سے ایک طبقہ اپنے کو خوش کرلیتا ہے - ان اعتراضات پر جستہ جستہ مضامین کی ضرورت ہے، یہاں اس کی گنجائش نہیں اور نہ ہمارے موجودہ مضمون کا اس سے کوئی تعلق ہے - ان اعتراضات کی مہملیت یا اہمیت سے فی الحال گزر کر ہم کو یہ کہنا ہے کہ جس زمانہ کے رجحانات کی ترجمانی داغ کر رہے تھے اس کے محسوسات صرف اسی شاعری سے آسودہ ہوسکتے تھے جو داغ کا

حصہ تھی، اس لئے کہ مذاق اور روزمرہ کی زندگی اس تفریح یا تعشق سے وابستہ تھی جو مثالی عشق سے کوسوں دور تھی، لوگ اپنے عملی زندگی کا نقشہ کسی باکمال شاعر کے یہاں دیکھنا چاہتے تھے فلسفہ یا گہرائی سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی جس کا ثبوت صرف یہی نہیں ہے کہ داغ کے پیشرو شعرا، مومن، ذوق، آتش، ناسخ وغیرہ کے یہاں بھی یا یہ اجزا کمیاب ہیں بلکہ اُس زمانہ کا سب سے بڑا شاعر اسداللہ خاں غالب بھی لوگوں کو اپنی فلسفیانہ کاوشوں سے خوش نہیں کر سکا جس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ عام طور سے ایسی باتوں کو پسند نہیں کر رہے تھے وہ چاہتے تھے سیدھے سادے الفاظ میں واردات عشق بیان ہو جائے کچھ زبان کی چاشنی ہو کچھ بیان کا لطف ہو مگر واقعات پر پوری روشنی پڑ جائے یہ مطالبہ صرف داغ پورا کر سکے شوخی کی زیادتی اور اخلاق کے خراب ہونے کی شکایت اور تصوف سے بیگانگی کا شکوہ اسوقت کی زندگی نہیں کرنا چاہتی صرف چند نفوس ایسے رہے ہوں گے جنھوں نے کسی وجہ سے ان باتوں کو تیر ملامت بنا دیا تھا اگر خدا نخواستہ یہ وبا عام ہوتی تو داغ کو مقبولیت اس وسیع پیمانے پر نصیب نہ ہوتی، زمانہ ان کے بعد تک ان کی تقلید پر فخر نہ کرتا۔

داغ کے زمانہ میں جس عشق کو غلبہ حاصل تھا اس کا بھی تقاضا تھا اور واقعاتی لحاظ سے بھی عشق میں کبھی کبھی انسان کا خفا ہو جانا اور معشوق کو بُرا بھلا کہنا ناگزیر ہے، عاشق بہرحال انسان ہے اس زمانہ کے لوگ بھی اسے محسوس کرتے تھے، معشوق کی دھمکی، یا ان حرکات سے بیزاری جو خودداری و شرافت نفس کے خلاف ہوں دلوں میں موجود تھی مگر رسم و روایت کی وجہ سے زبان نہ کھلتی تھی داغ نے اس نفسیاتی کشمکش کو محسوس کر لیا اور جا بجا اپنے کلام میں معشوق سے ناراضی اور اپنی خودداری کا ثبوت بڑے تیور سے دیا۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ایسی کیا بو سا گئی تم کو،
ہم سے جو اس قدر دماغ ہوا

بلاسے جو دشمن ہوا ہے کسی کا
وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا

کیا نزاکت کی شکایت ہے غنیمت جانو
ہم نے لپٹا کے گلے وقت سحر چھوڑ دیا

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں
جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

دباؤ کیا ہے سنے وہ جو آپ کی باتیں
رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں

نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں
وہ بے قرار رہے جس نے بے قرار کیا،

در پردہ تم جلاؤ جلاؤں نہ میں چہ خوش
میرا بھی نام داغ ہے گر تم جواب دو

یہ اشعار آئینہ دار ہیں اس زمانہ کے رویہ اور مذاق کے جن کو تشکیل کرنے کے لئے ایک بڑے فن کار اور بیباک اہل نظر کی ضرورت تھی۔ داغ نے اس قسم کے محسوسات کو اپنے اشعار میں ہو بہو پیش کر کے خراج تحسین وصول کر لیا۔ اسی دوراندیشی و فنکاری کی طرف اقبال نے مرثیہ داغ میں اشارہ کیا ہے۔

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ یعنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

ہمارے مضمون کا مفہوم یہ نہیں کہ ہم داغ میں صرف محاسن ہی پاتے ہیں، نہیں بلکہ ہم کو ان کے کلام میں کمیاں و کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں، ہم کو اس کا بھی احساس ہے کہ داغ کے یہاں ہر جگہ وہ خصوصیات نہیں ہیں جو انکی کامیابی کا راز ہیں۔ بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے یہاں فرسودہ، رسمی، مثالی، عناصر بھی کافی ہیں اور جو زبان و طرز بیان داغ دے گئے ہیں وہ اپنے ماحول کے لئے نہایت مناسب سہی لیکن اتنی جاندار نہیں کہ ہر زمانہ میں اتنا ہی کارگر ہو سکے مگر باوجود ان باتوں کے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں ایسی انفرادیت بھی ہے جو ان کو رسمی و روایتی طرز تخیل سے الگ کر دیتی ہے اور

اسی انفرادیت کا سہارا لے کر داغ نے اپنے عہد کی پوری ترجمانی کی۔ بیباکی و صناعی سے اس کو پُرکار بنا دیا، جس مذاق کو انھوں نے پیش کیا اس کے لئے ان کا بیان، زبان سے بالکل ہم آہنگ تھا۔ فی الحال اس سے بحث نہیں کہ وہ مذاق اچھا تھا یا بُرا تھا، جیسا بھی تھا اس کی ترجمانی کے لئے بک زبان کی ضرورت تھی ایک صاحب دل کی احتیاج تھی، اور ایک نکتہ رس و تجربہ کار طباع کی، داغ میں یہ جملہ صفات بیک وقت مجتمع ہوگئی تھیں جن کو کام میں لاکر انھوں نے ماحول کی سرگزشت بیان کردی، چونکہ ان کے محسوسات میں بلا صداقت تھی، ان کے تجربات وسیع تھے وہ حُسن و عشق کے مختلف مراحل سے گزر چکے تھے اس لئے خاطر خواہ کامیابی بھی ان کو نصیب ہوئی، ان کے زمانہ میں اور دور جدید کے پہلے تک اُردو میں ان ہی کا سکّہ چلتا رہا انھوں نے ایک عہد کو شاعرانہ انداز سے اتنا جاندار بنا دیا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی کافی عرصہ تک اس کا اثر اُردو کے دل و دماغ پر رہا۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کی ایک مشہور غزل

اور

داغ کی تضمین

کہتے تھے وہ بشر کو جو دل دے بشر غلط	دیوانہ ہو کسی کا کوئی سربسر غلط
شامت جو آئی اُن کا بیاں جان کر غلط	میں نے کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

یا لب پہ کوئی قطرۂ مے جم کے رہ گیا	یا کچھ عیاں ہوا اثرِ گرمیِ غذا،
یا جھوٹھ بولنے کی خدا نے یہ دی سزا	سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا،
شور و فغاں سے ہے جنبشِ دیوار و در غلط

اک آہ سرد بھر کے کیا طور بیخودی	اُس کو دیا یہ دم کہ تجھے جان نذر کی،
لو دینے والے ہوتے ہیں ایسے ہی تو سخی	مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی،
جانِ عزیز پیشکشِ نامہ بر غلط،

اُجرت پہ رونے والے مقرر ہیں جابجا	میت کو ڈھونڈھئے تو عدم تک نہیں پتا،
ہاں اس خیال سے کہیں ٹھہریو نہ بیوفا	ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا،
مرنے کی اپنی روز اُڑائی خبر غلط

جو عرض کی تھی داغ نے آخر وہی ہوا	کوئی خفا ہو آپ کو ہے چھیڑ کا مزا
دیکھا نہ آخر آج وہ بدخو برس پڑا	یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا،
یہ کیوں کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط

فصیح الملک حضرت داغ دہلوی

(جناب نوح ناروی)

قبل اس کے کہ میں حضرت داغ دہلوی کے کچھ حالات لکھوں یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اب سے بہت پہلے کئی صاحب اُن کے حالات لکھ کر کتابی صورت میں شایع کر چکے ہیں لیکن جلوۂ داغ کے نام سے جو حالات بھائی احسن صاحب مرحوم مارہروی نے لکھے ہیں اُن میں کسی طرح شک و شبہ کی گنجایش نہیں سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ جو حالات لکھے گئے ہیں وہ خود حضرت داغ سے پوچھ کر لکھے گئے یہ کتاب اُن کی زندگی میں شایع ہوئی اور لوگوں نے جو کچھ لکھا وہ اسی کتاب کو دیکھ کر صرف دوسرے الفاظ میں لکھا اب جو باتیں میں لکھوں گا وہ یقینی دوسری کتابوں میں نہ ملیں گی اور سب سے الگ ہوں گی۔

حضرت داغ کب اور کہاں پیدا ہوئے اُن کا تعلق دلّی کے کس خاندان سے ہے، وہ قلعہ میں کیونکر پہونچے خاقانی ہند ذوق سے کیونکر اصلاح لی غدر ۱۸۵۷ء میں اُن پر کیا کیا حادثے گزرے وہ کہاں کہاں گئے، کہاں کہاں رہے یہ باتیں اور لوگ لکھ چکے ہیں لہذا میں نہیں لکھتا ہوں۔

شاعرانہ لحاظ سے میں نے انھیں کی آغوش میں آنکھ کھولی جو کچھ مجھے فیض پہونچا انھیں سے پہونچا جو کچھ میں نے سیکھا انھیں سے سیکھا جن دنوں وہ حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے، میں بہت دنوں تک اُن کی خدمت میں رہا پہلے وہ محبوب گنج میں رہتے تھے پھر ترپ بازار عابد شاپ کے متصل ایک عالی شان کوٹھی میں اُٹھ آئے اور آخر وقت تک یہیں رہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسے وہ شاعر تھے ویسی ہی اُن کو تقدیر بھی ملی اور ویسا ہی انھوں نے قدر دان بھی پایا ان باتوں کا مفصل ثبوت آیندہ ذیل کی سطروں میں ملے گا۔

رام پور — رام پور کا زمانہ تو میری نظروں سے نہیں گزرا لیکن کچھ واقعات میں نے سنے بھی اور کتابوں میں دیکھے بھی اُن معرکوں کے دیکھنے والے تو شاید اب زندہ نہ ہوں گے لیکن موجودہ حضرات نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوگا کہ حضرت داغ کا کلام وہاں جتنے شعراء موجود تھے سب پر مقبولیت کے لحاظ سے فوقیت حاصل کرتا تھا مجھ سے رامپور کے اُس مشاعرہ میں جو نمایش کے موقع پر ہوا تھا ایک سن رسیدہ صاحب نے ذکر کیا کہ نواب خلد آشیاں یعنی نواب کلب علی خاں صاحب کا معمول تھا کہ مشاعرے کے وقت کچھ لوگوں کو مشاعرے کے باہر محض اس خیال سے بٹھا دیتے تھے کہ بعد ختم مشاعرہ لوگ کس کا شعر پڑھتے ہوئے مشاعرے سے باہر نکلتے ہیں، چنانچہ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ داغ صاحب کا شعر پڑھتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاتے تھے۔

ایک بار منشی منیر شکوہ آبادی نے سر در بار حضرت داغ کا دامن تھام کر کہا کہ کیا تمہارے شعر میرے شعر سے اچھے ہوتے ہیں مگر اس کا کیا سبب ہے کہ تمہارے شعر لوگوں کی زبانوں پر رہ جاتے ہیں اور میرے شعروں پر لوگوں کی خاص توجہ نہ ہوتی

ہے نہ کوئی یاد رکھتا ہے اس پر جناب امیر مینائی نے فرمایا یہ خدا داد مقبولیت ہے اس پر کسی کا بس نہیں -

میری پہلی حاضری

پہلی بار جب میں حیدر آباد اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو روز کے حاضر باشوں میں نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر تخلص جاگیر دار امراء و مرزا صاحب نادان، متجاب خاں صاحب خلق، میر منصب علی خاں صاحب عالم، مرزا خورشید عالم صاحب، مرزا مجاہدین صاحب شاہی، احسن مارہروی، افتخار عالم صاحب آزاد مارہروی، نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیز، معتمد صرف خاص آغا صاحب شاعر دہلوی، مرزا منیر الدین صاحب ضیا، عبدالحمید صاحب آزاد، مرزا مظفر حسین صاحب بارق حافظ محی الدین صاحب محفوظ، ڈاکٹر مہدی حسن صاحب الم مولف گلبن تاریخ وغیرہ وغیرہ تھے چوتھے پانچویں حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری اور اختر صاحب خلف امیر مینائی صاحب بھی سلام کرنے کو آجاتے تھے یہ دونوں صاحب اُسوقت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد وزیر سلطنت کے وابستگانِ دولت میں تھے -

فصیح اللغات

احسن مارہروی اُس وقت فصیح اللغات مکمل کر رہے تھے چونکہ مجھے استاد کے بیشتر اشعار یاد تھے اس لئے الفاظ کی سند میں بیشتر میں نے اُنھیں اشعار بتائے اور جن الفاظ کے متعلق کوئی شعر نہ تھا ان کی سند میں نئے شعر استاد کہہ دیا کرتے تھے یادگار داغ مرتبہ احسن میں جو اشعار متفرقات آخر میں ہیں یہ وہی ہیں جو سند میں کہے گئے تھے اسی موقع پر استاد نے فرمایا تھا کہ دیوان حافظ تو دیکھا تھا مگر حافظ دیوان نوح کو پایا اس لغت کے مکمل نہ ہونے کا انھیں بہت افسوس رہا احسن صاحب کچھ دنوں کے لئے اجازت لے کر مکان آئے لیکن پھر نہ جاسکے، حضور نظام نے لغت کا حال کئی بار دریافت کیا اور مہاراجہ نے تو اچھی خاصی رقم تدوین کے سلسلہ میں دی اور آیندہ طبع ہونے کے امداد کا بہت کچھ وعدہ بھی کیا -

سائل صاحب اور معیار الانشاء

دوسری بار میرے حاضر ہونے پر احسن صاحب اور افتخار عالم صاحب آزاد مارہرہ جاچکے تھے اور نواب مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی مع لاڈلی بیگم صاحبہ اور مرزا ناصر الدین صاحب، آگئے اسی زمانہ میں ایک ماہوار رسالہ معیار الانشا، سائل صاحب نے جاری کیا اس میں بیشتر تلامذۂ داغ کی ہم طرح غزلیں بعد اصلاح کے شایع ہوتی تھیں مگر کچھ دنوں تک یہ رسالہ جاری رہکر سائل صاحب کی بے توجہی سے ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا اس کے بعد فصیح اللغات کے متعلق سائل صاحب نے رائے دی کہ ایک ایک حرف ایک ایک شاگرد کے تعلق کر دیا جائے کہ وہ شعر لکھے اور آپ (یعنی داغ صاحب) دیکھیں اور بعد اصلاح و ترمیم کتابی صورت میں مکمل ہونے پر لغت شایع کر دیا جائے لیکن اس کو داغ صاحب نے نہیں مانا اور متعدد خطوط یاد دہانی اور طلبی میں احسن صاحب کو لکھوائے مگر وہ وطن جاکر اپنے ضروری کاموں میں کچھ ایسے اُلجھے کہ ان کا آنا پھر نہ ہوسکا، میرے خیال میں سائل صاحب کی رائے بہت درست اور مناسب تھی اس صورت میں لغت بھی شایع ہوجاتا اور بہت سے شاگردوں کی خاص طور پر شہرت بھی ہوجاتی -

چھان بنان اور چھان بین

ایک بار مرزا خورشید عالم صاحب اور سائل صاحب میں چھان بنان اور چھان بین کے متعلق بڑی دیر تک بحث رہی، قریب تھا کہ بحث بڑھ کر بے لطفی کی حد تک پہونچ جائے میں نے دونوں صاحبوں سے کہا کہ آپ لوگ ناحق جھگڑا کر رہے ہیں استاد سے کیوں نہیں پوچھ لیتے مرزا خورشید عالم صاحب فرما رہے تھے کہ چھان بنان بھی ہے سائل صاحب کا کہنا تھا کہ چھان بنان غلط ہے چھان بین درست ہے، غرض میرے کہنے پر دونوں صاحب داغ صاحب کے پاس گئے اور اپنی اپنی بحث پیش کی حضرت داغ نے فرمایا کہ لال قلعہ میں چھان بنان کا لفظ چھان بین کے علاوہ بولا جاتا تھا لیکن قلعہ سے باہر یہ لفظ مقبول نہیں ہوا اس کی زندگی صرف قلعہ تک محدود رہی اور چھان بین عام طور سے زبانوں پر ہے مگر کوئی شخص چھان بنان کو استعمال شاعری میں کرے تو غلط نہیں کہا جاسکتا -

زندہ دلی اور رنگین مزاجی

داغ صاحب کی زندہ دلی اور رنگین مزاجی اور حسن پرستی کے بہت سے واقعات مجھے معلوم

ہیں لیکن ادب کے خیال سے میں لکھ کر اُن کی روح کو صدمہ نہیں پہونچانا چاہتا حجاب کے واقعات بہت پہلے کے ہیں الہی جان علیگڈھ والی کا وقت بھی میں نے نہیں دیکھا لیکن اُسے علی گڈھ داغ منزل میں دیکھا۔ اختر جان کو البتہ میں نے دیکھا ہے غرض وہ حسن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے، انشائے داغ میں احسن صاحب نے ایک خط کی نقل شایع کردی ہے جو انھوں نے نبی جان الہ آبادی کو لکھا تھا اس خط کی نقل میں بھی کسی موقع سے لکھدوں گا جس سے اُن کی طرز تحریر اور رنگین مزاجی کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔

تین لطیفے

ایک روز مستجاب خاں صاحب خلق جو شاگردوں میں تھے شام کو آئے داغ صاحب کو انھوں نے دیکھا کہ مغرب کی نماز پڑھ رہے ہیں وہ واپس جارہے تھے کہ انھوں نے سلام پھیرا اور مجھ سے فرمایا کہ انھیں بلاؤ وہ آئے تو کہنے لگے کہ آکر واپس جانے کی کیا ضرورت تھی میں نماز پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا اس لطیفے پر حاضرین کو ہنسی آگئی اور وہ بہت شرمندہ ہوئے۔

ایسے ہی مرزا مظفر حسین صاحب بارق ایک موقع پر استاد سے فرمانے لگے کہ آپ بڑی آسانی سے شعر کہ لیتے ہیں مجھے تو شعر کہنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے پان بنواکر دہنے بائیں خاصدان رکھتا ہوں چار پانچ چلمیں حقہ کی بھری جاتی ہیں پلنگ پر لیٹ کر کروٹیں بدلتا ہوں تو شعر کہتا ہوں یہ سُن کر ہنستے ہوئے داغ صاحب نے فرمایا کہ آج معلوم ہوا تم شعر نہیں کہتے بلکہ شعر جنتے ہو۔

اسی طرح ایک دن میں شاگردوں کا رجسٹر دیکھ رہا تھا ۱۰۰۵ میرا نمبر تھا میرے بعد اور بہت سے لوگ اُن کے شاگرد ہوئے غرض تعداد ۲۰۰۰ ہزار سے کم کسی طرح نہ تھی میں نے کہا کہ جناب والا قیامت میں ایک امت آپ کی بھی ہوگی سُن کر ارشاد کیا جسکی امت میں نوح جیسے پیمبر ہوں اُس کی امت کا کیا کہنا۔

مصارف

حضرت داغ اگرچہ معقول تنخواہ پاتے تھے مگر مہینے میں کچھ پس انداز نہ ہوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ داد و دہش میں اُنکا ہاتھ کبھی نہ رُکتا تھا بہت سے اعزا اور مساکین کو پابندی کے ساتھ منی آرڈر کے ذریعہ سے مختلف مقاموں پر روپئے روانہ فرماتے تھے علاوہ اس کے باورچی خانہ اور روزمرہ کا خرچ آنے جانے والوں کی امداد مہمانوں کی خاطر مدارات خیرات مبرات میں سب صرف ہوجاتا تھا باورچی خانہ میں انا لطیفن، سجن چمپا، صاحب جان چار پانچ عورتیں نوکر تھیں جمال صاحب چھوٹے بڑے محبوب اجنا عبدالحمید وغیرہ دس بارہ خدمت گار رحمت اللہ قوال، غلام رسول کاتب، دیوان منشی عبدالغنی صاحب تحویل دار عبدالعزیز صاحب منیجر وغیرہ اچھی اچھی تنخواہیں پاتے تھے کپڑا بدلنے کا روزانہ معمول تھا عطر سے خاص رغبت تھی بالخصوص سہاگ زیادہ پسند فرماتے تھے اور وہ مدراس سے آتا تھا چار گھوڑے دو گاڑیاں پھر سائیس کو چبان دانہ گھاس کے مصارف تھے غرض بچت کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ اکثر مہینوں میں دیکھا گیا ہے کہ جب روپیہ نہیں رہا تو نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر کے ہاں سے منگوایا گیا اور تنخواہ آنے پر سب سے پہلے اُن کا مطالبہ ادا کردیا گیا۔

حضور نظام کے کلام پر اصلاح

نواب میر محبوب علی خاں صاحب آصف تخلص علاوہ سخن سنجی اور قدردانی کے بڑے زود گو اور قادر الکلام تھے باوجود مصروفی امور سلطنت کے بشتر دیکھا گیا ہے کہ ایک ایک دن میں کئی کئی غزلیں کہ ڈالی ہیں جس دن وہ شعر کہنے کو آمادہ ہوتے تھے شاہی چوب دار متعدد بار آتا تھا جب غزل ختم ہوتی فوراً اُس کی معرفت استاد کے پاس اصلاح کے لئے سربمہر لفافے میں روانہ فرماتے اور یہ سو کام چھوڑ کر اپنے دست خاص سے اصلاح فرماکر پھر سربمہر لفافے میں واپس کرتے لیکن باوجود کوشش کے کسی کو یہ نہ معلوم ہوسکا کہ نظام نے کیا لکھا اور انھوں نے کیا اصلاح دی ایکبار اتنا ضرور فرمایا کہ بادشاہوں کے مصرعے یا الفاظ کاٹے نہیں جاتے بلکہ اصلاحی مصرعہ یا اصلاحی الفاظ اوپر لکھدئے جاتے ہیں۔

ممتاز شاگردوں کے نام یوں تو شاگردوں کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی لیکن ذیل کے شاگرد امتیازی درجہ رکھتے تھے بہت سے انتقال کر گئے چند حضرات ابھی زندہ ہیں خدا ان کو سلامت باکرامت رکھے۔

آصف حضور نظام دکن مرحوم ۔ احسن صاحب مارہروی مرحوم ۔ سید قطب الدین صاحب اشک مرحوم ۔ علامہ سر اقبال صاحب مرحوم ۔ ڈاکٹر مہدی حسن صاحب آلم حیدر آبادی ۔ سید محمد اختر صاحب اختر مرحوم نگینوی ۔ ازل لاہوری ۔ عبدالحمید صاحب آزاد حیدر آبادی ۔ نواب میر حسن علی خاں صاحب امیر مرحوم حیدر آبادی ۔ مرزا مظفر حسین صاحب بارق علی گڑھی ۔ بشیر رامپوری مرحوم ۔ منشی فضل رب صاحب باغ مرحوم سنبھلی ۔ سید حسین احمد میاں صاحب ۔ بیباک شاہجہاں پوری مرحوم ۔ سید حامد حسین صاحب بیدل مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم بیخود بدایونی ۔ حاجی سید وحیدالدین احمد صاحب بیخود دہلوی ۔ سید بشارت علی صاحب جالب مرحوم ۔ محمد علی صاحب جوہر مرحوم رامپوری ۔ پنڈت لبھورام صاحب جوش ملسیانی ۔ مولوی حسن رضا خاں صاحب حسن مرحوم بریلوی ۔ مستجاب خاں صاحب خلق حیدر آبادی ۔ سید امیر حسن صاحب دلگیر مارہروی ۔ منشی حیات بخش صاحب رسا مرحوم مصطفےٰ آبادی ۔ منشی حب لال صاحب رعد ۔ پنڈت تربھون ناتھ صاحب زتشی زار دہلوی ۔ نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سایل دہلوی مرحوم ۔ منشی عاشق حسین صاحب سیماب مرحوم اکبر آبادی ۔ آغا مظفر بیگ صاحب شاعر مرحوم دہلوی ۔ مشرف یار خاں صاحب شرف مرحوم جاورہ ۔ یوسف حسن صاحب طپش مرحوم مارہروی ۔ نانک پرشاد صاحب طالب مرحوم ۔ صولت حیدر آبادی ۔ مولانا مظفر علی خاں صاحب ظفر ۔ مرزا منیر الدین صاحب ضیا دہلوی مرحوم ۔ نواب عزیز یار جنگ صاحب عزیز حیدر آبادی ۔ حاجی عطا محمد صاحب عطا مرحوم بدایونی ۔ عیش بھوپالی ۔ منشی عبدالوحید صاحب فدا گلاوٹھوی ۔ فیروز خاں صاحب فیروز مرحوم رامپوری ۔ محمد الدین صاحب فوق لاہوری ۔ سید رضی الدین صاحب کیفی مرحوم حیدر آبادی ۔ منشی دیبی پرشاد صاحب مایل مرحوم مین پوری ۔ منشی عبدالغفار خاں صاحب مرحوم مفتوں دہلوی ۔ منشی ناراین پرشاد صاحب مہر مرحوم گوالیاری ۔ ممتاز علی خاں صاحب ممتاز مرحوم ۔ محمود علی خاں صاحب محمود مرحوم رامپوری ۔ حافظ محی الدین صاحب محفوظ مرحوم حیدر آبادی ۔ مولوی متین الدین احمد صاحب متین مچھلی شہری ۔ ڈاکٹر مبارک حسین صاحب مبارک عظیم آبادی ۔ مولانا ابوالحسن صاحب ناطق گلاوٹھوی ۔ منشی شبیر حسن صاحب نسیم مرحوم بھرت پوری ۔ امراؤ مرزا صاحب نادان مرحوم دہلوی ۔ نوح ناروی ۔ وجاہت حسین صاحب وجاہت مرحوم جھنجھانوی ۔ نواب ناظم علی خاں صاحب ہجر شاہجہاں پوری ۔ جو لوگ انتقال کر چکے ہیں اُن کے اسمائے گرامی محض اس خیال سے لکھے گئے ہیں کہ کم سے کم اُن کا ذکر تو اس سلسلہ میں آجائے ورنہ کچھ دنوں میں لوگ انھیں بھول جائیں گے مرنے کے بعد کون کس کو یاد کرتا ہے اور کون کس کو یاد رکھتا ہے ان میں سے بیشتر صاحب تصانیف ہیں اور بہت سے لوگوں کا کلام کتابی یا دیوان کی صورت میں شایع نہیں ہوا۔

روزانہ مشاغل حضرت داغ نماز صبح پڑھنے کے بعد آفتاب نکلتے نکلتے گرمی کے زمانے میں معمولاً اپنی کوٹھی کے پھاٹک کے قریب اندرونی جانب آرام کرسی پر بیٹھ جاتے تھے پندرہ بیس کرسیاں اُٹھنے بیٹھنے والوں کے لئے اور ڈال دیجاتی تھیں میز پر قلم دوات لفافہ سادہ کاغذ رکھدیا جاتا تھا اکثر نواب میر حسن علی خاں صاحب ۔ سید حامد حسین صاحب بیدل شاہجہاں پوری اور بیشتر یہی اُن غزلوں کو سنا کر اصلاح لیتا جو باہر سے ڈاک پر آتی تھیں پڑھنے والا پڑھتا تھا اور استاد اسی وقت برجستہ اصلاح دیتے جاتے تھے دورانِ اصلاح میں اگر کوئی لفظ یا مصرعہ سُنانے والے کے ذہن میں آتا تو وہ بلا تامل عرض کرتا پسند ہوتا تو وہی رکھدیا جاتا ورنہ خود درست فرماتے جب غزل ختم ہوتی تو لفافے میں بند کر کے روانہ کردی جاتی ان غزلوں کا اوسط روزانہ کسی طرح بیس بائیس سے کم نہ تھا اور یہ شغل بغیر ناغہ دس بجے دن تک رہتا تھا پہلے میرا خیال وطن میں تھا کہ مبتدی شاگردوں کا کلام داغ صاحب کیا دیکھتے ہوں گے ممتاز شاگردوں کے حوالے کردیا جاتا ہوگا لیکن یہاں آنے پر دیکھا گیا

ہر شاگرد کا کلام خواہ وہ کسی درجے کا ہو خود سنتے اور خود اصلاح فرماتے تھے، اس دوران میں اتفاقاً اگر کوئی مقامی شاگرد آگیا تو اُس کے کلام کی بھی اصلاح ہوجاتی ورنہ مقامی لوگوں کے لئے بعد ظہر کے وقت مقرر تھا وہ لوگ آتے اور خود اپنا کلام سُناتے اور خود اصلاح لیتے اِن اصلاحوں کے لکھنے سے مجھے یا نواب میر حسن علی خاں صاحب یا بیدل صاحب کو کوئی واسطہ نہ تھا گیارہ بجے دن کے قریب کوٹھی کے اندرونی حصّے میں دسترخوان بچھتا جو لوگ موجود ہوتے سب کھانے میں شریک کئے جاتے کھانے میں ہر قسم کی چیزیں ہوتیں بعض بعض دن فرمایش کردینے سے وہ چیز بھی پکتی جس کے لئے حکم دیا جاتا، تناول طعام کے بعد حضرت داغ کے سامنے پیچوان (حقہ) لگا دیا جاتا نواب میر حسن علی خاں صاحب کے لئے گڑگڑی حاضر کی جاتی پھر استاد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے اور شطرنج کی دو ایک بازی کھیلتے یا احباب جمع ہوجاتے تو اُن سے گفتگو کرتے یا مقامی شاگردوں کی غزل پر اصلاح فرماتے عصر کی نماز کے بعد دسویں پندرھویں ہوا خوری کے لئے جوڑی پر سوار ہوکر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نکلتے اور زیادہ تر سکندر آباد، حسین ساگر یا باغ عام کی طرف تشریف لے جاتے گاڑی پر دہنی طرف صدر میں خود بیٹھتے بائیں طرف برابر میں نواب میر حسن علی خاں صاحب کو بٹھاتے سامنے کی نشست گاہ میں سید حامد حسین صاحب بیدل اور مَیں ہوتا کچھ دیر تک تفریح فرماکر واپس تشریف لاتے اور مغرب کی نماز پڑھتے فریضہ ادا کرنے کے بعد کبھی رحمت اللہ قوال کبھی اور کسی سے اور کبھی اختر جان سے گانا سنتے پھر رات کا کھانا تناول فرماتے، عشا کی نماز کے بعد خود شعر کہتے اشعار کہنے کی یہ صورت تھی کہ وہ بولتے جاتے تھے اور ایک آدمی مسودہ کی کتاب میں لکھتا جاتا تھا، لکھنے والا ایک شعر نہ لکھنے پاتا تھا کہ دوسرا شعر موزوں ہوجاتا تھا اسی طرح بہت جلد غزل طیار ہوجاتی تھی ایک مصرعہ کبھی اُن کی زبان مُبارک سے نہیں سنا گیا جب کہا پورا شعر کہا یہ معلوم ہوتا تھا خط لکھا رہے ہیں اُن کا یہ بھی معمول تھا کہ پہلے مطلع فرماتے تھے اور نئی زمین نکالتے تھے جس قدر شعر کہنے ہوتے وہ کہکر سوتے بعض دن تھوڑی دیر تک سوکر جاگ اُٹھتے چونکہ میرا کمرہ قریب تھا اس باعث سے مجھ کو فوراً جگواتے اور میرے جاگنے سے قریب کے اور سونے والے بھی جاگ اُٹھتے حُقّہ بھرا جاتا اور بڑی دیر تک دلّی وغیرہ کے واقعات بیان فرماتے پھر سو رہتے اور علی الصباح بیدار ہوتے۔

نظام کا استفسار اور حضرت داغ کا جواب ایک بار اعلیٰ حضرت نے داغ صاحب سے بذریعہ خط کے دریافت کیا کہ آپ کے شاگردوں میں سب سے کون اچھا ہے اس کا جواب بھی انھوں نے لکھدیا جو مقامی شاگرد اپنے کو اس کا حق دار سمجھتے تھے اب اُنھیں فکر ہوئی کہ کس کا نام لکھا گیا لیکن دریافت کرنے کی جسارت کسی کو نہ ہوتی تھی آخرکار جب نہ رہا گیا تو نواب میر حسن علی خاں صاحب نے پوچھا پہلے تو داغ صاحب خاموش رہے مگر دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں نے زمانہ کو دیکھنے کی طرح دیکھا ہے لال قلعہ میں پرورش ہوئی بہت دنوں تک نواب کلب علی خاں صاحب کی دربار داری رام پور میں کی اور اب اتنے دنوں سے حیدر آباد میں ہوں میں نے حضور نظام کو لکھ دیا کہ آپ سے بہتر میرا کوئی شاگرد نہیں آخر وہ بھی تو میرے شاگرد ہیں یہ معقول جواب سن کر سب اپنی جگہ خاموش ہوگئے۔

داغ صاحب کا احترام حضرت داغ چونکہ شاہی اسٹاف میں تھے اس لئے سفر حضر سیر و شکار میں اعلیٰ حضرت کے ہمراہ رہتے تھے، میر محبوب علی خاں صاحب کی عادت تھی کہ جس سے مخاطب ہوتے تھے گھنٹوں کھڑے کھڑے اُس سے باتیں کرتے تھے ایک بار داغ صاحب سے کچھ دیر تک کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے کچھ دیر تک تو یہ متحمل ہوسکے آخر میں گر پڑے اُس وقت سے یہ اعزاز بخشا گیا کہ ہم چاہے جس حال میں ہوں داغ صاحب کے لئے کرسی رکھدی جایا کرے چنانچہ اس وقت سے یہی ہوتا رہا کہ انھیں ہمیشہ بیٹھنے کو کرسی مل جاتی تھی۔

فقراء اور بزرگانِ دین سے عقیدت حضرت داغ کو فقرا سے بے حد عقیدت تھی جو سائل آجاتا اُس کو خالی ہاتھ کبھی نہ جانے دیتے حیدر آباد میں بیشتر عرس ہوتے رہتے تھے وہ ہمیشہ پہونچنے کی کوشش فرماتے

امیر مینائی صاحب کے عرس میں اُن کے ساتھ جانے کا مجھے بھی اتفاق ہوا ہے تیسرے چوتھے روز کسی نہ کسی بزرگ کی فاتحہ ضرور دلوائی جاتی تھی اور خاص اہتمام ہوتا تھا اجمیر شریف کا وہ بہت احترام کرتے رہے کئی بار وہاں حاضر بھی ہوئے اور پھر جانا چاہتے تھے کئی بار مجھ سے ذکر کیا اور نارے تشریف لانے کا بھی وعدہ فرمایا لیکن اتفاق وقت سے نہ اجمیر شریف پہونچ سکے اور نہ نارہ تشریف لائے یہ حسرت اُنکے اور میرے دل میں رہ گئی۔

انعام واکرام وخطابات

علاوہ معقول تنخواہ کے ہمیشہ نظام انعام و اکرام سے اُن کو سرفراز فرماتے تھے بیش ترمیش قیمت چیزیں اُن کو عنایت فرمائیں قصیدوں پر مالا مال کیا ایک گاؤں بھی دیا میرے سامنے کی تو بات نہیں ہے لیکن سنتا ہوں کہ مرزا ناصرالدین صاحب کی تسمیہ خوانی کے موقعہ پر جو ہار حضور نے آکر پہنایا تھا اُس کی قیمت سوا لاکھ تجویز کی گئی بلبل ہند دبیرالدولہ ناظم یارجنگ استاد جہاں فصیح الملک جیسے مہتم بالشان خطابات بھی دربار سے اُنھیں ملے۔

حضور نظام کا مکان پر تشریف لانا

ایک بار قریب گیارہ بجے رات کو دربان نے آکر داغ صاحب کو اطلاع دی کہ ایک عرب کے صاحب پھاٹک پر کھڑے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں چونکہ ناوقت ہے اس لئے پوچھنے آیا ہوں نواب میرحسن علی خاں صاحب نے کہا کہ اُن سے جاکر کہو یہ وقت ملنے کا نہیں صبح کو تشریف لائے یہ جواب سُن کر دربان چلا گیا اور فوراً پھر واپس آکر کہنے لگا کہ انھوں نے کچھ تحکمانہ لہجے سے کہا ہے کہ جاکر کہو ہم اسی وقت ملیں گے غرض وہ صاحب تشریف لائے، داغ صاحب دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم لوگوں کو اشارے سے ہٹا دیا بڑی دیر تک وہ صاحب بیٹھے رہے جب جانے لگے تو داغ صاحب کچھ دور تک اُن کو پہونچانے آئے معلوم ہوا کہ تبدیل لباس نواب میر محبوب علی خاں صاحب تھے یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے سُنا ہوا نہیں ہے

حضرت داغ کے دو خط

میرے لڑکے ابوالحسن مرحوم کے نام

برخوردار نورچشم راحت جان سلمہ اللہ تعالیٰ دُعائے ترقی عمر و دولت کے بعد مدعا نگا ہوں تمھارے والد ماجد کے یہاں آنے سے مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے اپنے بچھڑے ہوئے فرزند کے ملنے سے ہوتی ہے مگر ایک بات سے سخت حیرت ہے کہ وہ اپنی اشتہا وہاں فروخت کر آئے ہیں یا گروی کر آئے ہیں یا خیرات میں نے جو امتحان لیا تو مینا سے بھی وہ کم کھاتے ہیں نہیں معلوم میرے گھر کا کھانا اُنھیں پسند نہیں آتا یا بھوک ہی گھٹ گئی ہے یا نارے والے سب اتنا ہی کھاتے ہیں اگر کہتا ہوں کہ کچھ فرمائش کرو تو وہ نہیں سنتے، تم صاف صاف لکھو کہ وہاں ان کو کون کون سا کھانا پسند تھا کون سی چیز مرغوب تھی کہ یہاں بھی وہی پکوائی جائے میرا قصد مصمم ہے کہ جب میں اجمیر شریف کی زیارت کو جاؤں گا تو نارے بھی تمھیں دیکھنے آؤں گا مگر بےخبر آؤں گا اور فوراً تمھیں دیکھ کر اُسی دن اور اُسی وقت واپس آؤں گا، بیٹا روپیہ یوں ہی جمع ہوتا ہے کہ تمام گھر پاؤ بھر کھانا کھالیا کرے نارے میں زیادہ اس واسطے نہیں ٹھہرنے کا کہ میرا کھانا دیکھ کر وہاں کے لوگ مجھے کھا جائیں گے، میرے ساتھ سات آٹھ آدمی ہوں گے، اپنی خیریت سے اطلاع دو اپنی بہن کو بہت بہت دُعا کہنا تمھارے والد بفضلہ خیریت سے ہیں اس کا جواب کسی سے لکھواکر بھجواؤ۔ فصیح الملک داغ دہلوی - ۱۳ ستمبر ۱۹۰۴ء

یہ خط انشائے داغ مولفہ احسن صاحب صفحہ ۹۳ پر ہے اور اس خط کے نیچے ذیل کی عبارت درج ہے :-

مرزا داغ کے بزرگانہ اشفاق و الطاف یوں تو اپنے تمام شاگردوں کے ساتھ عام تھے مگر وہ تلامذہ جو اُن کی خدمت میں حاضر رہتے اور اپنے خلوص وخصوصیت سے حاضر و غائب جاں نثار رہے اُن پر خصوصی مہربانی رہتی برادرم نوح بھی اُنھیں خصوصی تلامذہ میں ہیں جب ۱۹۰۴ء میں دوبارہ خدمت استاد میں حاضر ہوئے ہیں اُس وقت یہ خط اُن کے فرزند کے نام لکھوایا گیا جو اُس وقت بہت کم سن تھا اور افسوس ہے کہ اب وہ دُنیا میں نہیں مرحوم کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی شفقت بزرگانہ و مربیانہ سے اپنے شاگردوں کے ایسے خانگی حالات پوچھا کرتے تھے جس سے واقفیت کے بعد مختلف قسم کی ہمدردیاں قایم ہوجاتی تھیں اور خصوصیتوں کا پتہ چلتا تھا وہ کھانے کے بہت شوقین تھے اور ذرا ذرا بہانہ ڈھونڈکر کھانا پکواتے تھے کسی چیز کے کھانے کا جی تو خود ہوتا مگر دوسروں پر رکھ کر فرمائشیں کیجاتی تھیں

کہ آج فلاں صاحب کے لئے فلاں چیز پکے گی۔ یہ باتیں بالتفصیل اُن کی سوانح عمری میں لکھنے کے لایق ہیں یہاں مختصراً اشارہ کر دیا گیا ہے۔

نبی جان طوایف الہ آبادی کے نام انشائے داغ مولفہ جناب احسن صفحہ ۶۶

"حور کی صورت نور کی مورت خوش رہو اور ہم سے ملو، کل محمد نوح صاحب تشریف لائے، آج بر سبیل تذکرہ تمہاری طرف سے ہمارا ایک ہدیہ پیش کیا یعنی تمہاری تصویر تصویر نہیں بلکہ تیرا نام پوچھا تو سُن کر خواہ مخواہ ایمان لانا پڑا (نبی جان تبقدیم نون) بار خدایا ایسی صورت بھی تو نے پیدا کی ہے سیرت کی تعریف سنی تو صورت سے بڑھ کر خوش آواز خوش مزاج پھر اُس پر پڑھی لکھی زمانہ ایسے لوگوں کی جتنی قدر کرے بجا ہے۔

بت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں،

کیوں جی تم سے کیونکر ملیں تم کو کیونکر دیکھیں کیوں کر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اُس کا کیا حال ہوگا تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی آؤ، ہائے مجبوری وائے مجبوری میں نے سُنا ہے کہ مہتاب داغ تمہارے پاس نہیں ہے بطور ہدیہ بھیجا جائے گا اگر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے تو غنیمت ہے ہم نے جو تحریر میں سبقت کی یہ خلاف عادت ہے

دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

سوئے ادبی کے خیال سے تمہارے نام میں ایک نقطے کا تغیر و تبدل کر دیا ہے (نون) کا نقطہ (بے) کی جگہ اور (بے) کا نقطہ (نون) کی جگہ یعنی بجائے نبی جان بنی جان تمہاری تصویر کی شان میں ایک رُباعی کہی ہے :-

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ رے شریر سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دل کا جال، کھنچوائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر

فصیح الملک داغ دہلوی"

اس خط کے نیچے احسن صاحب کی لکھی ہوئی یہ عبارت ہے۔

برادر بجان برابر حضرت نوح ناروی جو دنیائے شاعری میں مشہور و معروف ہیں وہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۲ء کو استاد مرحوم کے پاس حیدر آباد آئے اور یہ تصویر پیش کی جس کے جواب میں تحریر مذکور لکھوائی گئی ان خطوط میں یعنی انشائے داغ میں یہی ایک خط ایسا ہے جس کی شوخی و ظرافت مرزا داغ کی طبیعت خاص کا پتہ دیتی ہے اسی طرح وہ ایک اور طوایفوں سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی تھی خصوصاً منی جان حجاب کو اکثر خطوط بھیجے گئے مگر اس وقت تک ہمیں اُن کی نقلیں نہ مل سکیں ورنہ اُن کے مطالعہ سے مرزا صاحب کی شوخی ذہانت اور جودت و ذکاوت کے جوہر اچھی طرح نمایاں ہوتے۔

اس موقع پر احسن صاحب ایک خاص بات لکھنے کو بھول گئے یعنی جب یہ خط بیل بوٹے والے لفافے میں رکھ کر مجھ سے پتہ لکھنے کو کہا گیا تو میں نے تھوڑی دیر تک کچھ نہ لکھا ارشاد ہوا پتہ کیوں نہیں لکھتے میں نے کہا گستاخی معاف ہو ڈاک خانے کی مہریں پڑ کر اس لفافے کے کام کو خراب کر دیں گی اگر حکم ہو تو اس لفافے کو اور ایک دوسرے بڑے لفافے میں رکھ کر بڑے لفافے پر پتہ لکھ دوں لیکن اس لفافے پر کوئی شعر ہونا چاہئے پہلے تو استاد مسکرائے پھر فوراً یہ مطلع کہا :-

شوق کھلنے نہ دیا عشق کا پردہ رکھا اس لئے ہم نے لفافے میں لفافہ رکھا

اور یہ مطلع مینا کار لفافے پر لکھ کر خط ڈاک میں ڈلوا دیا گیا۔

جناب ظہیر دہلوی و جناب داغ

جناب سید ظہیر الدین صاحب ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت خاقانی ہند ذوق دہلوی یعنی خواجہ تاش جناب داغ دہلوی مع اپنے نواسہ سید اشتیاق حسین صاحب شوق کے مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر شاد تخلص یمین السلطنت کے وابستگان دولت میں تھے ان کے فضل و کمال کے متعلق کچھ لکھنے

کی ضرورت نہیں بڑے بڑے لوگوں کی صحبتیں اُٹھا چکے تھے، دلی کا بنا بگڑنا ان کی نگاہوں کے سامنے ہوا اور ان مشاعروں میں شریک رہے جن میں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، آشفتہؔ، آزردہؔ، صہبائیؔ، سالکؔ، مجروحؔ، انورؔ، نیرؔ، شیفتہؔ، حالیؔ، نسیمؔ وغیرہ وغیرہ جیسی شخصیت کے لوگ موجود تھے شہرت دوسری چیز ہے ورنہ باعتبار مشق و معلومات فن کے ان کا درجہ داغؔ صاحب سے کم نہ تھا وہ جس دن یہاں تشریف لاتے عجیب لطف رہتا آپس میں اکثر غزل خوانیاں ہوتیں دلی کے قدیم زمانے کے تذکرے چھڑتے گزشتہ دور پر اظہار تاسف کیا جاتا مگر اس بے تکلفی پر بھی اتنا لحاظ تھا کہ اختر جان وغیرہ ان کے سامنے نہ آسکتی تھیں۔

جناب امیر مینائی اور حضرت داغ

امیر و داغ کو خدا بخشے اپنے زمانۂ حیات میں باوجود ہمعصر ہونے کے ایک دوسرے کے معترف و مداح رہے، درمیانی لوگوں نے آپس میں لڑاکر تماشا بہت کچھ دیکھنا چاہا لیکن دونوں کے باہمی ارتباط میں آخری وقت تک کوئی فرق نہ آیا، میرے دوست جناب منشی حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہاں پوری نے جو منشی صاحب کے ایک ممتاز شاگرد اور اس وقت ان کے جانشین اور جیتی جاگتی یادگار ہیں ایک واقعہ اپنے سامنے کا بیان کیا کہ ہمارے سامنے ایک صاحب نے منشی صاحب کے خوش کرنے کو داغؔ صاحب کی کچھ برائی کی وہ اس کی تاب نہ لاسکے اور بگڑکر ناخوشی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ میرے سامنے جو داغؔ کو بُرا کہتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُس کا منھ نوچ لوں اس کے بعد انھوں نے داغؔ صاحب کا مطلع یہ کہکر پڑھا کہ ایسا کون کہہ سکتا ہے کوئی کہکر تو دکھائے:۔

دل کا کانٹا زبان سے نکلا خارِ حسرت بیان سے نکلا

منشی صاحب حیدرآباد تشریف لے گئے اور داغؔ صاحب کے مہمان ہوئے اس وقت کے واقعات میرے پیشِ نظر ہیں آپس میں کوئی فرق مراتب کا سوال ہی نہ تھا دونوں بزرگ اپنا اپنا کلام سناکر آپس میں داد لیتے تھے اور ایک دوسرے کی مدح و ثنا کرتے تھے وہ دن بھی کیا دن تھے اب وہ زمانہ کاہیکو دیکھنے کے لئے ملے گا ایک خواب تھا جو کچھ دنوں تک دیکھا گیا۔

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ میرے بے تکلف دوست جناب ماہر القادری صاحب نے اپنے رسالۂ فاران میں کچھ خطوط امیر و داغ کے شایع کئے اور اُنھیں خطوط کی نقل نگار لکھنؤ میں چھپی اِن خطوں میں داغؔ صاحب کی کمزوریاں دکھاکر منشی صاحب کی فضیلت دکھائی گئی اور یہاں تک ثابت کیا گیا کہ داغؔ صاحب سے اپنے شعروں میں مشورہ فرماتے تھے۔

اِن خطوں کے متعلق میرا ایک لمبا چوڑا مضمون ماہ نامہ رسالہ احسن رامپور اپریل نمبر ۱۹۰۱ء میں شایع ہوچکا ہے اُس کا دُہرانا میں فضول سمجھتا ہوں چونکہ ان خطوں کا ذکر آگیا ہے لہذا چند اقتباس اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

جناب احسن اللہ ثاقبؔ جو خطوط منشی امیر احمد صاحب کے مولف اور منشی صاحب کے ممتاز شاگرد بھی ہیں اپنی کتاب صفحہ ۳۴ سطر ۱۰ میں لکھتے ہیں:۔

آخر عمر میں استاد یعنی منشی صاحب نے داغؔ کے رنگِ کلام اور مقبول عام کو دیکھ کر زبان کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے تاہم صنم خانۂ عشق کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہ پہونچی۔

خود منشی صاحب اپنے خط میں داغؔ صاحب کو لکھتے ہیں اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۰ سطر ۱۰

ملک کو آپ کی قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اُس کو آپ کا دل بخوبی جانتا ہوگا۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۸ سطر ۱۸

آپ نے جو لکھا ہے کہ اصلاح کی وجہ سے فرصت نہیں ملتی جان غضب میں ہے اس کا مجھے یقین ہے کیونکہ مجھ پر بھی یہی گزر رہی ہے۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۷ سطر ۱

آج حمید آپ کا ملازم میرے پاس آیا مجھے اُس کے دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ یہاں تھے اور اس یاد کی لذت میں میں نے

گلے سے لگالیا اور اس کی اُن آنکھوں کو جن سے وہ دس بارہ دن بیش تر آپ کے جمال جہاں آرا کو دیکھا کرتا تھا میں دیر تک حسرت کی نگاہ سے دیکھا کیا اور بار بار آپ کے حالات اور ضبط اوقات کی کیفیات پوچھا اور سنا کیا۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۵۹ سطر ۱۶

اس کی امید کہاں کہ آپ کے سہرے کے سامنے میرے سہروں کے شعر نظر کیمیا اثر میں چھپے ہوں۔

پھر اسی کتاب کا صفحہ ۲۶۰ سطر ۱۸

آپ کی ذات سراپا صفات اس طبقہ نام ور کی شہرت اور غایت مشاقی سے بہت غنیمت ہے کہ غزل کہدینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لہٰذا درخواست ہے کہ اپنی طبع نازک پر جبر کرکے گلچیں کے لئے بالالتزام غزل دینے کا وعدہ کیجئے مگر یہ پہلے سے کہ رکھتا ہوں کہ غزل ایسی کہا کیجئے گا کہ ہم سے غریبوں کو بھی کہنے کی گنجایش ہے یہ نہ ہو کہ پہلے ہی سے دُنیا بھر کے قلم توڑ دئے جائیں۔

الغرض اِن خطوں کی عبارت ثاقب کی ذاتی رائے اور داغ صاحب کے ممتاز شاگردوں کی تعداد دیکھ کر کس کے منھ میں زبان ہے جو یہ کہے کہ داغ صاحب نمشی امیر مینائی صاحب سے اپنے کلام میں مشورہ فرماتے تھے کیا لوگوں کے ذہن میں نمشی صاحب کے یہ اشعار نہیں ہیں:-

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرعہ ہو ۔۔۔ بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کہاں ہم اے امیر اب اور کہاں داغ ۔۔۔ وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک
جب سے سُنا امیر کہ ہیں داغ دردمند ۔۔۔ لاکھوں پڑے ہیں سینۂ اہلِ سخن میں داغ

جناب جلالؔ و جناب داغؔ

حیدر آباد کے قیام میں داغ صاحب سے میں نے اکثر سنا تھا کہ جناب جلال کے مزاج میں غصہ بہت ہے اور وہ ذرا ذراسی بات پر برہم ہوجاتے ہیں مجھے ایک بار اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا وہ منصور نگر لکھنؤ میں رہتے تھے تین در کا کمرہ تھا دو دروازے بند تھے تیسرے دروازے کا نصف حصّہ کھلا ہوا تھا میں نے جھانک کر دیکھا وہ سیتل پاٹی پر ایک تکیہ کی آڑ لئے ہوئے کسی شاگرد کی غزل پر اصلاح فرمار ہے تھے ان کے غیظ وغضب کے ڈر سے میں نے دیکھ کر فوراً سر باہر کرلیا اسی طرح کبھی جھانکتا تھا اور کبھی سر باہر کرلیتا تھا ایک بار مجھے انھوں نے دیکھ لیا اور بہت زور سے بولے کون ہے میں نے کہا میں الہ آباد سے قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا ہوں چند منٹ کے بعد حکم ملا اندر چلے آؤ میں نے ڈرتے ڈرتے قدم کمرے میں رکھا اور نہایت ادب وخاموشی کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ گیا وہ دیر تک اصلاح فرماتے رہے اور مجھ سے مخاطب نہ ہوئے جب غزل کی اصلاح ختم ہوچکی تو میں نے قدم بوس ہونے کے بعد کہا دو حسرتیں لے کر میں حاضر خدمت ہوا تھا کہ قدم بوسی حاصل کروں اور کچھ آپ کی زبان مبارک سے سنوں کہ مجھے کہنے کو ہوجائے کہ میں نے جناب کی زبان مُبارک سے جناب کا کلام سنا ہے پہلی تمنا قدمبوسی کی تو پوری ہوگئی دوسری آرزو کا پورا ہونا آپ کی شفقت وعنایت پر منحصر ہے۔ یہ سن کر وہ خاموش رہے پھر میں نے کہا شاید میری التجا قبول نہیں ہوئی غرض بڑی بے توجہی کے ساتھ انھوں نے بیاض اُٹھائی اور "مکاں آتے آتے جہاں آتے آتے" اس زمین پر جو غزل تھی وہ سنانے لگے میں اپنی سمجھ کے مطابق داد دیتا رہا "ہچکیاں آتے آتے" جب یہ شعر انھوں نے سُنایا تو اتفاقاً شامتِ اعمال سے میرے منھ سے یہ نکل گیا کہ اس قافیے کو داغ صاحب نے بھی خوب کہا ہے، کہنے لگے انھوں نے کیا کہا ہے، میں نے یہ شعر سُنایا:-

✓ مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا ۔۔۔ نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ وہ نہایت برہم ہوئے اور کہا "نکل جاؤ زمانے کی ناقدری ہے کہ جلال لکھنؤ میں خاک پھانکے اور داغ دکن میں جاکر نظام کا استاد ہوجائے"، میں خاموش رہا اور قبل اس کے کہ میں اپنی گستاخی کی معافی چاہوں انھوں نے کہا تم اب تک

نہیں گئے میری نگاہوں سے دور ہو میں کمرے سے نکل کر کچھ دور پر جا کھڑا ہوا کہ شاید رحم کھا کر پھر مجھے بلائیں لیکن انھوں نے نہ بلایا بلکہ نکل کر انھوں نے مجھے دیکھا اور زور سے جو دروازہ کھلا ہوا تھا اس کو بند کرلیا اور میں بادلِ ناشاد واپس آیا۔

جناب تسلیم وجناب داغ نواب حامد علی خاں صاحب کے مشاعرہ رام پور میں مجھے ایک بار شریک ہونے کا اتفاق ہوا اُس وقت منشی امیراللہ صاحب تسلیم زندہ تھے ختم مشاعرہ کے بعد چونکہ وہ پیرانہ سالی کے سبب سے شریک مشاعرہ نہ ہوئے تھے میں اُن کی خدمت میں پہونچا وہ چارپائی پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹے تھے میں جاکر پاؤں دبانے لگا انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور میرے حالات پوچھنے لگے جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں داغ صاحب کا شاگرد ہوں تو فرمایا تم نے انھیں دیکھا بھی ہے یا خط وکتابت کے ذریعہ سے شاگرد ہوئے ہو میں نے کہا میں بہت دنوں تک اُن کی خدمت میں رہا ہوں یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ ذرا مجھے سہارا دیکر بٹھادو میں نے سہارا دیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے میری اُنگلیوں کو اپنی آنکھوں پر رکھو میں نے اُن کی اُنگلیاں اپنی آنکھوں پر رکھیں دو تین منٹ کے بعد وہ اپنی اُنگلیوں کو میری آنکھوں سے ہٹاکر چومنے لگے اور فرمایا تمھاری ان آنکھوں نے میرے دوست کو دیکھا ہے اس باعث سے میں نے بوسہ لیا اور یہ کہکر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے اس کے بعد میرے چند اشعار سنے اور تعریف فرمائی میں نے وہی التجا جو جلال صاحب کے روبرو پیش کی تھی انکے سامنے بھی پیش کی کہنے لگے میاں نہ سماعت ہے نہ بصارت ہے اتنے ہوش وحواس کہاں کہ میں تمھیں کچھ اشعار سُناؤں تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر فرمایا کہ ایک مطلع یاد آگیا وہی سُنائے دیتا ہوں میں نے اسی کو غنیمت سمجھا وہ مطلع یہ ہے :۔

جب رُکے پائے جنوں پھرنے لگا سر میرا　　　نہ ہوا کم کسی تدبیر سے چکرّ میرا

حضرت داغ کا کلام حضرت داغ کے کلام پر بہت سے تنقیدی مضامین لوگوں نے لکھے کسی نے اُن کی مذمت کی کسی نے اُن کو سراہا یہ اپنی اپنی پسند اور اپنی اپنی رائے ہے طبیعتیں چونکہ مختلف ہوتی ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ جو شعر ایک کو پسند آئے اُسے دوسرا بھی پسند کرے اُن کے زمانۂ حیات میں بہت سے حاسدوں اور رشک کرنے والوں نے مخالفت میں بہت کچھ زہر اُگلا لیکن ویسا شعر اور ویسی غزلیں کوئی کہہ کر دکھا نہ سکا ہمیشہ اُن کے مقابلہ میں مخالفوں کو شرمندگی ہوتی رہی فی الحقیقت ایک وہبی اور ایک کسبی دو طرح کے شاعر ہوتے ہیں وہبی تو وہ ہیں جن کو قدرت نے شاعر پیدا کیا کسبی کا اُن میں شمار ہے جو بزور علمیت وقابلیت کے شاعر ہوئے غور کرنے سے ظاہر ہوگا کہ کس کے کیا مراتب ہیں اور دونوں میں امتیازی فرق کس قدر ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت داغ وہبی شاعر تھے اور اُن کو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا پھر اُن کی نشو ونما لال قلعہ دلی میں ہوئی سلطنت کا عروج و زوال انھوں نے اپنی نگاہوں سے دیکھا غرض اُن کی زبان ہر اعتبار سے ٹکسالی ہے سند میں اُن کے شعر اُنھیں کے بقول ویسی پتھر کی لکیر ہیں جن کا مٹانا آسان نہیں۔

سمجھو پتھّر کی تم لکیر اُسے
جو ہماری زبان سے نکلا

تفصیلی بحث اس موقع پر کرکے میں اس مضمون کو اب طول دینا نہیں چاہتا ان دو تین آخری فقروں پر ختم کرتا ہوں کہ وہ صرف شاعر نہ تھے بلکہ شاعر گر تھے اور اُن کا جس قدر بھی کلام ہے وہ اور شعرا کے لئے ایک درس اور دستور العمل ہے اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے اور اُن کے زندہ شاگردوں کو توفیق عطا کرے کہ وہ استاد کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے رہیں اور اپنے کو ادب جدید سے دور رکھیں۔

شاعر کا انجام جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس کا ایک ایک جملہ حسن وعشق کی تمام نشہ بخش کیفیات سے معمور ہے، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ قیمت بارہ آنے علاوہ محصول۔　　　منیجر نگار

داغ کی شاعری میں لب و لہجہ کی اہمیت

(پروفیسر اختر اورینوی)

داغ غزل گو شاعر ہے۔ یوں تو چند مخمس، قصاید اور رُباعیات بھی اس کے دواوین میں ملتی ہیں، مگر داغ اصلاً غزل کا شاعر ہے۔ وہ اُردو غزل کی بہترین روایات کی نمایندگی نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے انحطاطی دور کی ترجمانی کرتا ہے۔

جب اُردو غزل نگار سنگلاخ زمینوں میں گُل کھلانے کی کوشش کرتے اور عجیب ردیفوں کا سحر باندھتے ہیں تو رسمیت، خارجیت، کھوکھلے پن، سطحیت کا رنگین گورکھ دھندا پیدا ہوجاتا ہے۔ صداقتِ تجربہ، اخلاصِ جذبہ، ندرتِ تخیل، فن کارانہ اختراع اور ہنرمندانہ توازن تعمیر کی بجائے فرسودگی، نقالی، تصنع، پھیکے پن، بے کیفی، رعایتِ لفظی، قافیوں اور ردیفوں کی بازی گری، ترکیبوں کا کرتب اور مضامین کی نظربندی آنکھوں کو خیرہ اور ذوق کو مسموم کرتی ہے۔ صناعت اور الفاظ کی بٹہ بازی کا فرق، تخیل کی پرواز اور مضامین کی دُمدار پتنگ لڑانے کا امتیاز، جذبہ کے سوز اور گرم گفتاری کے پٹاخے چھوڑنے کا اختلاف، رنگین بیانی اور محاوروں کے غُبارے اُڑانے کا فصل، معنی آفرینی اور لچّے دار سخن سازی کا بُعد صاحبانِ ذوق پر ظاہر ہے۔ امیر مینائی کا ایک شعر ہے:-

رُخ سے دلِ پُرداغ مرا زلف میں پہونچا　　گلشن سے گیا اُڑکے ختن میں پرِ طاؤس

اور پھر کفن میں پرِ طاؤس، اور دہن میں پرِ طاؤس۔ اسی طرح اور غزلیں ہیں۔ مثلاً رفتار سبز، دلدار سبز، بازار سبز وغیرہ وغیرہ۔ حضرت داغ کے یہاں بھی اس رنگ کے غبارے بہت اُڑتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

توڑ اس طرح سے اے نالۂ دل ساتوں فلک،　　کہ گریں ٹوٹ کے یہ خانہ خراب ایک پر ایک

اور اسی طرح ایک پر ایک۔

درد سے ہو ہم اسیروں کی خبر کیوں کر اُسے　　صورتِ زنجیر کب کرتے ہیں نالے ہاتھ پاؤں

اس زمین میں بھی داغ نے کیا کیا ہاتھ پاؤں نکالے ہیں، بس دیکھا کیجئے۔

داغ، ذوق (استادِ داغ) اور نصیر دہلوی کی شاعری میں، نیز دبستانِ لکھنؤ کے اکثر شعراء کے یہاں رسمیت اور خارجیت کے مختلف نمونے ملتے ہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اُردو غزل کے سارے سرمایہ میں رسمیت کا خاصہ حصہ پایا جاتا ہے۔ غزل کی یہ صنفی کمزوری ہے۔ دورِ زوال میں یہ کمزوری اور بڑھ جاتی ہے۔ صحت مند روایتیں کم سے کم ہوتی جاتی ہیں اور غزل سُرخ و صالح خون سے محروم ہوکر پیلی پڑجاتی ہے۔ شاعری مضمحل ہوکر قافیہ پیمائی اور ردیف بازی کی صورت اختیار کرلیتی ہے (اُمّ الصبیان) کے مریض بچّے بے ہنگم طور پر لانبے اور بہت دُبلے پتلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح دورِ انحطاط کی غزلیں لانبی مگر سوکھی ساکھی ہوتی ہیں۔ داغ کی اکثر غزلیں بھی اس مرض کی شکار ہیں۔ ہاں اس مریض کو ریشمی لباس ضرور پہنایا گیا ہے۔

داغ کی شاعری واقعیت اور رسمیت کا انمل بے جوڑ آمیزہ ہے۔ لیکن اپنی خامیوں کے باوجود یہ اپنے اندر کچھ زندہ عناصر ضرور رکھتی ہے اور اسی حصّہ سے اُس کی انفرادیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ داغ کی انفرادیت کئی اداؤں پر منحصر ہے۔ لیکن اُس کے لب و لہجہ کی

بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ داغ کی شاعری کا لب و لہجہ اس کی انفرادیت کے مزاج کے تعین میں غالب حصہ لیتا ہے۔
شاعری میں اور عناصرِ حسن کے ساتھ لب و لہجہ کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ صرف الفاظ اور ترکیب الفاظ سے ہی معنی پیدا نہیں ہوتے بلکہ لب و لہجہ سے بھی اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ مطالب کے نئے پہلو نکلتے ہیں اور معنی کی وسعتیں بڑھتی ہیں۔ داغ کے یہاں لب و لہجہ کا برتاؤ اکثر و بیشتر نہایت فن کارانہ ہوتا ہے، لہذا پُر تاثیر اور اس میں اتنی بلوغت، بالیدگی، استواری اور اختصاص پایا جاتا ہے کہ داغ کی آواز منفرد طور پر پہچانی جاسکتی ہے۔ داغ کے لب و لہجہ میں بڑی انفرادیت پائی جاتی ہے۔
شاعری میں لب و لہجہ کئی چیزوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ لب و لہجہ پر شاعر کی شخصیت کی گونج اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے زندگی کرنے کا انداز (Attitude) اثر ڈالتا ہے۔ اخلاصِ تجربہ اور کمال زباندانی دونوں مل کر جاندار و پختہ لب و لہجہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہم لب و لہجہ کا مزید تجزیہ کریں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ لب و لہجہ منحصر ہے اندازِ بیان، عشوۂ اظہار اور طرزِ ادا پر، لفظوں کے رکھ رکھاؤ، فقروں کے موڑ اور کن پر جملوں کے تیور، کلام کی روانی اور آہنگ پر، اور زبان کی آنچ پر۔ داغ کے لب و لہجہ میں بھی یہ سب عناصر ترکیبی پائے جاتے ہیں۔
غالب کا ایک شعر ہے :۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے،

داغ کہتا ہے :۔

وہ عیادت کو مرے آتے ہیں لو اور سُنو،　　آج ہی خوبیِ تقدیر سے حال اچھا ہے

غالب کے بعد اُسی مضمون میں پُر اثر شعر کہنا آسان تو نہیں تھا۔ مگر داغ نے اپنے لب و لہجہ کے سہارے ایک پُر کیف شعر نکال ہی لیا۔ 'لو اور سُنو' کا فقرہ اور 'خوبیِ تقدیر' کی طنزیہ ترکیب نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ "ہی" کا لفظ بھی کتنا منجھا ہوا ہے!
آیئے اب داغ کے لب و لہجہ کا تجزیہ کریں اور اس کے کلام سے مثالیں لیں۔
داغ کی شخصیت میں بڑا مردانہ پن تھا۔ اُس کی آواز ایک مرد کی آواز ہے۔ اُس کی غزلوں کے لب و لہجہ میں جارحانہ انداز نمایاں ہے۔ رسمی شاعری کے حصہ کو اگر الگ کردیا جائے تو پھر ہم معاملات محبت میں داغ کے یہاں 'اقدامیت' پائیں گے۔ بلکہ ذرہ سختی اور کھُردرے پن بھی :۔

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں،　　آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا،

یہ عورت کے عشوۂ گریز کے مقابل مردانہ ردِ عمل ہے۔ مگر مُنعکس، مقصد، گُربہ کُشتن روزِ اول۔ یہ سرزنش محبت ہے۔ داغ معاملاتِ عشق میں کسی قسم کی رقت پسندی، حماقت یا مہملات کو برداشت کرنا نہیں چاہتا۔ عشق کو طربناک بنانے کا یہ بہت بڑا گُر ہے۔ داغ کی شاعری مادّی شاعری ہے اور اسی کی محبت کی بنیادیں واضح طور پر جنسی ہیں۔ نیز ارتفاعِ محبت کے عالم میں بھی وہ جنسی لذتوں سے دور نہیں جاتا۔ اُس کے یہاں کسی قسم کی ماورائیت نہیں۔ قافیہ کے استعمال میں کچھ ایسے مضمون بندھ گئے تو اور بات ہے۔ داغ کا ایک شعر ہے :۔

کہاں کہاں دلِ مشتاق دید نے یہ کہا　　وہ چمکی برقِ تجلّی، وہ کوہِ طور آیا

یہ نہایت ہی اچھا شعر ہے، جس میں جذبی کیف و حال کے ساتھ، فکری گہرائی اور محاکاتی نور و رنگ بھی موجود ہیں۔ لیکن داغ کے دلِ مشتاق دید کے لئے برق تجلّی کیا ہے اور کوہِ طور کہاں یہ کوئی راز و رمز کی بات نہیں۔ 'طور' کی علامت کو ریاض خیر آبادی نے کچھ اس طرح استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

رہ کے طور، تو ہم جائیں عرش سے اونچے　　ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا !

اور ؎ ہم اُڑ کر بھی نہ پہونچیں، ہم سے اتنی دور ہو جانا مبارک شاخِ گل کو شاخِ نخلِ طور ہو جانا

اور پھر ؎ تمہارے کوچے میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں ذرا تم آ کے لبِ بام مسکرا دینا

ریاض نے کوچۂ حبیب کو طور سے بڑھا دیا ہے۔ یوں تو اس شعر کے معانی میں بڑی وسعت اور گنجایش ہے۔ داغ کا "کوہ طور" اور "برق تجلی" بھی کوچۂ حبیب میں ہے۔ ویسے داغ کے شعر کو داغ کی شخصیت سے الگ کر کے معرفت و روحانیت کا شعر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اور بہر حال وہ بہت ہی پُر کیف اور اثر خیز شعر ہے۔ وسیع المعانی اور نفسیاتِ تمنّا کو پیش کرنے والا۔ داغ کی رجائیت و پُر امید ذہنیت کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے۔ آپ اسے فریبِ تمنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر بقول جمیل مظہری ؎

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

داغ کا اپنا تجربۂ محبت ارضی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا دیکھئے وہ کیا کریں، ہم کیا کریں

لب و لہجہ میں صاف مردانہ پن اور اعتماد ہے۔ معرکہ آرائی ہے، سپردگی و ربودگی نہیں۔ غالب کا انداز خاص تو تُرکانہ ہے مگر مندرجۂ ذیل شعر کو داغ کے شعر سے ملائیے:-

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

داغ کہتا ہے ؎

نہیں ہوتی بندے سے طاقت زیادہ بس اَب خانہ آباد دولت زیادہ

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

یہ ہے داغ کا پندارِ عشق جس کے ڈانڈے غالب کی خود بینی سے جا ملتے ہیں۔ ؏

اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دوسرے شعر میں "یہ کیا کہا" کا تیکھا تیور دیکھئے۔ مرنے میں بھی ٹھسّہ ہے۔ چند اشعار معاملاتِ عشق کے ملاحظہ ہوں:-

نہ دلاسا، نہ تسلّی، نہ تشفّی، نہ وفا، دوستی اُس بُتِ بدخو سے نباہیں کیونکر

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو وہ طریقہ تو بتا دو تمھیں چاہیں کیونکر

شرم سے آنکھ ملاتے نہیں دیکھا اُن کو پار ہوتی ہیں کلیجے کے نگاہیں کیونکر

بگڑ بیٹھے عبث ذکرِ عدو پر سُنا کیا آپ نے، مَیں نے کہا کیا

داغ بات بنانی بھی جانتا ہے اور محبوب کو منانے کا نیا ڈھنگ بھی اُسے آتا ہے ؎

رنگِ دشمن بھی گوارا لیکن تجھکو مضطر نہیں دیکھا جاتا

داغ کی غزل کے لب و لہجہ میں جوش، تازگی، چہک اور لہک پائی جاتی ہے۔ اس کی خوش گفتاری میں ظرافت کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ مزاح، طنز، طعنہ، چٹکی، گدگدی، پھبتی کے رنگ۔ داغ کے یہاں عشق بازی کی رنگینی، مستی اور انبساط ہے اُس کی رندانہ شوخی کا ترنگ مزہ دار ہوتا ہے۔ داغ کی زبان دانی اُس کے لب و لہجہ میں تنوع اور پختگی پیدا کرتی ہے۔ وہ بڑی نفاست سے بیان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ محاوروں کا استعمال بڑے سلیقہ اور قرینہ کا ہوتا ہے۔ وہ بڑا فقرہ باز اور شیوہ بیان ہے۔ اس کے کلام میں چٹخارہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ؏

بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

اسی طرح داغ کے لب و لہجہ میں انگنت نیرنگی پائی جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ:-

بھردیں عجب ادائیں اُس شوخ سیم تن میں   اِک ٹیڑھ سادگی میں، اک سیدھ بانکپن میں
مطلب کی چھیڑ اُن سے پنہاں سخن سخن میں   سچ یہ کہ داغ پُرفن یکتا ہے اپنے فن میں

داغ کے طرزِ ادا میں، اس کے لب و لہجہ میں شوخ سیم تن کی اداؤں کی طرح ٹیڑھ اور سیدھ دونوں ہیں۔

اِک ٹیڑھ سادگی میں، اِک سیدھ بانکپن میں

داغ پر دوسرا شعر بھی پورے طور پر صادق آتا ہے۔ اس کے سخن سخن میں چھیڑ ہے اور وہ بہت ہی بڑا پُرفن ہے۔

سچ یہ کہ داغ پُرفن یکتا ہے اپنے فن میں !

داغ تکرار الفاظ سے کیفیت پیدا کرتا اور سماں باندھ دیتا ہے۔ ذرا لب و لہجہ ملاحظہ فرمائیے ؎

ترے ظلم پنہاں ابھی کون جانے   فقط آسماں آسماں ہو رہا ہے

دوسرا مصرع پوری فضا کی تعمیر کرتا ہے اور صرف لب و لہجہ کے سہارے۔

آیئے اب ہم داغ کے فن کے چند نمونے پیش کریں اور جابجا اس کی فن کاری کا ناقدانہ جائزہ لیتے چلیں۔

خیر گزری کہ رہا تا بہ مژہ سیل سرشک   رہ گیا پردہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصحِ مشفق   دیکھا ہے کہ اُس ماہ لقا کو نہیں دیکھا
آج راہی جہاں سے داغ ہوا   خانۂ عشق بے چراغ ہوا
دل لیکے اُس کی بزم میں جایا نہ جائے گا   یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا،
اِک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے   اتنی سی بات کہنے گنہگار ہو گیا،
سو حسرتیں تو آئیں گیا اِک دل گیا   ملنا تھا جو مجھے مری قسمت کا مل گیا

دوسرے شعر میں 'دیکھا' کی تکرار اور مقابلہ کی ٹکر کا لطف اُٹھایئے۔ اسی طرح آخری شعر میں 'گیا' کی تکرار اور ٹکراؤ کا مزہ لیجئے۔ تیور اور لب و لہجہ کی تیزی اور شوخی ہر جگہ موجود ہے۔ 'جایا نہ جائے گا' کے ٹکڑے کی داخلی و خارجی تصویر کشی ملاحظہ ہو۔ پانچویں شعر میں محاورہ اور زبان دانی کی لہک دیکھئے۔ آگے چلئے:-

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب   ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا
ہوئی تھیں دیدۂ مشتاق سے گستاخیاں کیا کیا   بھلے کو رُخ نہ تھا میری طرف اُن کے نگہباں کا
کیا ہے وعدۂ فردا انھوں نے دیکھئے کیا ہو   یہاں صبر و تحمل آج ہی سے ہو نہیں سکتا
ضبط کر دردِ عشق کو اے دل، ؎   اس تری آہ آہ نے مارا
تلوار بے تکان اُٹھاؤ نہ ہاتھ میں   خلقت کہے گی نازو نزاکت کو کیا ہوا
ہم اب سے لیں گے بوسۂ گل تیرے سامنے   کیا ایسا لعل ہے ترے لب میں لگا ہوا

محاورے کے برتنے پر ذرا معشوق سے سخن سخن میں چھیڑ دیکھئے۔ اور 'اس تری آہ آہ نے مارا' کے درد انگیز تیور کو محسوس کیجئے۔ اب نفسیات محبت ملاحظہ ہو ؎

یہ دل کو تاب کہاں ہے کہ ہو مآل اندیش   اُنھوں نے وعدہ کیا اس نے اعتبار کیا

کیسا بے ساختہ پن ہے !

یہ پوری غزل مرصع ہے:-

غضب کیا ترے وعدے پر اعتبار کیا   تمام رات قیامت کا انتظار کیا

ہنسا ہنسا کے شبِ وصل اشکبار کیا — تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا
ملی جو یار کی شوخی سے اس کی بے چینی — تمام رات دلِ مضطرب کو پیار کیا
بُھلا بُھلا کے جتایا ہے اُن کو رازِ نہاں — چُھپا چُھپا کے محبت کو آشکار کیا
ہم ایسے محوِ نظارہ نہ تھے ہوش آتا — مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا
ہمارے سینہ میں کچھ رہ گئی تھی آتشِ ہجر — شبِ وصال بھی اُس کو نہ ہمکنار کیا

آخری شعر میں کتنا نادر مگر سچا تجربہ ہے۔ محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ داغ عشق میں صاحبِ تجربہ شاعر ہے:۔

تری نگہ کے تصور میں ہم نے اے قاتل — لگا لگا کے گلے سے چھری کو پیار کیا

'لگا لگا کے گلے سے' کے فقرہ کی بے چینی کو محسوس کیجئے۔ اس شعر میں واقعیت کی کیسی عمدہ تصویر کشی ہے۔ متحرک، محاکاتی اور گویا۔ شعر کے لب و لہجہ سے وہ کام ہوتا ہے جو نہ مصوری سے ہوسکتا ہے نہ فلم بندی سے۔ داخلی کیفیات و واردات کی مصوری مکمل طور پر صرف شاعری کے واسطۂ اظہار سے ممکن ہے ؎

فسانۂ شبِ غم اُن کو اِک کہانی تھی، — کچھ اعتبار کیا، کچھ نہ اعتبار کیا

اس شعر میں صنعت تقابل (تضاد یا طباق) بڑی کامیابی سے برتی گئی ہے۔ ایک ہی مصور کے دو فعل ہیں ایک مثبت ایک منفی۔ داغ صنائع لفظی و معنوی کا استعمال عموماً کامیابی کے ساتھ کرتا ہے۔ مثلاً صنعتِ تکرارِ لفظی، صنعتِ بازگشت، (رد العجز علی الصدر) صنعتِ تبدیل، صنعت مرعات النظیر، صنعتِ طباق، تجاہلِ عارفانہ، لف و نشر وغیرہ کا۔

تری اُلفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا — اِدھر چمکی، اُدھر سُلگی، یہاں پھونکا، وہاں پھونکا
بجھے کب عندلیبِ سوختہ دل کی لگی تجھ سے — چراغِ گل کو کیا پھونکا جو اے بادِ خزاں پھونکا
کہاں صیاد، کیسا باغباں، کس پر گری بجلی — چمن میں آتشِ گل نے ہمارا آشیاں پھونکا
ہمارے دل کے ہوتے طورِ سینا کو جلانا تھا — تری برقِ تجلی نے کسے پھونکا، کہاں پھونکا

داغ کی شاعری کا داخلی رنگ کہیں کہیں پر خوب چمکتا ہے۔ لیکن یہ اُنکا اپنا رنگ نہیں۔ تاہم داغ ہر جگہ اپنے لب و لہجہ سے پہچانا جاتا ہے اور اس کا لب و لہجہ بہت ہی گویا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

'کہاں صیاد، کیسا باغباں، کس پر گری بجلی' اور 'کسے پھونکا، کہاں پھونکا'، کا پُر تاثیر لب و لہجہ ایک داستان سنا دیتا ہے۔ ایک اور غزل کے چند اشعار سنئے:۔

نگاہِ شوق پر الزام بے قراری کا — تمہارے برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف — ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا
کہا اُنھوں نے شبِ غم کا ماجرا سُن کر، — ترے مزاج کی شوخی تھی اضطراب نہ تھا

اور اب چند متفرق اشعار:۔

کیونکر اُس کی نگہِ ناز سے جینا ہو گا — زہر دے اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا'

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا — کیا کلیجا ہے تماشائی کا

کوئی بھولا ہوا اندازِ ستم یاد آیا — کہ تبسم تجھے ظالم دمِ بیداد آیا'

کہا ظالم نے میرا حال سُن کر — وہ اس جینے سے مرجائے تو اچھا
مُبارک خضر کو ہو عمرِ جاوید' — یہ تھوڑی سی گزر جائے تو اچھا

تم تو سو بار مان جاؤ گے، — دل ہمارا بہل نہیں سکتا،

دمِ رخصت یہ چھیڑ تو دیکھو، — مجھ سے کہتے ہیں کب ملیں گے آپ

کٹ گئے لاکھوں گلے اس تیزیِ رفتار سے — اب تو چل نکلے زیادہ اپنے بھی خنجر سے آپ

حضرتِ زاہد نکل آیا فلک پر آفتاب، — پیرو مرشد اب تو اُٹھئے میکدہ کے در سے آپ

کچھ تذکرۂ عشق رہے حضرتِ ناصح، — کانوں کو مزہ دیتی ہے گفتارِ محبت

کتنا ملیح مذاق ہے ۔ ناصح کے دل کا چور داغ نے پکڑ لیا ہے ۔ ناصح کی تلملاہٹ کا تصور فرمائیے ۔ ایک نفسیاتی نکتہ بیان ہوا ہے :-

ہجرِ بُت اور صحبتِ زاہد، — خُلد میں بھی تو ہیں عذاب بہت

دیکھنا پیرِ مغاں حضرتِ زاہد تو نہیں — کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھکو،

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ، — ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

اب آپ داغ کو میخانہ کی طرف لے جایئے یا مسجد کی طرف ۔ شعر کا ابہام اور تیور بڑا پُرلطف ہے ۔ اب ذرہ دوسرا رنگ دیکھئے :-

برسوں سے لگ رہی تھی لبِ بام ٹکٹکی، — تھک تھک کے گر پڑی نگہِ انتظار آج

ہمارے جذبِ محبت کو دیکھنا قاتل، — کہ رہ گیا ترا خنجر رگِ گلو ہو کر،

تھی نہ تابِ ستم تو حضرتِ دل، — عاشقی کو سلام کرنا تھا

جھکی ذرا چشمِ جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی — بڑا مزا اُس ملاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

نگہ کو بیباکیاں سکھاؤ حجابِ شرم و حیا اُٹھاؤ — بھلا کے مارا تو خاک مارا لگاؤ چوٹیں جتا جتا کر

فتنہ پرداز، دغا باز، فسوں گر، عیّار — ہائے افسوس دل آیا بھی تو آیا کس پر

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں، — ناز والے نیاز کیا جانیں

شمع رو آپ گو ہوئے لیکن — لطفِ سوز و گداز کیا جانیں

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے — آپ بندہ نواز کیا جانیں

ذرا 'بندہ نواز' کے ٹکڑے کی نشتر سامانی ملاحظہ ہو :-

ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاجِ بہار — پہلے ہی چاک گریباں کئے بیٹھے ہیں

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں — مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں،

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں — اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد — کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

اُلجھنا زلف سے لڑنا نگہ سے — بنے ہیں حضرتِ دل بھی بلا کے،

لگ چلی بادِ صبا کیا کسی مستانے سے — جھومتی آج چلی آتی ہے میخانے سے

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے — مے اُڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

کتنے پُرکیف اشعار ہیں ! لب و لہجہ جذبی تجربہ کے ساتھ گھل مل کر کس قدر پر تاثیر ہو گیا ہے !

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں، اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے،

کیا ادائے خاص ہے!

ترے وعدے کو بُتِ حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے کبھی شام ہے کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے، کبھی شام ہے

غرض جہان سے کیا اے فلک بُرے ہوتے غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لئے،

ملے تو حشر میں لے لوں زبانِ ناصح کی عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لئے

جب کوئی فتنہ زمانہ میں نیا اُٹھتا ہے وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

کیا کہئے کس طرح سے جوانی گزر گئی بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور کیا چیز حرام ہو گئی ہے!

دوسرے مصرع میں لب و لہجہ کا سحر دیکھئے:۔

اللہ اللہ رے تری شوخ بیانی اے داغ!

کچھ آہ کے حوصلے نکلتے نیچا مگر آسماں بہت ہے!

کس قیامت کا شعر ہے! سادگی اور پُرکار تخیل!

کچھ تازگی ہو لذتِ آزار کے لئے ہر دم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے

بنے ہو بزم میں ساقی تو یہ خیال رہے کسے سرور نہ آیا کسے سرور آیا

غمزہ بھی ہو سفاک نگاہیں بھی ہوں خوں ریز تلوار کے باندھے سے تو قاتل نہیں ہوتا

دلِ پُر اضطراب نے مارا اسی خانہ خراب نے مارا

ملتا نہیں ہم کو دلِ گم گشتہ ہمارا تو نے تو کہیں اے غمِ جاناں نہیں دیکھا

کیسا بھولا پن ہے مگر ہوشیار! تجاہلِ عارفانہ کی لطافت اثر خیز ہے۔ خدا بھلا کرے، آزار دینے والوں کا!

لوگ کہتے تھے چُپ لگی ہے تجھے حالِ دل بھی سُنا کے دیکھ لیا

جاؤ بھی کیا کرو گے مہر و وفا بارہا آزما کے دیکھ لیا

'جاؤ بھی' کے ٹکڑے کا کَن دیکھئے۔ کتنا تیز ہے!

عالمِ یاس میں گھبرائے نہ انسان بہت، دل سلامت ہے تو حسرت بہت ارمان بہت

ایک معنویت کا شعر ملاحظہ ہو۔ نفسیاتِ محبت کا ماہر شاعر کہتا ہے:۔

کھٹکا ہوا ہوں خارِ تمنا سے اس قدر ڈرتا ہوں یاس سے بھی کہیں آرزو نہ ہو

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھ کو دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھ کو

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

بیٹھے اُداس، اُٹھے پریشاں، خفا چلے پوچھے تو کوئی آپ سے کیا آئے کیا چلے

وہ دیتے ہیں تسلی اور پھر تسکین نہیں ہوتی کبھی بے چین یہ کافر طبیعت ایسی ہوتی ہے

ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

داغ اِک آدمی ہے گرما گرم　　خوش بہت ہوں گے جب ملیں گے آپ

داغ واقعی گرماگرم آدمی تھا اور اُس کا گرماگرم لب و لہجہ نہایت خوش کُن ہوتا ہے۔ جب یہ آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہوگیا تو اقبالؔ نے کہا:-

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخیِ طرزِ بیاں!
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں!

اور ع

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

داغ کے لب و لہجہ کا بانکپن اور شوخی مسلّم۔ اُس کے تجرباتِ محبّت کی واقعیت بھی تسلیم۔ اس کے جذبات کی گرماگرمی اور جوشِ اظہار کی ناوک فگنی قبول۔ لیکن نری واقعیت سے کیا ہوتا ہے اگر اُس میں شعریت پیدا کرنے والے دوسرے عناصر موجود نہ ہوں۔ صرف جذبہ کے جوش سے بھی کچھ نہیں بنتا اور خالی خولی لب و لہجہ سے بھی اثر پیدا نہیں ہوتا۔ داغ کہتا ہے:-

غمزہ بھی ہو سفاک، نگاہیں بھی ہوں خوں ریز
تلوار کے باندھے سے تو قاتل نہیں ہوتا!

شاعری بھی ایک طرح داری اور محبوبی ہے۔ صرف خارجی بُرش سے قتالگی پیدا نہیں ہوتی۔ شاعری میں غمزہ اور نگاہ کی ہاتری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خارجی اور داخلی محاسن کے امتزاج سے شاعری اثرخیز ہوجاتی ہے۔ داغ کا لب و لہجہ پختہ تو ہے مگر ہمیشہ جاندار نہیں۔ اس کے یہاں رسمیّت بہت ہے۔ عام طور پر داغ کی شاعری میں تخیل اور درد و سوز کی کمی ہے۔ امیر مینائی کے یہاں نسبتاً تخیل کی پرواز اور درمندی زیادہ ہے۔ داغ کی شاعری میں جذبہ، جوش اور تیور نمایاں ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ داغ کی شاعری میں جذبہ، جوش اور تیور نمایاں ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ داغ کی شاعری میں لب و لہجہ ہی سب کچھ ہے مگر بہت کچھ ضرور ہے۔ آمیر مینائی کی شاعری میں رسمیّت اور سپاٹ پن داغ کی شاعری سے زیادہ ہی ہے اور اس کے لب و لہجہ میں نہ ویسی پختگی ہے نہ کاٹ۔ اس مضمون میں داغ اور امیر کا مقابلہ و موازنہ مقصود نہیں۔ غرض یہ ہے کہ داغ کی شاعری میں لب و لہجہ کی اہمیت اور اس کی انفرادیت ظاہر ہوجائے۔ داغ کی ایک مخصوص فنکاری ہے۔ جس کی منفرد اور منجھی ہوئی ٹکنیک بھی ہے۔ اس کے رنگ کے کامیاب و پُراثر اشعار میں نے اوپر پیش کردئے ہیں۔ داغ اپنے محدود اُفق میں اور متعین سطح پر کامیاب فن کار ہے۔ ع

سچ یہ کہ داغ پُرفن یکتا ہے اپنے فن میں!

مکتوبات نیاز

(تین حصّوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالبؔ بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔

قیمت فی حصہ چار روپیہ، حصۂ سوم میں رنگین گردپوش بھی ہے اور حضرت نیاز کی تصویر بھی۔　　منیجر نگار لکھنؤ

رامپور اور داغ

(محمد علی خاں اثر رامپوری)

اس سے پہلے کہ مرزا داغ کے متعلق کچھ لکھا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مدت قیام رامپور پر سب سے پہلے روشنی ڈالی جائے۔ تذکرۂ خمخانۂ جاوید داغ کا قیام رامپور میں کم و بیش چالیس سال ظاہر کرتا ہے اور احسن مارہروی جلوۂ داغ میں ۴۰-۴۵ برس مدت قیام ظاہر کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں داغ کا مولوی غیاث الدین صاحب رامپوری سے رامپور میں فارسی کی تعلیم کا حاصل کرنا بھی دونوں نے تحریر کیا ہے اور اس کے ہمنوا محمد نثار علی شہرت مصنف آئینۂ داغ بھی ہیں۔ خمخانۂ جاوید نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ جب داغ مولوی غیاث الدین (۱۲۶۸ھ) سے فارسی کی تعلیم حاصل کرکے قلعہ میں مستقل طور پر آئے تو مولوی سید احمد حسین شکیبا تخلص شاگرد میر تقی میر ان کے معلم ہوئے۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں ذوق کے شاگرد ہوئے اور جب نواب سید یوسف علی خاں ناظم تخلص مرزا ولی عہد کے مصاحب تھے تو بچپن میں مرزا داغ اور نواب سید کلب علی خاں کا عرصے تک ساتھ رہا۔

لیکن میری تحقیقات سے نہ مندرجۂ بالا مدت قیام صحیح ہے نہ مولوی غیاث الدین سے رامپور میں داغ کا فارسی پڑھنا ثابت اور نہ نواب یوسف علی خاں کی مصاحبت ولی عہد ثابت۔

اب آپ نواب عبداللہ خاں صاحب مرحوم برادر نواب سید محمد سعید خاں بہادر کی بیان کی ہوئی خاندانی روایات ملاحظہ فرمائیں جو درجۂ استناد رکھتی ہیں اور یہ صاحبزادہ محمود علی خاں صاحب، نواب عبداللہ خاں صاحب کے پرپوتے سے مجھ تک پہونچی ہیں۔

نواب سید غلام محمد خاں بہادر دوجوڑا کی مشہور جنگ میں جن کے مقابل انگریزی اور آصف الدولہ کی فوجیں تھیں، مصالحت کرکے ۱۷۹۴ء میں پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ گئے اور وہاں سے ذریعہ جہاز بغرض حج حجاز پہونچے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد براہ کابل و کشمیر نادون کے راجہ کے مہمان ہوگئے جس نے انتہائی اخلاص و مدارات کا برتاؤ کیا۔ آخر ان کا انتقال وہیں ۱۲۳۰ھ میں بعمر ۶۳ سال ہوگیا۔ "رضواں مقام" مادہ تاریخ ہے۔

نواب غلام محمد خاں جب حج کو جانے لگے تو اپنے چھ بیٹوں کو جن کے رئیس خاندان نواب محمد سعید خاں تھے پانچ پانچ لاکھ روپے نقد اپنے خزانہ سے جو ان کے ساتھ بزمانۂ جنگ تھا دے گئے تھے۔ اور تحت شرائط معاہدہ اپنے بیٹوں کے گزارے کے لئے دو سو پچاس روپے ماہانہ فی کس وظیفہ ریاست سے جاری کرا گئے تھے۔ نواب غلام محمد خاں کے بعد انگریزوں نے نواب احمد علی خاں کو جن کی عمر ۹ برس کی تھی فرمانروا بنادیا تھا اور تا بلوغ نواب نصراللہ خاں کو ریاست کے کل نظم و نسق کا مختار بنادیا تھا۔ چنانچہ کل بھائی بنارس ہوتے ہوئے دلی کے محلہ روشن پورے میں مقیم ہوگئے۔ نواب محمد سعید خاں کی عمر اسوقت ۱۸ سال کی تھی۔ نواب یوسف علی خاں ۵ مارچ ۱۸۱۶ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی سے شروع ہوا۔ بعد میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے میں داخل ہوگئے۔ نواب کلب علی خاں ۱۰ اپریل ۱۸۳۵ء کو دلی کے محلہ روشن پورے میں پیدا ہوئے۔ داغ کی ولادت

۱۸۳۱ء میں ہوئی۔ اس طرح داغ نواب خلد آشیاں سے چار برس بڑے تھے۔

جب نقد سرمایہ ختم ہوچکا تو نواب محمد سعید خاں، نصیر الدین حیدر شاہ اودھ سے ملے۔ اور ان کے ایک کار خاص کے سلسلہ میں انھیں کلکتہ جانا پڑا۔ جب وائسرائے سے ملاقات ہوئی تو موقع پاکر انھوں نے اپنی زبوں حالی کا بھی ذکر کردیا۔ وائسرائے نے جواب دیا کہ اگر تم ملازمت کرنا چاہو تو تمہارا تقرر ڈپٹی کلکٹری پر کیا جاسکتا ہے۔ وہ رضامند ہوگئے اور بحیثیت ڈپٹی کلکٹر بدایوں میں تعینات کئے گئے۔ نواب عبداللہ خاں عرصے تک مین پوری اور میرٹھ میں بحیثیت صدر الصدور ملازم رہے۔

جب نواب احمد علی خاں والی رامپور کا انتقال ۲۶ر جولائی ۱۸۴۰ء کو ہوا تو نواب محمد سعید خاں ۲۰ر اگست ۱۸۴۰ء کو مسند نشین ریاست ہوئے۔ اس لئے کہ نواب احمد علی خاں کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ جب نواب محمد سعید خاں نے ریاست کے انتظامات پر قابو پا لیا تو کچھ مدت کے بعد اپنے اہل و عیال کو دلی سے رامپور بلا لیا اور مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی کو طلب کرکے محکمۂ نظامت اور اس کے بعد مرافعۂ عدالتین پر مامور کیا۔

چونکہ نواب محمد سعید خاں کے خاندان کے لوگ مرزا رحیم الدین حیا دہلوی کے مکانات میں بھی مقیم تھے اس لئے مرزا حیا سے بھی تعلقات ہوگئے۔ اُدھر نوابان لوہارو سے تعلقات کے باعث نواب شمس الدین احمد خاں پدر مرزا داغ سے بھی تعلقات رہے۔ رہا نواب یوسف علی خاں کی مصاحبت کا مسئلہ تو وہ مصاحبت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ نواب یوسف علی خاں کی مرزا ولی عہد سے بھی بزمانہ قیام دہلی وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ہو۔ جس کو بعض تذکروں نے مصاحب کے لقب سے یاد کیا۔

تذکروں سے یہ ثابت ہے کہ داغ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۶-۷ برس کی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ قلعہ میں آئے وہیں تعلیم پائی۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہوا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی قلعے سے نکلے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ غدر کا ہنگامہ فرو ہونے پر داغ مع خاندان رامپور آئے اور نواب یوسف علی خاں کے زیر سایۂ عاطفت رہے۔

رہا مولوی غیاث الدین سے تعلیم کا وہ مسئلہ تو ظاہر ہے کہ ۱۸۴۰ء سے پہلے داغ کے رامپور آنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا البتہ نواب یوسف علی خاں کے ۱۸۵۵ء میں تخت نشین ہونے پر مرزا رحیم الدین حیا بوجہ تعلقات دہلی رامپور میں ۱۸۵۵ء ہی میں مقیم ہوگئے تھے۔

داغ کی آمد رامپور کے سلسلہ میں محمد نثار علی شہرت لکھتے ہیں کہ جب قلعہ خالی ہوا اور بادشاہ رنگون بھیجے گئے تو داغ حکیم سعادت علی خاں جنرل افواج رامپور کے بیٹے حکیم ولایت علی خاں کے پاس آنولے گئے اور ان سے سفارشی چھٹی لے کر رامپور آئے اور وہیں مقیم ہوگئے۔

لیکن میری رائے میں داغ کی آمد رامپور کے سلسلہ میں زیادہ مستند روایت یہ ہے کہ عمدہ خانم، داغ کی خالہ نے نواب یوسف علی خاں صاحب کو داغ کی پرورش کے سلسلہ میں سفارشی خط بھیجا تھا۔ نواب یوسف علی خانصاحب عمدہ خانم کو ایک سو روپے ماہانہ بطور وظیفہ بھیجا کرتے تھے۔ جو تا حیات جاری رہا۔ اس طرح داغ کی آمد و رفت کا سلسلہ رامپور میں جاری ہوا۔ داغ کے خطوط سے جن میں دو خط ۱۸۶۱ء میں نواب یوسف علی خاں کو بھیجے گئے ہیں۔ اور ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کو تین خط ملازمت سے قبل بھیجے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ تعلقات مستحکم ہوگئے تھے اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوچکا تھا۔

جناب داغ کا قیام رامپور میں مستقل نہیں رہا۔ تقاریب کے مواقع پر عارضی قیام کا سلسلہ بیشک جاری رہا۔ مستقل قیام بزمانہ ملازمت یوم تقرر ۱۴ر اپریل ۱۸۶۶ء سے ہوا جو خلد آشیاں کی وفات ۱۸۸۷ء تک جاری رہا۔ جس کو ۱۲ سال ہوتے ہیں

اگر ۱۸۵۷ء سے جون ۱۸۵۸ء تک غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کی مدت کا لحاظ کیا جائے تو ایک سال ۲ ماہ مزید ہوتے ہیں۔ اور نواب یوسف علی خاں کی وفات اور نواب خلد آشیاں کی تخت نشینی کے سلسلہ میں نیز تقاریب کے مواقع پر جس قدر قیام رہا ہو اسکی مدت بھی زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سال ہو سکتی ہے اس لئے کل مدت قیام رامپور زیادہ سے زیادہ تقریباً ۲۳ یا ۲۴ سال ہوتی ہے نہ کہ ۴۰ اور ۴۵ سال۔۔ احسن مارہروی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا داغ نے ۲۴ سال مصاحبت کے ساتھ اصطبل و فراش خانے کی خدمات انجام دیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اصطبل وغیرہ ان کے سپرد ۱۸۶۶ء میں وقت تقرر ہوئے تھے اس لئے ان خدمات کی مدت ۲۱ سال ہوتی ہے نہ کہ ۲۴ سال۔

جب ۱۸۶۳ء میں نواب یوسف علی خاں صاحب والی رامپور کو گورنر جنرل کشور ہند کی کونسل واضع قانون کا ممبر بنایا گیا تو ان کی اور ان کے ولی عہد نواب کلب علی خاں صاحب کی کلکتہ سے واپسی پر داغ نے رامپور آکر خود قطعۂ تہنیت پیش کیا۔ جس کے چند شعر یہ ہیں:۔

کیا ولی عہد اور نواب آئے آج　　برج صد حشمت کے دو کوکب یہ آئے
دو مسیحا آئے بہر درد ہجر　　خاطر طالب کے دو مطلب یہ آئے
دو قمر اک بار آئے ہیں نظر　　تھا زبانوں پہ یہی، جس شب یہ آئے
گوش بر آواز لب پر یہ دعا　　مجھ کو سنوا دے کہیں یارب یہ آئے
بہر استقبال میں پہونچا مگر　　کون جانے کون آئے کب یہ آئے
داغ نے بھی پیشکش تاریخ کی　　شان و شوکت جاہ و اقبال اب یہ آئے

۱۲　۸۰

نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کی تخت نشینی کے جشن میں جو ۱۰ر جون ۱۸۶۵ء کو ہوا تھا۔ مرزا داغ نے ۱۱ شعر کا ایک تاریخی قطعہ لکھا ہے جس کے ہر مصرع کے عدد (۱۲۸۲) ہوتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

بھر کر شراب صاف پلا آج جام میں　　ساقی ہے انجمن کی زباں پر ترانہ آج
پریوں کا جمگھٹ اور حسینوں کا جلسہ ہے　　کیا ایک رنگ پر ہے یہ جشن شہانہ آج
فانوس، جھاڑ، آئینے، تصویر لمپ بھی　　چمکا ہے بزم جشن سے دیوانخانہ آج
سارا ہے جلوہ کلب علی خاں کے دم سے آج　　عہد سرور آج ہے جشن شہانہ آج
یہ سروری کہ داد و دہش اس قدر کہ بس　　کیا کیا دیا ہے دولت و مال و خزانہ آج
پیدا کہاں ہے لعل خوش آب آج کوہ میں　　یکتا رہا صدف میں نہ گوہر کا دانہ آج
پیہم ہے سجدہ ریز نہاں فرق فرقداں　　کیا کیا ہوا بلند ترا آستانہ آج

داغ مدح سنج مداح نواب

۱۲　۸۲

حضرت داغ بحیثیت افسر اصطبل

نواب خلد آشیاں کی عام عادت تھی کہ وہ ملازمین کو تنخواہ تو بہت کم دیتے تھے لیکن خاطر و مدارات، دلدہی اور انعام و عنایات میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے، اس لئے سب کی نگاہیں

تنخواہ سے زیادہ انعامات اور صلوں پر لگی رہتی تھیں جو وقتاً فوقتاً کسی خاص تقریب یا اظہار کار گزاری کے وقت انھیں عطا ہوتے رہتے تھے اور ہر مصاحب کے متعلق کوئی نہ کوئی خدمت بھی کی جاتی تھی - چنانچہ نواب مرزا خاں داغ کے سپرد مصاحبت کے علاوہ اصطبل و فراشخانہ بھی کئے گئے تھے، تنخواہ معلعہ ۵ ماہانہ تھی - اس زمانہ میں اصطبل اس عمارت میں تھا جہاں اب فراشخانہ ہے - جب اہلِ رامپور کو حضرت داغ کے افسر اصطبل ہونے کی اطلاع ہوئی تو رنگ کی سیاہی اور اصطبل کی رعایت سے کسی ستم ظریف نے ایک شعر لکھ کر اصطبل کے دروازے پر لگا دیا جو آج تک بچے بچے کی زبان پر ہے :-

شہر دہلی سے آیا اک مشکی　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

جب مرزا داغ کی نظر اس شعر پر پڑی تو شعر کی رعایتوں کی داد دی اور اعلان کر دیا کہ میں اس شاعر سے ملاقات کا آرزومند ہوں وہ بے خوف ہو کر مجھ سے ملیں میں ان کی قدر کروں گا - لیکن اس شاعر کا پتہ آج تک نہ چلا - حالیہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ شعر میر احمد علی رسا رامپوری شاگرد شیخ علی بخش بیمار نے لکھا تھا - اور کسی شاگرد کے ذریعہ اصطبل کے دروازے پر چسپاں کرا دیا تھا

داغ کی قیامگاہ داغ کی قیامگاہ کوچہ پیمنیر پاس میں تھی جو جامع مسجد سے مغرب کی طرف واقع ہے اس تنگ گلی میں داہنی طرف پیشاب گھر کے پاس جو دوسرا دو منزلہ مکان ہے اسی میں داغ ہمیشہ مقیم رہے - اسی میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس مکان سے اصطبل صرف ایک فرلانگ پر واقع تھا سرکاری قلعہ قیامگاہ کے سامنے تھا اور مرزا رحیم الدین حیا دہلوی کا مکان کوچہ لنگر خانے میں تھا جو نواب مرزا کی قیامگاہ سے بہت قریب تھا -

داغ کے ہمعصر شعراء منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی - منشی امیر احمد صاحب مینائی - سید ضامن علی جلال لکھنوی - منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی - سید محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی - شیخ امداد علی بحر لکھنوی - خواجہ ارشد علی خاں قلق - حسین علی خاں شاداں نبیرہ مرزا غالب - خواجہ محمد بشیر بشیر لکھنوی - صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا دہلوی - مرزا معین الدین حیدر غیس لکھنوی - آغا علی نقی غنی لکھنوی - آغا محمد شیرازی نثار - سید احمد علی رسا رامپوری - میر محمد زکی زکی بلگرامی - میر یار علی خاں صاحب ریختی گو لکھنوی - سید زین العابدین عرف سید منصور علی رامپوری منصور و علی تخلص - سید صابر حسین سہسوانی صبا - منشی احمد حسن خاں عروج کانپوری - سید ابو محمد بدر ابن منیر شکوہ آبادی -

رامپور کے چند مشاعرے مولانا عبدالرزاق خاں صاحب طالب رامپوری مرحوم سابق پروفیسر فارسی مدرسۂ عالیہ رامپور میرے استاد تھے - انھوں نے ایک دن ایک مشاعرے کا ذکر فرمایا کہ میں شیخ احمد علی صاحب احمد رام پوری فارسی کے مسلم الثبوت استاد سے فارسی پڑھا کرتا تھا - اسی طالب علمی کے زمانے میں ایک طرحی مشاعرے کی شرکت کا اتفاق ہوا - " قامت کے قیامت کے " قافیہ و ردیف تھا - میری غزل اسوقت ہوئی جبکہ مشاعرہ سرد پڑ چکا تھا اور مرزا داغ ۲ بجے شب کے تکان کی وجہ سے اندرونی ہال میں گاؤ تکیے کا سہارا لیکر نیم دراز ہو چکے تھے - جب میں نے یہ شعر پڑھا :-

ہاتھ میں جام ہے لئے میکش　　منتظر ہیں خدا کی رحمت کے

یہ شعر سنکر داغ باہر آ گئے اور فرمایا مولانا تم نے مشاعرہ ختم کر دیا - پھر کیا تھا داد و آفرین کے ہر طرف نعرے لگنے لگے اور مشاعرہ جاگ گیا -

ایک اور مشاعرہ میں محمد شاہ خاں کاوش رامپوری شاگرد جلال نے غزل پڑھی جس کا آخری مصرع معلوم ہو سکا -

خود کنوئیں میں گر پڑے جو روئے دل بر دیکھکر

داغ خاموش نہ رہ سکے - فرمایا یوں کہو :-

جو کنوئیں میں گر پڑے خود روئے دل بر دیکھکر

انھوں نے "جورو" کے لفظ کی گرفت کرکے بیچارے کو شرمندہ کردیا اور قہقہہ بلند ہوا۔

احسن مارہروی نے جلوۂ داغ میں لکھا ہے کہ مرزا نے غدر کے بعد پہلے پہل صاحبزادہ محمد رضا خاں رامپوری کے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی تھی:۔

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں
اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں
داغ جاکر نہ پھرے سوئے عدم اپنے رفیق
ہم یہ سمجھے تھے کہ دم بھر میں چلے آتے ہیں

نواب مرزا خاں داغ کے کلام کی داد

احمد علی خاں عرف امن خاں بیخود مرحوم رامپوری نے داغ کے کلام کی داد کا حال اس طرح بیان کیا کہ جب داغ مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تھے تو رامپور کے پٹھان انھیں سیکڑوں گالیاں دیتے تھے۔ دریافت کیا گیا کہ گالیوں کا کیا موقع تھا۔ جواب دیا کہ کلام کی تاثیر اور حسن قبول کا یہ عالم تھا کہ پٹھان بے ساختہ چیخیں مار مار کر کہتے تھے۔ اُف ظالم مارڈالا۔ اُفوہ گلا حلال کردیا۔ اُف۔ اُف۔ کم بخت نے دل کا کام کردیا۔ اُف اُف ستم کردیا۔ غضب ڈھا دیا۔

ایک دن نواب خلد آشیاں نے نواب عبداللہ خاں سے پوچھا کہ داغ کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے۔ جواب دیا کہ:۔ "تیرٹے میں گلاب بھرا ہوا ہے"۔ مقصد یہ تھا کہ صورت تو کالی ہے لیکن باطن گلہائے معانی کی خوشبوؤں سے مہک رہا ہے۔

پڑھنے کا عجیب انداز تھا جس طرف ہاتھ اُٹھا دیتے پورے مشاعرے کی نظریں اسی طرف اُٹھ جاتیں۔ ایک بار عربی مدرسے کے طلبہ کا ایک گروہ بھی داغ کے کلام کی شہرت سُن کر ایک مشاعرے میں شریک ہوا۔ اور سب کے سب ایک ہی گوشے میں جاکر بیٹھ گئے۔ داغ دور ہی سے دیکھ کر تاڑ گئے۔ جب انھوں نے غزل پڑھی تو لمبی لمبی داڑھی والوں کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اس شعر کے مصرع ثانی کی بار بار تکرار کی۔

کسی کی نرگس مخمور کچھ کہ دے اشاروں میں
مزہ ہے رات دن چلتی رہے پرہیزگاروں میں

پھر کیا تھا مشاعرہ دیوار قہقہہ بن گیا اور پورے مشاعرہ کی نظر طلبہ کی طرف پھر گئی۔ آخر بیچارے کچھ خفت کے ساتھ اُٹھکر اپنے حال پر خود ہی ہنستے ہوئے گھروں کو چلے گئے۔

یہ مشہور ہے کہ داغ کی غزل کے بعد مشاعرہ اُکھڑ جاتا تھا۔ اور مشاعرے کے باہر سوائے داغ کے اشعار کے کسی شاعر کا شعر وردِ زبان نہ ہوتا تھا۔ امیر کا مقولہ ہے کہ وہ کلام پسندیدہ ہے جو مشاعرے سے باہر جائے۔ فرماتے تھے کہ میں نے باہر جانے والوں میں اکثر مرزا داغ کا شعر باہر نکلتے دیکھا ہے۔ مرزا میں گو اعلےٰ علمی استعداد کم ہو لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ محاورہ بندی۔ زبان۔ روز مرہ کی پابندی فصاحت و بلاغت اور صفائی بیان کے وہ حاکم تھے۔ ان کا ہر شعر دل میں اُترتا اور حافظے میں محفوظ ہوجاتا تھا۔ خود کہتے ہیں:۔

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ
اُردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے ✓

داغ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا
جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی پاتے ہیں

نہیں ملتا کسی مضموں میں ہمارا مضموں
طرز اپنا ہی جدا سب سے جدا رکھتے ہیں

داغ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن
خوش بیانی کا مزہ جاتا رہا

داغ معجز بیاں ہے کیا کہنا
طرز سب سے جدا نکالی ہے

اللہ اللہ تری شوخ بیانی اے داغ
سست اک شعر نہ دیکھا ترے دیواں میں کبھی

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

محفل علم و شعر کی برہمی

آخر وہ وقت بھی آگیا کہ نواب خلد آشیاں نے ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو دُنیا سے کوچ کیا اور اہلِ کمال کا مجمع درہم برہم ہوگیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پرنم نہ ہو کوئی دل ایسا نہ تھا جو وقفِ غم نہ ہو۔ کچھ دن پہلے یہ چمن طرح طرح کے پھولوں سے آباد تھا۔ بلبلوں کی نغمہ سرائی دل و دماغ کو مست کئے دیتی تھی لیکن دم بھر میں بادِ صرصر نے ویران کردیا۔ ایک شمع تھی جس کے گرداگرد پروانوں کا ہجوم تھا۔ کچھ ختم ہوگئے کچھ سسکتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ نہ علماء رہے نہ شعراء۔ نہ داستان گو اور نہ دیگر فنون کے اہلِ کمال۔

وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

اس حادثے نے داغ کا دل بھی توڑ دیا اور خلد آشیاں کی قدر دانی کی یاد نے انھیں آٹھ آٹھ آنسو رُلا دیا۔

نواب نے کی جو قدر دانی میری　　لے داغ گزر گئی جوانی میری
لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وقتِ پیری　　مر مر کے کٹے گی زندگانی میری
رئیس مصطفےٰ آباد کے نوکر ہوئے جب سے　　کہیں کیا داغ ہم آرام ہم نے کسقدر پایا

آخر یہ کہہ کر رخصت ہوگئے:۔

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغ　　وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں تک

پھر کہتے ہیں:۔

رہے گا مصطفےٰ آباد میں داغ　　غریب و عاجز و مسکیں کہاں تک

جب مرزا داغ رامپور سے ۱۸۸۶ء میں قطع تعلق کرکے رخصت ہوئے تو پہلے دلّی گئے۔ وہاں سے مختلف شہروں لاہور۔ اجمیر اور آگرہ وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہونچے۔ "ملے داغ سلطان سے" مادۂ تاریخ ہے (۱۳۰۵)۔ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ سے نظام کی اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو ہزار کی تنخواہ ہوئی۔ متعدد خطابات سے نوازے گئے۔ لیکن خودداری کو نہ چھوڑا۔ نہ کسی کی خوشامد کی، نہ بغیر بلائے نظام کے پاس گئے:۔

میں وضع کا پابند ہوں گر جان بھی جائے　　جب کوئی بلاتے نہیں آتا، نہیں جاتا

لیکن باوجود ان مناسب و اعزاز کے رامپور کی صحبتوں کو بھی فراموش نہ کیا۔ حیدرآباد سے ایک غزل رامپور میں امیر مینائی کو بھیجی تھی جس کے دو شعروں میں دلی تڑپ کا اظہار کیا گیا ہے۔

یاد آتے ہیں وہ اشخاص مصاحب منزل　　دو گھڑی جلسہ وہ احباب کے شامل اپنا
نہیں اکثر کا پتہ اور جو کچھ باقی ہیں　　ان سے ملنے کو تڑپتا ہے بہت دل اپنا

اس کے بعد امیر مینائی کا دل بھی اُچاٹ ہوگیا اور کہنا پڑا:۔

کہاں ہم لے امیر اور اب کہاں داغ　　وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

چنانچہ وہ بھی حیدرآباد پہونچے لیکن قضا نے قیام کی زیادہ مہلت نہ دی ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کر گئے۔ تو داغ کے زخم پھر ہرے ہوگئے فرماتے ہیں:۔

داغ اس ضعف نے کی اپنی تو منزل کھوٹی　　ہم رہے جاتے ہیں سب یار چلے جاتے ہیں

لیکن ذیل کے شعر میں جن تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا ان میں صرف ایک تو پوری ہوئی یعنی امیر مینائی سے ملاقات ہوگئی۔ لیکن جلال کی آرزو باقی ہی رہی۔

لے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ　　ملتے امیر احمد و سید جلال سے

رامپور میں ایک امیر اللہ تسلیم رہ گئے تھے جن کی حالت ان کے شعر سے ظاہر ہے:۔

ہماری شاعری تسلیم تھی کلبِ علی خاں تک　　ذلیل و خوار ہم پھرتے ہیں وہ سوتے ہیں مدفن میں

داغ کے غیر مطبوعہ خطوط

(پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

امیر و داغ ہماری قدیم شاعری کا آخری ورق ہیں، ان کا ذہن اور کردار انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ اسوقت رندی و زہد میں، وہ تضاد نہیں تھا جو آج ہے، مومن کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لئے طیار ہے اور شبِ وصلِ غیر کاٹنے کے لئے آمادہ۔ لیکن وہ اس سطح سے بلند ہوکر انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کی ترغیب بھی دیتا ہے اور کہتا ہے :-

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب ۔۔۔ یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں ۔۔۔ مری جاں فدا ہو تری راہ میں

امیر مینائی نیک طینت اور پاک سرشت بزرگ تھے بقول مولانا ثاقب۔ ایک عالم نور۔ مجسم شفقت و محبت اور پیکرِ تہذیب و متانت۔ ان کے تقدس اور بے ریائی کی شہرت لوگوں میں اسی قدر تھی جتنی اُن کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی ـــــ لیکن ایسا زاہد و عابد زمانہ کے اثر سے مجبور ہوکر شعر کہتا ہے تو یہی :-

شرم بھی جائے تو میں جانوں کہ تنہائی ہوئی !

امیر کے خطوط اُن کی شاعری سے مختلف ہیں۔ یہ ان کی ذاتی پاکیزگی اور نکو کرداری کا آئینہ اور لفظی، بیانی اور عروضی دقائق و نکات کا گنجینہ ہیں۔ لیکن ان میں وہ رنگینی اور شگفتگی نہیں ہے جو شخصیت کی بوقلمونی اور ہمہ گیری سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی سب سے اعلیٰ مثال مرزا غالب کے خطوط ہیں۔

امیر کے ہمعصر یعنی مرزا داغ کے خطوں کے تیور کچھ اس قسم کے ہیں "چناں کہ می نمایم ہستم" لیکن وہ اُن کا ادبی کارنامہ نہیں ہیں ان میں عبارت کی دلآویزی اور عشوہ پردازی تقریباً مفقود ہے۔ بعض خطوں کی عبارت ڈھیلی اور معمولی ہے اور ان میں کسی قسم کی ادبی یا منشیانہ شان نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ داغ صرف شاعر تھے، ملٹن، سعدی، ظہوری اور غالب کی سی سعادت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے کہ وہ نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں۔ اس کے باوجود اگر انشائے داغ کے گلستانِ خزاں منظر کو شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو اس میں بھی چند ایسے گلہائے خوش رنگ مل جائینگے جو امیر کے یہاں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ داغ اور امیر کی طبیعتیں مختلف تھیں۔ امیر، متقی، پرہیزگار اور سادہ مزاج تھے اور داغ بذلہ سنج۔ خوش طبع اور رنگیں مزاج۔ کوچہ گردی کی بو جو ان کی شاعری میں ہے، وہ خطوں میں بھی کہیں کہیں ہے جہاں نگارانِ عشوہ فروش کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ شراب دو آتشہ ہوگئی ہے۔

داغ کے خطوں میں، جو رنگینی ہے وہ خمارِ چشم ساقی کی بدولت ہے، ممکن ہے بعض طبائع کو یہ بات ناگوار گزرے کہ ان میں طوائفوں کا ذکر ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں عشق و محبت کے لوازم گھر کے بجائے بازار ہی میں نشو و نما پاسکتے تھے۔ بیوی صرف خاندان چلانے کا ذریعہ تھی اور طوائف جذباتی دُنیا کی مالک۔ غالب بالعموم دن بھر میں صرف ایک دفعہ گھر کے اندر جاتے تھے۔ عورت ہماری سوسائٹی سے غائب تھی۔ اس کا وجود حرم سرا کے اندر تھا اور بہو بیٹیاں جنسی صحبت سے ناآشنائے محض تھیں۔ مرزا شوق

لکھنوی نے اُنیسویں صدی کے اُس ماحول کی ترجمانی بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہے جب زندگی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُس کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا۔ مہ لقا کے یہ الفاظ صرف اُس کے دُکھے ہوئے دل کی پکار نہیں بلکہ عصری معاشرت کا مرثیہ بھی ہیں :-

نہیں واللہ دسترس اپنا　　قیدی بندی ہے کیا ہے بس اپنا
دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے، 　　بات کرنے میں عیب لگتا ہے،
ناک میں دم ہے، اشکباری ہے، 　　زندگی تک سے جان عاری ہے

اِس شعر میں اُس زمانہ کی پوری جنسی زندگی سمٹ آئی ہے :-

عشق کا حال بیسوا جانیں　　ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ طوائف جو ہمارے جذبات پر چھائی ہوئی تھی، اس نے ادب میں بھی مرکزی جگہ حاصل کرلی غزل میں جو معاملہ بندی، ہوس پرستی اور عاشق پیشگی ہے وہ بھی اُسی کی نگاہ شوخ کی بدولت ہے۔

داغ کے سب سے دلچسپ خطوں کی مخاطب حمیدن بائی نقاب اور منی بائی حجاب ہیں۔ اِس زمانہ میں ہندوستانی طوائف، قدیم یونان کی طرح ایک تہذیبی ادارہ تھی۔ دماس تھینیس اور ہرکلز علی الترتیب سسیس اور اسپاسیا سے محبت کرتے تھے اور یہ دونوں طوائفیں تھیں۔ روم کے حمام قحبہ خانے تھے اور وہاں جانا تہذیب کے منافی نہیں تھا۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کی طوائف بھی رقص و موسیقی، علم مجلسی، لباس کی تراش خراش اور شعر و شاعری سے اچھی طرح واقف ہوتی تھی۔ اسی لئے شرفا اپنے بچّوں کو وہاں تہذیب سیکھنے کے لئے بھیجتے تھے۔

حجاب سے داغ کے تعلقات کی ابتدا کلکتہ سے ہوتی ہے، انھوں نے واجد علی شاہ کے مصاحب حامد الدولہ بہادر کو ۲۹ر اگست ۱۸۸۵ء کے ایک غیر مطبوعہ خط میں لکھا ہے :-

"یہ چلن تیرے نئے اے گردشِ دوراں ہوئے　　حامد الدولہ بہادر داغ کے پرساں ہوئے

...... میں ایک مرنج و مرنجاں آدمی۔ کھونے کو گیا۔ کچھ کمانے کو نہیں گیا تھا۔ دل لگی کا یار، جلسوں سے سروکار اہلِ سخن کا مشتاق، میں رنج کی باتوں کو کیا جانوں۔ ۔ ۔ ۔ جس دن سے کلکتہ چھوڑا۔ آٹھ دن اچھا نہ رہا کئی بار تو مرہی چکا تھا۔ بلکہ اب بھی صاحبِ فراش ہوں"

داغ نے کلکتہ کے متعلق لکھا ہے (وہاں) کھونے کو گیا (تھا) کچھ کمانے کو نہیں گیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل سید رفیق مارہروی کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

"قیام رامپور کے زمانہ میں کسی کام سے حضرت داغ کلکتہ تشریف لے گئے وہاں ایک پرکالۂ آتش سے ملاقات ہوئی۔ نام اس کا منی بائی تھا۔ داغ اسے اپنا دل دے بیٹھے۔ ۔ ۔ ۔ مثنوی فریاد داغ اسی زمانہ کی پیداوار ہے اور خالصتاً منی بائی کے ہجر و فراق کا نتیجہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے داغ کے سوز عشق اور ان کی محبت و گرویدگی ...... کا پتہ چلتا ہے، منی بائی ایک تعلیم یافتہ طوائف تھی۔ شاعری بھی کرتی تھی حجاب تخلص تھا یہ چیز متنازعہ فیہ ہے کہ آیا وہ فیض داغ سے شاعرہ ہوئی یا پہلے سے شعر کہا کرتی تھی۔ جس زمانہ میں داغ اس سے ملے وہ ایک شخص کی پابند و ملازم تھی۔ داغ کی پذیرائی نہ ہوسکی۔ اس چیز نے سوز عشق پر وہ کام کیا جو آگ پر تیل کا کام کرتا ہے محبت کی جو چوٹ داغ نے دل پر کھائی تھی، زخم بنی اور بالآخر ناسور ہوگئی"

داغ نے اپنے اور حجاب کے معاملات کا اکثر خطوں میں ذکر کیا ہے۔ مہاراجہ یوراج بیرپہ ٹھاکر ہرکشن بہادر بیدآر کو ایک

غیر مطبوعہ خط میں لکھتے ہیں :-

"تمہارا استاد بوڑھا ہے - مگر ہزار جوانوں سے بہتر- کبھی دل میں آتا ہے - اپنا عاشق آپ ہوجاؤں - راجہ صاحب ہمارے عاشق تم ہوجاؤ - خدا کے لئے ہوجاؤ - بھگوان کے لئے ہوجاؤ - منی بائی حجاب تخلص جو صاحب مثنوی فریادِ داغ ہیں، ہرچند بلاتا ہوں - نہیں آتیں - وہ مجھ کو بلاتی ہیں - مجھے حضور پُرنور نہیں جانے دیتے - اور بالفعل تو میرے دم ہی پر بنی ہوئی ہے - سخت علیل ہوں ...... آپ بھی دعا کیجئے اور میری علالت اخبارات پنجاب میں چھپوا دیجئے کہ سب احباب کو خبر ہو جائے - کلکتہ کے اخباروں میں تو چھپ گئی - راجہ صاحب آپ اپنی طرف سے ایک خط منی بائی حجاب کو ضرور بھیجئے بدیں مضمون ...... تعجب ہے کہ باوصف اس علالتِ شدید کہ جس کا صدمہ تمام ہندوستان کو ہے اور خلقِ خدا دست بدعا ہے آپ رامپور نہ جائیں - اگر ہزار روپئے کی نوکر ہوتیں تو اس وقت میں نوکری چھوڑ دیتیں۔"

داغ نے ۵ ستمبر ۱۸۹۸ء کے ایک غیر مطبوعہ خط میں حمیدن بائی نقاب کو حجاب کے متعلق لکھا ہے :-

"کاش اس قدر میں دیدارِ حق کا مشتاق ہوتا! ..... میں نے پہلے سُنا تھا کہ قرآن اُٹھ گئے ہیں - عہد و پیمان ہوگئے ہیں مجھ سے نہ ملنے کے - اب یقین ہوا ..... بائی جی کو لگا لینا آتا ہے - لگا رکھنا نہیں آتا۔"

کئی مہینے کے بعد کامیابی کی ایک صورت نظر آئی - داغ ۱۸ نومبر ۱۸۹۸ء کے ایک غیر مطبوعہ خط میں منی بائی حجاب کو لکھتے ہیں :-

"لو مبارک ہو - واہ ! میں بھی کیا خود غرض ہوں - اپنا مطلب نکلے اور دوسرے کو مبارکبادی - جی تو چاہتا تھا نہ لکھوں کہ سناٹا گزر جائے گا - خدا جانے کون کون اس رشک سے مرجائے گا مگر کیا کروں - بغیر لکھے بھی تو بن نہیں آتی - وہ آرزو کہ سوا تین برس سے دل میں تھی للّٰہ الحمد کہ اب برآئی - بکاڈکر جانا تمہارے پاس دشوار نہ تھا - مگر نہ میری آدمیت، نہ تمہاری اجازت - حضور پُرنور دام اقبالہ نے جان لیا کہ اس کی جان مفت میں جاتی رہے گی - پرسوں طبیبِ خاطر فرمایا کہ تم جلد کلکتہ چلے جاؤ بغیر وہاں کے جائے اور ہوا کھائے سنبھلتے نظر نہیں آتے - وہاں جاکر دو تین مہینے میں آسکتے ہو، عدم کو جاؤگے تو میں کہاں پاؤں گا۔"

لیکن سید رفیق مارہروی کا بیان ہے کہ حیدر آباد کے قیام سے پہلے داغ کو حجاب کے حصول میں کامیابی نہیں ہوئی - انھوں نے مولوی افتخار عالم کے روز نامچہ سے ایک خط بھی نقل کیا ہے جو حجاب کے نام ہے اور ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کا لکھا ہوا ہے :-

"دشمنِ جانی ..... تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ - یہ کرلوگے جب ہی تمہارے پاس آؤں گی ..... اچھا تم یہاں آجاؤ - پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔"

بالآخر ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء کو منی بائی حجاب حیدر آباد پہونچ گئیں لیکن اب وہ زاہد مناجاتی بن گئی تھیں - داغ نے قاضی عبدالحمید کو لکھا ہے :-

"بی فرشتن مع بابو خدا بخش کے پہونچیں - میرا مکان بھی آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے - میں رند خراباتی اور وہ زاہد مناجاتی - دیکھئے کیا ہو - ابھی مجھے اس پردے میں یہ نہیں معلوم کہ وہی ہیں یا کوئی اور۔"

مولانا احسن مارہروی نے داغ کی رندی و ہوسناکی کی وجہ جواز ڈھونڈی ہے اور اس کا مقابلہ علامہ شبلی کی زندگی سے کرکے تحریر فرمایا ہے :-

"مرزا داغ ہوں یا مولانا شبلی - فطری اور پیدائشی جذبات و احساسات کے حمام میں سب ہی عریاں نظر آئیں گے - یہ بات دوسری ہے کہ کسی کا تہ بند کھاروے کا ہو اور کسی کی لنگی تنزیب کی۔"

احسن مرحوم نے جو طریقہ اس معاملہ پر پردہ ڈالنے کا اختیار کیا ہے، وہ بدیہی طور پر اتنا قابلِ اعتراض اور غلط ہے کہ ہم

اس سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر اِس طرح شبلی کی برائی ثابت بھی ہوجائے تو بھی اس سے داغ کی اچھائی لازم نہیں آتی۔

داغ کے رنگِ تغزل سے ادبستانِ شعر و سخن کا بچہ بچہ واقف ہے لیکن نثر میں بجز خطوط کے ان کی اور کوئی یادگار نہیں ہے ان کے مکاتیب کی حیثیت، ایک بڑے شاعر کی یادگار اور باقیات کی ہے۔ کہیں کہیں داغ کی شوخی و شگفتگی، رندی و شاہد بازی، ادبی آگہی و گرویدگی، کے نقوش بھی ملجاتے ہیں، جن سے داغ کی زندگی کی ایک مکمل تصویر طیار کی جا سکتی ہے لیکن بذاتِ خود یہ خطوط اعلیٰ پایہ کے نہیں ہیں۔ ان کو صرف اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ وہ مرزا داغ کے نام سے منسوب ہیں۔

داغ کی یہ عادت تھی کہ وہ حضور نظام اور امرائے عظام کے علاوہ زیادہ تر خطوط کسی حاضر باش سے لکھوا دیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے خطوں میں بے ربطی اور سہوی اور املائی غلطیاں ملتی ہیں۔ اکثر مراسلے جلوت میں لکھوائے ہیں۔ مرزا صاحب بولتے جاتے تھے اور لکھنے والا لکھتا جاتا تھا اور اس حالت میں اور اور باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ اسی لئے ان مراسلوں میں آبداری اور رنگینی جیسی داغ کے خطوں میں ہونے کی توقع ہوتی ہے وہ تقریبًا مفقود ہے۔ تاہم اس آئینے میں ان کے سوانح اور سیرت کے تمام خط و خال نظر آسکتے ہیں۔ یہ مکاتیب گویا مکمل دستاویزیں ہیں جن سے ہم کو ان کے مذاق و کردار، میلان و رجحان، عادات و خصائل اور حسیات و جذبات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہم نے اُن کے صرف چند غیر مطبوعہ خطوں پر اکتفا کیا ہے جو نقاب اور حجاب سے متعلق ہیں اور نسبتًا سب سے زیادہ دلکش ہیں۔ لیکن تلاش سے ان کے اور خطوط بھی ملیں گے جن کو جمع کرنا اور شائع کرنا یقینًا ادب کی خدمت ہے۔[1]

---

[1] اِس مضمون کی طیاری میں مجھے محترم مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے بہت مدد ملی ہے اور میں اُن کی اس عنایت کا ازبس ممنوں ہوں۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کی ایک مشہور غزل

اور

داغ کی تضمین

مدعی کون وہاں دخل کسی کا کیسا — اپنے سائے سے بھی بچتا تھا وہ کیسا کیسا
دیکھتے دیکھتے پلٹا ہے زمانا کیسا — جلد جم جاتا ہے ہر شخص کا نقشا کیسا
سادہ دل ہے وہ بت آئینۂ سیما کیسا

لوگ ہمسائے کے ہیں جمع پریشاں خاطر — لاش پر روتے ہیں ہوتا نہیں قاتل ظاہر
اُن کی سنیئے تو حقیقت ہے نہایت نادر — کرکے خون ایک کا جا بیٹھے ہیں گھر میں اور پھر
پوچھتے ہیں کہ مرے در پہ ہے غوغا کیسا

جو دکھانا ہے دکھا کل کے عوض آج شتاب — میں نہیں وہ کہ جو موسیٰ کی طرح لاؤں نہ تاب
مجھسے دیدار طلب ہوں گے جہاں میں کمیاب — ذوقِ دیدار میں بیخود ہوں نہ کر مجھ سے حجاب
اُٹھ گیا بیچ سے جب میں ہی تو پردہ کیسا

داغ اور ان کے معاصرین

(پروفیسر نفیس سندیلوی)

داغ کے معاصرین میں، منشی محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی، ملک الشعراء مفتی امیر احمد امیر مینائی، منشی امیراللہ تسلیم اور حکیم ضامن علی جلال خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر اور ہمہ گیر شہرت کے مالک ہیں اس کے علاوہ ظہیر دہلوی، مرزا حیا دہلوی اور راسخ دہلوی بھی ان کے معاصرین میں استادانہ درجہ رکھتے ہیں لیکن ان حضرات کو بہت زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

سید ظہیر الدین حسن ظہیر زیادہ تر الور، جے پور اور ٹونک وغیرہ ریاستوں میں رہے آخر زمانے میں حیدر آباد چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ ان کی شہرت اسی نواح میں زیادہ ہوئی ان کے تلامذہ کی تعداد بھی ان ریاستوں میں زیادہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا کلام دہلی کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے، پختگی، صفائی، متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے اور مومن خاں کا رنگ جھلکتا ہے اور خود بھی فرماتے ہیں:-

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

ان کے دو دیوان شایع ہو چکے ہیں اور تیسرا دیوان ان کے حقیقی نواسے شوق دہلوی کے پاس محفوظ تھا جو شرمندۂ طباعت نہ ہوا۔ ان کے تلامذہ میں ثاقب بدایونی مشہور بہ "پہلوانِ سخن" زیادہ مشہور ہوئے۔

ظہیر کے چھوٹے بھائی سید شجاع الدین حسن "انور" بھی داغ کے معاصر شاعر خوش فکر و نغزگو تھے، غدر کے بعد جے پور چلے گئے تھے اور وہیں ۴۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:-

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینا پونچھیے اپنی جبیں سے

میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی ان کے مشہور شاگرد اور نہایت خوش فکر و مشاق استاد تھے جن کے ارشدِ تلامذہ میں مولنا محمد منظور احمد کوثر سندیلوی نبیرۂ ملا حمداللہ شارحِ مسلم سندیلوی مقیم جے پور اور منشی چند بہاری لال ماتھر صبا جے پوری ہیں۔

مرزا رحیم الدین حیا، دلی کے شہزادے نہایت خوش فکر اور صاحبِ فن شاعر تھے ان کو زیادہ شہرت نہیں ہوئی انکا ایک قلمی دیوان میری نظر سے گزرا ہے ان کی یہ غزل بہت مشہور ہے:-

دی ہے کس بت کی محبت یہ خدایا مجھکو ۔ وہ مجھے دل سے بھلا دے میں بھلا بھی نہ سکوں

عبدالرحمن راسخ دہلوی کی شہرت و مقبولیت دہلی اور نواحِ دہلی تک محدود رہی، کہنہ مشق استاد تھے ان کے تلامذہ میں قمر بدایونی زیادہ مشہور ہوئے۔

منیر، امیر مینائی، جلال اور تسلیم کو خاص طور سے اس لئے داغ کے معاصرین میں خیال کیا جاتا ہے کہ مدت تک یہ

حضرات رام پور میں ہم صحبت رہے قبل اس کے کہ میں داغ کے کلام کے ساتھ ان کا کلام پیش کروں یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مختصر حالاتِ زندگی سے بھی قارئین کو متعارف کراؤں - ذیل میں ان کی پیدائش اور وفات اور عمر کا ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ایک ہی نظر میں یہ اندازہ ہوجائے گا کہ کس نے کتنی عمر پائی اور ایک دوسرے کی عمر میں کتنا فرق تھا

	نام شاعر	پیدائش	وفات	عمر
۱ -	منیر شکوہ آبادی	۱۲۲۳ھ	۱۲۹۷ھ	۶۴ سال
۲ -	تسلیم لکھنوی	۱۲۳۵ھ	۱۳۲۹ھ	۹۴ سال
۳ -	امیر مینائی	۱۲۴۴ھ	۱۳۱۸ھ	۷۴ سال
۴ -	داغ دہلوی	۱۲۴۶ھ	۱۳۲۲ھ	۷۶ سال
۵ -	جلال لکھنوی	۱۲۵۰ھ	۱۳۲۴ھ	۷۴ سال

۱ - **منیر شکوہ آبادی :-** محمد اسماعیل نام منیر تخلص، شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے سید احمد حسین شاد کے صاحبزادے تھے - عنفوانِ جوانی میں شاعری کا شوق پیدا ہوا، ابتدا میں شیخ ناسخ سے اصلاح لی پھر ان ہی کے ایما سے میر علی اوسط رشک کو اپنا کلام دکھانے لگے - مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے - "حیات دبیر" میں ان کے حالات تفصیل سے ملتے نیز انھوں نے خود بھی اپنے حالات لکھے ہیں - ابتداء میں لکھنؤ، مرشد آباد، فرخ آباد میں قیام رہا اس کے بعد نواب علی بہادر رئیس باندہ نے ان کو بلالیا اور اپنے کلام کی اصلاح ان کے سپرد کی اُسی زمانے میں کسی قتل کے مقدمہ میں قید ہوکر کالے پانی بھیج دئے گئے اور چند سال بے گناہ کالے پانی میں رہے اور طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کئے سب سے زیادہ تکلیف افیون کی تھی اس لئے کہ وہ افیون کھاتے تھے انھوں نے اپنے یہ واقعات نظم بھی کئے ہیں - اس زمانہ میں ان کے سرپرست اور تلامذہ نے ان کو بالکل فراموش کردیا ان کی بے مروتی و کج خُلقی کی انھوں نے بہت شکایت کی ہے - چند سال کے بعد جب وہاں سے آئے تو نواب کلب علی خاں نے جو ان کے بڑے قدر داں تھے رام پور بلاکر رکھا اور آخر وقت تک وہیں رہے ان کا کلیات "ثمرِ ہند" کے نام سے طبع ہوچکا ہے جس میں ان کے تین دیوان ۱ - منتخب العالم (۱۲۶۴ھ) - ۲ - تنویر الاشعار (۱۲۶۹ھ) - ۳ - نظم منور (۱۲۸۶ھ) ایک مثنوی "معراج المضامین" شامل ہے -

منیر کو تمام اصنافِ سخن پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی بہت پرگو تھے، دیوان میں طویل غزلیں پائی جاتی ہیں جو ۷۰، ۷۵ اور اس سے بھی زاید اشعار پر مشتمل ہیں - کلام میں دور از کار تشبیہات و استعارات اور رعایت لفظی کی وہ بھرمار ہے کہ خدا کی پناہ - تمام کلام بے مزہ ہے اور ابتذال سے گزر گیا ہے اور بعض بعض اشعار نہایت عریاں اور فحش ہیں منیر بہت صابر و شاکر اور مصائب کا مقابلہ کرنے والے شخص تھے -

ان کے تلامذہ میں، مرزا عاشق حسین بزم اکبر آبادی جو ان کے نواسے بھی ہیں اور شہیر مچھلی شہری بہت مشہور ہیں -

۲ - **تسلیم لکھنوی :-** احمد حسین نام امیر اللہ عرف اور تسلیم تخلص تھا، مولوی عبدالصمد انصاری کے بیٹے موضع منگلسی نواحِ فیض میں ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے - فارسی تعلیم اپنے والد ماجد سے اور عربی تعلیم اپنے بھائی مولوی عبداللطیف سے حاصل کی - فنِ خوش نویسی منشی عبدالحی سندیلوی سے حاصل کیا - عرصے تک نول کشور پریس لکھنؤ میں ملازم رہے - شاعری کا شوق ہوا تو نواب اصغر علی خاں نسیم دہلوی شاگردِ مومن خاں کے شاگرد ہوئے - نسیم کا یہ شعر بہت مشہور ہے :-

نسیم دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں

مطبع نول کشور میں ملازم تھے کہ نواب کلب علی خاں نے تار بھیج کر از راہِ قدر دانی رام پور یاد فرمایا، تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر فرمائی اور دو سو روپے عید کے موقع پر ملتے رہے۔ مطبع سرکاری آپ کے سپرد ہوگیا پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے اور تنخواہ میں بیس روپے کا اور اضافہ ہوگیا۔

نواب صاحب نے بڑی عزت افزائی فرمائی ہر قسم کا عیش میسر تھا۔ خرچ زیادہ تھا ہر سال کئی سو روپے کے مقروض ہوجاتے۔ نواب صاحب کو خبر ہوتی اظہار افسوس کرتے اور قرض ادا کردیتے۔ نواب جب انگلستان کے سفر سے واپس ہوئے تو آپ نے سفرنامہ نظم کرکے پیش کیا اور چالیس روپے پنشن مقرر ہوگئی۔ لکھنؤ چلے گئے۔ جب نواب حامد علی خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو دادا جان کے وقت کا شاعر سمجھ کر یاد فرمایا۔ ہوم سکریٹری سے پوچھا ان کی پنشن کیا معنی ۔ کوئی سپاہی ہیں جو بندوق نہیں چلا سکتے ہیں ۔ تو شاعر ہیں۔ آخر کار ۲۸ مئی ۱۹۱۰ء کو ۵ بجے شام کو انتقال فرمایا۔

مولانا اطہر ہاپوڑی جن کو امیر و جلال و تسلیم کی ہم نشینی و صحبت کا فخر حاصل ہے فرماتے ہیں "میں حضرتِ تسلیم کی خدمت میں ۱۰، ۱۲ سال حاضر رہا وہ مطبع سرکاری کی پشت پر ایک مکان میں رہتے تھے نہایت نیک طینت، خوش مزاج، باوضع بزرگ تھے ثقل سماعت کے باعث بہت اونچا سنتے تھے۔

تلامذہ - ان کے تلامذہ میں مولانا حسرت موہانی، عرش گیاوی، حاجی محمد اسماعیل صبر اور مولانا اصغر گونڈوی بہت مشہور ہوئے، کلام میں عجب کیف و لطافت اور زبان میں ایک شیرینی و حلاوت پائی جاتی ہے۔

ان کے تین دیوان نظم ارجمند، ۲۔ نظم دل افروز ۔ ۳۔ دفتر خیال اور متعدد مثنویاں ہیں۔

۳۔ مفتی منشی امیر احمد امیر مینائی:- امیر احمد نام امیر تخلص، مولوی کرم احمد کے صاحبزادے اور لکھنؤ کے باشندے تھے، سلسلۂ نصب حضرت مخدوم شاہ مینا سے ملتا ہے۔ آپ نے درسی کتب مفتی سعد اللہ مرحوم سے اور تکمیل علم علمائے فرنگی محل سے کی۔ شعر و شاعری کا شوق ہوا میر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کے شاگرد ہوگئے۔ بعض فنون، طب، جعفر اور نجوم وغیرہ سے خوب واقف تھے۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں ان کو حضرت امیر شاہ سے بیعت و خلافت حاصل تھی ۱۲۶۹ھ میں واجد علی شاہِ اودھ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور آپ نے دو کتابیں، ارشاد السلطان اور ہدایۃ السلطان ان کے سامنے پیش کیں اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔ غدر کے بعد انگریزی ملازمت کا ارادہ کیا پھر بعد میں خود ہی ترک فرما دیا۔ ۱۲۷۴ھ میں نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور نے ان کی شہرت اور قابلیت کا غلغلہ سن کر رام پور یاد فرمایا اور حاکم دیوانی مقرر کردیا اور آخر میں اسیر کے انتقال کے بعد اُن سے مشورۂ سخن بھی کرنے لگے۔ نواب یوسف علی خاں کے بعد جب نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو ان کی فیاضی اور قدر دانی نے تمام مشہور شعراء، علماء، اور اطباء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ نواب کلب علی خاں نواب تخلص کرتے اور منشی صاحب سے مشورۂ سخن کرتے۔ ان کی یہ غزل مشہور ہے اور خوب ہے:-

میں نے کہا کہ دعوئے اُلفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

رام پور میں تقریباً ۲۳ سال قیام رہا لیکن نواب کلب علی خاں کے انتقال اور جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کے بعد انھیں رام پور چھوڑنا پڑا، جنرل عظیم الدین خاں ان کے خاص عقیدت مند اور پرستارانِ کمال میں سے تھے اور انھوں نے امیر اللغات کی سرپرستی قبول فرمائی تھی۔ اس کے بعد داغ کے اصرار پر آغاز ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہیں چند ماہ علیل رہکر مرضِ ذیابیطس میں ۱۳۱۸ھ میں عالمِ بقا کی طرف رحلت فرمائی۔

منشی صاحب مرحوم کی وضع عالمانہ و درویشانہ تھی، نہایت نیک طبع، مہذب و متین، فرشتہ خصلت پابندِ صوم و صلوٰۃ

اور عالمِ باعمل تھے۔ کبھی آج تک کسی کی غیبت نہیں کی، احباب سے انکساری سے ملتے اور شاگردوں سے نہایت شفقت سے پیش آتے۔ مولانا اطہر فرماتے ہیں کہ "میں منشی صاحب کی خدمتِ اقدس میں اکثر آتا جاتا، نہایت منکسر المزاج، متواضع، متین و سنجیدہ بزرگ تھے، شام کو ان کے مکان پر احباب اور تلامذہ کا مجمع رہتا، منشی صاحب پیرانہ سالی کے سبب چھپر کھٹ پر تشریف رکھتے اور ان کے چاروں، مونڈھے اور کرسیاں بچھی ہوتیں جن پر ہر شخص قرینے سے بیٹھا ہوتا۔ چھپر کھٹ کے قریب ایک چھوٹی میز اور کرسی بچھی ہوتی جس پر حافظ جلیل حسن جلیل مان پوری بیٹھتے اور میز پر غزلیات کا بستہ ہوتا جو اصلاح کے لئے آتیں، وہ غزل پڑھتے جاتے اور منشی صاحب سنتے جاتے اور اصلاح دیتے، مشکل سے کسی غزل میں ۵، ۶ منٹ صرف ہوتے، اصلاح بہت عمدہ اور جلد دیتے۔"

تلامذہ: ان کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے جو بہت زیادہ مشہور ہیں ان میں ان کے دو صاحبزادے منشی محمد احمد صریر مینائی منشی لطیف احمد اختر مینائی اور منشی سید ریاض احمد ریاض خیرآبادی، فصاحت جنگ جلیل مان پوری، سید محمد عسکری وسیم، خیرآبادی، حکیم افتخار حسین جگر بسوانی، مولوی محمد محسن کاکوروی، بینظیر شاہ، راز رام پوری، سید زاہد حسین زاہد سہارنپوری، حافظ محمد علی حفیظ جون پوری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی، احسان اللہ خاں ثاقب بدایونی، نواب سلیمان خاں اسد، حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری کثیر التلامذہ اور مشہور شاعر اور صاحبِ دیوان مضطر خیرآبادی تم سندیلوی نے بھی چند غزلیں ان کو دکھائیں۔

تصانیف: دو عاشقانہ دیوان، مراۃ الغیب اور صنم خانۂ عشق اور نعت میں محامدِ خاتم النبین اور نثر میں سرمۂ بصیرت۔ بہار ہند انتخاب یادگار۔ نورِ تجلی اور ابرِ کرم مثنویاں ہیں، اس کے علاوہ اور کئی ایک تصانیف ہیں۔

امیر اللغات، جلد اول و دوم۔ ان کا مشہور کارنامہ ہے۔

کلام میں، مضمون آفرینی، نزاکت، صفائی اور شاعرانہ لطافت پائی جاتی ہے۔

۴۔ فصیح الملک داغ کی سوانح حیات کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھتا ہوں کہ ان کے حالات آپ اسی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے

۵۔ **حکیم ضامن علی جلال لکھنوی:** حکیم ضامن علی جلال، حکیم اصغر علی کے صاحبزادے اور خاص لکھنؤ کے باشندے تھے۔ حکیم صاحب کے والد نواب یوسف علی خاں ناظم کے یہاں داستان گوئی کے عہدہ پر ممتاز تھے اور دادا حکیم سید حسن خاں بزمرۂ اطباء شاہی شفا خانہ لکھنؤ ملازم تھے۔ مدرسۂ شاہی میں تعلیم حاصل کی۔ عربی میں مبتدی اور فارسی میں متعدد کتابیں پڑھیں۔ ابتدائے سنِ شعور سے شعر کا شوق پیدا ہوا، ابتداً امیر علی خاں ہلال تلمیذ میر علی اوسط رشک کے شاگرد ہوئے، اس کے بعد رشک کو اپنا کلام دکھایا جب رشک کربلائے معلیٰ گئے تو مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے۔ جب غدر ہوا تو حکیم صاحب رام پور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے جب ان کا انتقال ہوگیا تو کلب علی خاں جن کو اردو زبان کی خدمت ملحوظ تھی اچھے اچھے اردو شعراء کو جمع کیا چنانچہ ان میں حکیم جلال بھی تھے ان کی رام پور میں بہت قدر ہوئی۔ جب نواب صاحب کا انتقال ہوگیا تو وہ نواب منگرول کے دربار سے وابستہ ہوگئے آخر زمانہ لکھنؤ میں بہت پریشانی میں بسر ہوا۔ حکیم صاحب کی دو بیویاں تھیں انھوں نے اور جان ضیق میں کر دی تھی۔ حکیم صاحب کو اپنے فن اور زبان اور تحقیق پر بڑا ناز تھا اور اسی وجہ سے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ نواب صاحب کے دربار میں جب تمام شعراء جمع ہوتے اور الفاظ کی تحقیق پر بحث ہوتی تو حکیم جلال جس لفظ پر اڑ جاتے اس سے ہرگز نہ ہٹتے، نواب صاحب جب کسی لفظ کے متعلق غیاث کا حوالہ دیتے تو حکیم صاحب فرماتے "ملا غیاث کیا جانے"، منشی امیر اللہ تسلیم کے حوالہ سے مولانا اطہر ہاپوڑی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کسی لفظ کے متعلق بحث چھڑی ہوئی تھی، نواب صاحب نے حکیم صاحب

سے فرمایا کہ ملا غیاث تو یوں فرماتے ہیں، حکیم صاحب نے کہا کہ "غیاث اُلّو کا پٹھا کیا جانے" نواب صاحب یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہوگئے اس لئے کہ ملا غیاث نے نواب صاحب کو پڑھایا تھا۔ انھوں نے ایک چوب دار کو اشارہ کردیا اور خود غصّہ میں اندر تشریف لے گئے پھر جو ناگوار واقعہ پیش آیا وہ نا قابلِ بیان ہے۔ امیر، داغ و تسلیم وغیرہ سب موجود تھے ایک شور و غل بلند ہوا نواب صاحب باہر آگئے اور بے خبر بن کر اس واقعہ پر بہت افسوس کیا اور چوب دار کو بہت سخت و سست کہا اور سزا دی"

حکیم صاحب کہا کرتے کہ "امیر مینائی امیٹھی کے رہنے والے زبان کیا جانیں اور تسلیم فیض آباد میں پیدا ہوئے، میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، زبان میری ہے، داغ کو فن و تحقیق سے کیا واسطہ وہ سطحی قابلیت کے آدمی ہیں" چنانچہ مولوی ظہیرالدین احسن شوق نیموی شاگردِ تسلیم نے ان کے غرور کو خاک میں ملانے کے لئے ایک رسالہ اصلاحِ شوق مع الیضاح طیار کیا جس میں ان کی غلطیوں کو منظرِ عام پر لاکر ان کی اچھی طرح خبر لی، یہ رسالہ حکیم صاحب ہی کے زمانہ میں چھپ گیا تھا دوسرا اڈیشن مولانا حسرت موہانی نے شایع کرایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عروض اور فن تحقیق کے امام تھے۔ مولوی امیراللہ تسلیم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے غدر کے زمانہ میں مسجد میں بیٹھ کر عروض یاد کیا مگر یاد نہیں ہوا، اس کو ہم میں جلال سے بہتر کوئی نہیں جانتا ہے۔ جلال ہیچو منِ دیگرے نیست، قسم کے آدمی تھے مگر زبان اور فن پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

تصانیف:۔ ان کے چار دیوان ۱۔ شاہد شوخ طبع، ۲۔ کرشمہ گاہ سخن معروف بہ زبان حال، ۳۔ مضمون ہائے دلکش خیالات بے مثال، ۴۔ نظم نگارین حسنِ مقال شایع ہو چکے ہیں۔

نثر اور فن پر ۱۔ سرمایۂ زبانِ اُردو، ۲۔ قواعد المنتخب، ۳۔ مفید الشعراء، ۴۔ دستور الفصحا وغیرہ موجود ہیں۔ ۱۹۰۹ء میں بعارضہ تنفس انتقال ہوا۔

تلامذہ میں خود ان کے صاحبزادے حکیم مہدی حسن کمال، میر ذاکر حسین یاس لکھنوی اور ان کے صاحبزادے انور حسین آرزو لکھنوی۔ سردار اودہم سنگھ۔ احسان علی خاں احسان شاہجہاں پوری بہت مشہور ہوئے۔

اب مجموعی طور پر ان شعراء کی ہر صنف سخن پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

نعت:۔ بجز امیر مینائی کے اس صنفِ سخن کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ان کا ایک مستقل دیوان "محامد خاتم النبین" نعت میں موجود ہے لیکن وہی لکھنوی آرٹ کا نمونہ ہے۔

قصیدہ:۔ ان تمام حضرات نے قصیدے کہے ہیں۔ داغ اور جلال کے قصیدوں میں وہ ادبی شان اور زور نہیں جو ہونا چاہئے، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صرف خوشنودی مزاج کے لئے کہے گئے ہیں۔

امیر مینائی اور تسلیم کے قصیدوں میں بلاغت، مضمون آرائی اور رنگینی ضرور ہے مگر وہ شکوہ الفاظ اور زور جو قصیدہ کی جان ہے مطلق نہیں بلکہ غزل کا رنگ غالب ہے۔

منیر نے ان میں سب سے زیادہ قصیدے کہے ہیں اور ان کے قصیدوں میں شکوہِ الفاظ، طمطراق اور جملہ ادبی شان پائی جاتی ہے۔ مگر رعایت لفظی، تشبیہات اور استعارات کی بھرمار ہے، بہر حال ذوق کے بعد ان کے قصاید قابلِ قدر ہیں، اور اس صنف میں ان کے معاصرین میں ان کا درجہ بلند ہے۔

مرثیہ:۔ داغ، امیر، جلال اور تسلیم نے مرثیے نہیں کہے۔ منیر نے کچھ مراثی کہے ہیں وہ چنداں قابلِ ذکر نہیں۔

تاریخ و قطعات:۔ جلال نے کثرت سے تاریخ و قطعات کہے ہیں ان کو اس میں بڑا ملکہ تھا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ انکے استاد میر رشک کو اس صنف پر کمال اور یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ باقی حضرات نے جو تاریخیں لکھی ہیں وہ صرف فرمایشی ہیں

مثنوی :- داغ نے صرف ایک مثنوی "فریاد داغ" لکھی ہے جس میں اپنے عشق کا واقعہ نظم کیا ہے یہ مثنوی ۸ سو سے کچھ زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس واقعہ کا تعلق خود ان ہی کی ذات سے ہے اس لئے اس میں زیادہ سوز و گداز ہونا چاہئے مگر کوئی تاثیر نہیں ہے بلکہ سادگی و صفائی ضرور ہے جو ان کا فطری رنگ ہے اس کے بعض بعض اشعار تبذل بھی ہیں۔

امیر مینائی نے نورِ تجلی اور ابرِ کرم دو مثنویاں لکھی ہیں جو اخلاقی حکایات و روایات پر مشتمل ہیں اور ان میں کوئی خاص بات نہیں، جلال نے کوئی مثنوی نہیں لکھی، منیر نے ایک مثنوی "معراج المضامین" ضرور لکھی ہے مگر قابلِ ذکر نہیں۔

تسلیم کو مثنوی پر خدا داد قدرت حاصل تھی اور وہ اس صنفِ سخن پر اپنے معاصرین پر فضیلت و برتر رکھتے ہیں انھوں نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں، جن میں زبان کی خوبی اور دلآویزی اور کیف و اثر پایا جاتا ہے۔ نالۂ تسلیم اور شامِ غریباں انکے پہلے دیوان کے ساتھ طبع ہوچکی ہیں، اس کے علاوہ مجِ خزاں، دل و جاں، نغمۂ بلبل، شوکت شاہ جہانی وغیرہ انکی قابلِ قدر مثنویاں ہیں۔

غزل :- غزل ان شعراء کی خاص اور محبوب صنفِ سخن رہی ہے جس میں ان حضرات نے اپنی عمریں گزار دیں اور اپنی قوتِ فکر اور طبعِ رسا سے اس صنف کو ترقی ہی نہیں دی بلکہ اس صنف کو معراجِ کمال پر پہونچا دیا۔

۱- **اعلیٰ جذبات و خیالات :-** امیر مینائی اور تسلیم کے یہاں بہ نسبت داغ، جلال اور منیر کے زیادہ اعلیٰ خیالات ملتے ہیں۔

۲- **سوز و گداز :-** سوز و گداز نہ داغ کے یہاں ہے نہ امیر کے یہاں لیکن خال خال ایک آدھ شعر مل جاتا ہے۔ تسلیم کے یہاں کچھ کیفیتیں ملتی ہیں وہ شاید مومن کے سلسلہ کا اثر ہے۔

جلال اور منیر کے کلام میں مطلق سوز و گداز نہیں شاید یہ پُرگوئی اور فن کا سبب ہے۔

۳- **روزمرہ و محاورات و لطفِ زبان :-** اس میں داغ کو سب پر فوقیت و برتری حاصل ہے اور کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ جلال بھی محاورہ کو بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں مگر داغ کے برابر نہیں۔

۴- **لوچ اور شیرینیٔ زبان :-** سب سے زیادہ امیر و تسلیم کے یہاں ہے۔

۵- **نزاکت اور دلآویزی :-** اس میں امیر کو سب پر فضیلت حاصل ہے بعد کو تسلیم کا نمبر ہے۔

۶- **سادگی و صفائی :-** اس میں داغ سب سے آگے ہیں۔

۷- **بندش کی چستی :-** سب سے زیادہ جلال کے یہاں ہے اور یہ چیز اُن کو اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔

۸- **فارسی ترکیب و الفاظ :-** داغ فارسی تراکیب سے بالکل کام نہیں لیتے ہیں اس کے بعد امیر کا نمبر ہے وہ بھی بہت کم فارسی تراکیب کا استعمال کرتے ہیں، جلال اور تسلیم فارسی تراکیب اور الفاظ سے ضرور کام لیتے ہیں اور بڑے سلیقے سے تسلیم نے جہاں فارسی ترکیب اور الفاظ سے کام لیا ہے وہاں بڑی خوبی کے ساتھ کام لیا ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے مثلاً

۱- کام اپنا کر چکی بیماریٔ عشقِ بتاں   میں فریبِ نسخۂ تاثیرِ درماں ہی رہا

۲- اللہ رے اضطرابِ تمنائے دیدِ یار   فرصت میں اک نگاہ کی سو بار دیکھنا

منیر شکوہ آبادی بھی کثرت سے فارسی تراکیب و الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر بھونڈے پن سے۔

۹- **متانت و سنجیدگی :-** داغ کے یہاں متانت و سنجیدگی اگرچہ بہت کم ہے مگر لطفِ زبان اور اسلوبِ بیان اس کو کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔

انفرادی خصوصیت - داغ فطری شاعر تھے وہ غزل کیلئے پیدا ہوئے تھے غزل انکے لئے۔ انکی زبان غزل کی جان ہے حُسن و عشق کی چاشنی اور معاملہ بندی کی سرور انگیز کیفیتیں جو اُن کے یہاں ہیں وہ کسی کے یہاں نہیں، سلاست، سادگی، صفائی، بے ساختگی اور شوخی

ان کو جملہ معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔

امیر مینائی، صاحبِ علم و فن، تمام اصنافِ سخن پر قادر اور استاد ہی نہیں بلکہ استاد گر تھے۔

تسلیم، مضامین کی دل آویزی اور فارسی تراکیب میں سب سے آگے ہیں۔

جلال، استادِ فن و تحقیق، ماہرِ زبان و محاورات اور زبردست عروضی تھے۔

منیر، ان کو پرگوئی میں کمال حاصل تھا۔

اب حسب ذیل ہم طرح کلام سے داغ اور ان کے معاصرین کی قوتِ فکر، جدتِ خیال، اسلوبِ بیان اور لطفِ زبان کا اندازہ لگا کے خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کون سا شعر اچھا ہے؟ میں نے صرف وہی اشعار پیش کرنے کی سعی کی جو کسی حد تک متحد المضامین ہیں، ورنہ سیکڑوں اشعار ہم طرح ہیں مگر تخیل کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔

داغ: یاں امتحانِ برقِ تجلی ضرور تھا / کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا

امیر: اے برقِ حسنِ یار! یہ اچھا ظہور تھا / دیدار کو کلیم تھے۔ جلنے کو طور تھا ✓

جلال: میں اک جھلک سے ہوں گا نہ غش وہ کلیم تھے / میں اِک شرر سے خاک نہ ہوں گا وہ طور تھا

داغ: ہم بوسہ لے کے ان سے عجب چال چل گئے / یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا

امیر: لپٹا میں بوسہ لے کے تو بولے کہ دیکھئے / یہ دوسری خطا ہے وہ پہلا قصور تھا

جلال: رکھا خطائے یار کو پوشیدہ عشق نے / تشہیر ہونے کے لئے میرا قصور تھا

داغ: کرنی پڑیں فراق میں بیمار داریاں / ہاتھوں میں ساری رات دلِ ناصبور تھا

امیر: فرقت میں کیوں نہ تھا کسی کروٹ مجھے قرار / کیا دونوں پہلوؤں میں دلِ ناصبور تھا

جلال: ٹالا جہاں کو وعدۂ فردا پہ یار نے / مانا نہ ایک جس نے وہ میں ناصبور تھا

داغ: منزل پہ جو پہونچے تو لے قیس کو لیلیٰ / ناقے سے جدا کیا کبھی محمل نہیں ہوتا

امیر: اُڑتا بھی ہوا سے ہے تو اُڑتا ہے ادھر ہی / لیلےٰ سے الگ پردۂ محمل نہیں ہوتا

تسلیم: اے قیس حزیں آہ کے جھونکوں سے اُلٹ دے / کچھ بارِ گراں پردۂ محمل نہیں ہوتا

جلال: اے قیس اُٹھے پردۂ غفلت تو ذرا دیکھ / ہوتا بھی ہے یا پردۂ محمل نہیں ہوتا

داغ: فرقت میں ہم نے اپنی تسلی کے واسطے / رکھا ہے شوخ نام دلِ بے قرار کا ✓

امیر: آئینہ دیکھتے ہی وہ خود لوٹ ہو گئے / آخر پڑا ہے صبر دلِ بے قرار کا

جلال: قابو سے اپنے ہم تو نکلنے نہ دیں کبھی / جب تھامنا بھی آئے دلِ بے قرار کا

داغ: کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا / ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا ✓

امیر: مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا / یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

داغ: ترے وعدہ پر ستم گر ابھی اور صبر کرتے / اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

امیر: میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہدوں / اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

داغ: کیا سر زمین کوچۂ قاتل ہے فتنہ خیز، / اُڑنے لگے ہوا کی طرح ہوش نقش پا

امیر: اس گرم رو کی شوخیِ رفتار سے امیر / اُڑتے ہیں رنگِ رخ کی طرح ہوش نقش پا

منیر: انداز تیری چال کی ہرگز نہ پا سکا / مثلِ غبارِ راہ اُڑے ہوشِ نقشِ پا

داغ :-	خدا نے بخش دئے حشر میں بہت عاشق	خیالِ یار میں کوئی نہ بے قصور آیا
جلال :-	سُنا جو اس نے کہ مرتے ہیں ہم تو خوش ہوکر	وہ بخشوانے کو کیا اپنے سب قصور آیا
تسلیم :-	بڑی امید تھی محشر میں سامنا ہوگا	وہاں بھی کام نہ میرے، مرا قصور آیا
داغ :-	جاں نثاروں کو نہ دیکھا یہ بہانہ رکھ کر	جان پر کھیلنے والوں کا تماشا کیسا
جلال :-	دیکھو ڈر جاؤ گے، دم توڑتے دیکھو نہ مجھے	جان پر کھیلنے والوں کا تماشا کیسا
داغ :-	ہم نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھدیا	پھر کلیجہ رکھدیا، دل رکھدیا، سر رکھدیا
امیر :-	شوق سے میں نے جو خنجر کے تلے سر رکھدیا	چھیڑنے کو ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھدیا
جلال :-	دوڑ کر ہم نے جو ان کے پاؤں پر سر رکھدیا	بولے ٹھکراکر کہاں پھوٹا مقدر رکھدیا
داغ :-	اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا	دوسرا نام ہے وہ بھی مری تنہائی کا
امیر :-	شوق۔ خلوت میں بھی ہے انجمن آرائی کا	آئینہ خانہ ہے گوشہ مری تنہائی کا
جلال :-	جلوہ جب اس کا نہ دیکھا تو دکھایا مجھ کو،	روزِ محشر نے بھی عالم شبِ تنہائی کا
منیر :-	بے کسی آپ سے باہر نہیں جانے دیتی	مجھ سے آباد ہے عالم شبِ تنہائی کا
داغ :-	چھوٹ کر کنجِ قفس سے بھی یہ کھٹکا نہ گیا	جب صبا آئی تو جانا، وہی صیاد آیا
جلال :-	کہتے ہیں مرغِ چمن ہم کو یہی لے نہ اُڑے	شک ہے جھونکے پہ صبا کے بھی کہ صیاد آیا
منیر :-	اس چمن میں ہوسِ قید بھی نکلی نہ کبھی	پتے کھڑکے جو مرے خواب میں صیاد آیا
داغ :-	دیں و دُنیا کے مزے جب تھے کہ دو دل ہوتے	ایک میں کفر اگر ایک میں ایماں ہوتا
امیر :-	حلقہ زلف میں وہ رُخ جو جھلک دکھلاتا	جلوہ گر کفر کی آغوش میں ایماں ہوتا
داغ :-	حشر کے روز تجھے پاسِ عدالت ہوگا	بخشش دیتا جو یہیں جرم۔ تو احساں ہوتا
امیر :-	جب وہی حور نہیں خلد میں تولے داورِ حشر	جھونک دیتا مجھے دوزخ میں تو احساں ہوتا
داغ :-	ایک ہی شکوہ میں ساماں، وصل کا برہم ہوا	کیا ہنسی میں رنج پھیلا، کیا خوشی میں غم ہوا
تسلیم :-	شب گھٹی ہر بار دارِ عشق محوِ غم ہوا	رُک گئیں آہیں مزاجِ آرزو برہم ہوا
داغ :-	بے اثر ہو تو بھی طوفاں ہو، نہیں دریا تو ہو	حسرت اُس آنسو پہ ہے جو قطرۂ شبنم ہوا
جلال :-	رات گزری تھی چمن میں صبح ہوتے اُٹھ گیا	آب و دانہ بلبلوں کا قطرۂ شبنم ہوا
داغ :-	بنا کس دن تنِ مجنوں میں یہ رشتہ رگِ جاں کا	جنوں تیرے ہی سر سہرا رہا تارِ گریباں کا
امیر :-	مرے ہی سامنے دامن اُٹھاکر ناز سے چلنا	مجھی سے پھر گلہ اٹھا مرے چاکِ گریباں کا
جلال :-	فراغت اے جنوں سب کو ملی تھی ہم کو دل تنگی	کچھ اس میں سے بھی حصہ ہوگیا اپنے گریباں کا
منیر :-	اگر چھوڑ وادی آزادی علاقہ بند و زنداں کا	الف کھنچوائے ماتھے پر جنوں چاک گریباں کا

منیر نے ۳۲ اشعار کی غزل کہی ہے جس میں صرف گریباں کا قافیہ، عطف و اضافت کے ساتھ نظم کیا ہے اس پر بھی حوصلہ نہیں نکلا چنانچہ فرماتے ہیں :-

	منیر افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت کا	نہیں تو لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا
داغ :-	اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا	میں جاؤں گا اگر مرا سایا نہ جائے گا

امیر :- گھر میں تمہارے غیر سے جایا نہ جائے گا — آغوشِ نور میں کبھی سایا نہ جائے گا

داغ :- دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں آگیا یقیں، — تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

امیر :- لاؤں میں اس سے دل میں کدورت محال ہے — یہ لعل خاک میں تو ملایا نہ جائے گا

داغ :- کیا ذوق ہے کیا شوق ہے، سو مرتبہ دیکھوں — پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

امیر :- آنکھوں نے جو دیکھا اسے تو دل نے پکارا — میں نے ابھی اے جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

داغ :- اب کئی دن سے وہ رسم و راہ بھی موقوف ہو — ورنہ برسوں نامہ بر آتا رہا جاتا رہا،

امیر :- آنے والا، جانے والا، بے کسی میں کون تھا — ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا

داغ :- نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا — تمہاری برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا

جلال :- مری تڑپ نے نہ آنے دیا قریب انھیں — کہ برق گرتی تھی اندازِ اضطراب نہ تھا

داغ :- نہ پوچھ مجھ سے مرے جرم داورِ محشر — مرے گناہوں کا دُنیا میں بھی حساب نہ تھا

جلال :- گناہ بولے جو گھبرا گیا میں محشر میں، — ابھی تو پرسشِ اعمال تھی حساب نہ تھا

داغ :- لن ترانی کی صدا حضرتِ موسیٰ نے سُنی — یوں نہ چھپتے، جو کوئی دیکھنے والا ہوتا

امیر :- جس نے بے پردہ سرِ طور پکارا آکر — چھپتے جب ہم کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

داغ :- بدگمانی نے نہ چاہا اُسے تنہا چھوڑوں — میں نے قاصد کو الگ راہ میں چلنے نہ دیا

جلال :- لاکھ احسان جنازے پہ گرانباری کے — دو قدم کوچۂ محبوب سے چلنے نہ دیا

داغ :- شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج — یہ برقِ بلا دیکھئے گرتی ہے کدھر آج

امیر :- شوخی سے ہے بے چین وہ بجلی سی نظر آج — کہتی ہے حیا دیکھئے گرتی ہے کدھر آج

منیر :- کیا جانیے کیا لطف ہے چلمن کے ادھر آج — جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج

داغ :- روکا ہی کیا رشک بٹھاتا رہی ضعف — بے تابیٔ دل لے ہی گئی غیر کے گھر آج

امیر :- گو جاتے ہیں آہستہ نزاکت سے وہ لیکن — دوڑی ہوئی جاتی ہے خوشی غیر کے گھر آج

جلال :- اے تاب و تواں آپ میں کہہ دوں گا کہ رخصت — پہونچا دو اُٹھا کر درِ دلدار سے گھر آج

داغ :- جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا — بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

امیر :- نویدِ وصل مٹاتی ہے دل کے داغوں کو — بہار لوٹتی ہے باغ کو خزاں کی طرح

داغ :- یہ صید گاہِ عشق ہے ٹھہرائیے نگاہ — صیاد مضطرب سے نہ ہوگا شکارِ دل

امیر :- ترچھی نظر نشانے پہ پڑتی نہیں کبھی — اے ترک اس ادا سے نہ ہوگا شکارِ دل

داغ :- پوچھئے کیا ہو کہ دیکھا شبِ وعدہ کیا کیا — تم سے تعبیر بن آئے وہ مرا خواب نہیں

جلال :- غفلتِ عشق کے عاشق ہی تماشا بیں ہیں — غیر کی آنکھ جسے دیکھے یہ وہ خواب نہیں

منیر :- سببِ مرگ ہے آسایشِ دلِ ناداں — جیتے جی دیکھے کوئی جس کو یہ وہ خواب نہیں

داغ :- آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار — کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

امیر :- اُٹھتا نہیں ہے اب تو قدم مجھ غریب کا — منزل سے کہہ دو دوڑ کے لے مجھ کو راہ میں

داغ :- دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

امیر :-	آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے	جس کے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ میں
جلال :-	شوخی، فریب، سحر، فسوں، لاگ، شعبدہ	کتنے کرشمے دیکھے تری اک نگاہ میں
داغ :-	دستِ گل چیں سے چھٹا آیا کفِ صیاد میں	میں گل بازی ہوں کیا اس گلشنِ ایجاد میں
امیر :-	پڑگئی کیا لوٹ یارب گلشنِ ایجاد میں	دستِ گل چیں میں ہے گل بلبل کفِ صیاد میں
داغ :-	کسی کا دل تو کیا شیشہ نہ ٹوٹا بادہ خواروں میں	یہ توبہ ٹوٹ کر کیوں جا ملی پرہیز گاروں میں
امیر :-	بہار آئی لنڈھاتے خم کے خم ہم بادہ خواروں میں	کہو توبہ سے چندے جا رہے پرہیز گاروں میں
داغ :-	خوشی مرگِ عدو کی لاکھ غم سے ہوگئی بدتر	مری آنکھوں نے دیکھا ہے کسی کو سوگواروں میں
امیر :-	جگر روتا ہے دل کو دل جگر کو۔ طرفہ ماتم ہے	وہ اس کے سوگواروں میں یہ اُس کے سوگواروں میں
جلال :-	وہ ماتم بزم شادی ہے تمھاری جس میں شرکت ہو	وہ مزا زندگی ہے تم جہاں ہو سوگواروں میں
داغ :-	راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں	اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
امیر :-	ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں	اب نہ باتوں میں مزا ہے نہ ملاقاتوں میں
داغ :-	اور سنئے ابھی رندوں سے جنابِ واعظ،	چل دئے آپ تو دو چار ہی صلواتوں میں
امیر :-	واعظ اب چھیڑ کے رندوں کو سُنا کرتے ہیں	کچھ مزا ملنے لگا ہے انھیں صلواتوں میں
داغ :-	ابرِ رحمت ہی برستا نظر آیا زاہد	خاک اُڑتی کبھی دیکھی نہ خرابات میں
امیر :-	مسجدوں میں ہیں یہ ہو حق کے کہاں ہنگامے	رنگِ توحید اُچھلتا ہے خرا باتوں میں
داغ :-	صاف کب امتحان لیتے ہیں	وہ تو دم دیکے جان لیتے ہیں
امیر :-	آزمایش میں جان لیتے ہیں	خوب آپ امتحان لیتے ہیں
داغ :-	ضد ہر اک بات پر نہیں اچھی	دوست کی دوست مان لیتے ہیں
امیر :-	میری ہر بات پر ہیں سو سو عذر	غیر کی خوب مان لیتے ہیں
داغ :-	دلوں پر سیکڑوں سکّے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں	کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں
امیر :-	وہ دل کی تاک میں جب شوق سے بن ٹھن کے بیٹھے ہیں	تو سو غمزوں سے دل پر تیر اُس چتون کے بیٹھے ہیں
داغ :-	نگاہِ شوخ چشمِ شوق میں در پردہ چھنتی ہے	کہ وہ چلمن میں ہیں، نزدیک ہم چلمن کے بیٹھے ہیں
امیر :-	نگاہِ شوق ایسی پردہ در ہے کچھ نہیں کھلتا	کہ چلمن کے اِدھر یا وہ اُدھر چلمن کے بیٹھے ہیں
داغ :-	عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو،	اور پھر ڈھونڈھتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو
جلال :-	شوق کی بے خودیوں نے یہ کیا گم مجھ کو	ڈھونڈھتا ہوں میں تمھیں ڈھونڈھتے ہو تم مجھ کو
داغ :-	دیکھنا پیرِ مغاں حضرتِ واعظ تو نہیں	کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھ کو
امیر :-	میں جو مرجاؤں تو اے پیرِ مغاں کہدینا	مُغبچے کھینچکے ڈال آئیں پسِ خم مجھکو،
جلال :-	یارب آباد رہیں زیرِ فلک بادہ پرست	لا کے مے خانے میں گاڑا ہے تہِ خم مجھکو،
داغ :-	معجزہ حضرتِ عیسیٰ کا غلط بھی تو نہیں	درد اُٹھتا ہے وہ کہتے ہیں اگر قم مجھکو
جلال :-	کشتہ اِک رشکِ مسیحا کے تغافل کا ہوں	جو قیامت بھی اُٹھائے تو کہے قم مجھکو
منیر :-	زندہ کرنے مجھے شاید وہ مسیحا آیا	ہوگئے کان کھڑے کس نے کہا قم مجھکو

داغ :- اپنے رونے پہ کچھ آیا جو تبسم مجھکو، — یاد نے اس کی کہا بھول گئے تم مجھ کو
جلال :- گریہ کیا جانے مرا زخم - میں کیا جانوں ہنسی — اس کو رونا میں بتا دوں، یہ تبسم مجھ کو
منیر :- خنجرِ ناز سے جب چھیڑتے ہو تم مجھ کو — دہنِ زخم سکھاتے ہیں تبسم مجھ کو

داغ :- غیر کے مذکور پر میرا بگڑنا تھا بجا، — ٹھہیرو ٹھہیرو، سنبھلو سنبھلو کیا سے کیا ہونے لگے
تسلیم :- وقتِ آخر ہے انھیں رخصت کرو تسلیم اب — کون جانے کیا ہو دم میں، کیا سے کیا ہونے لگے

داغ :- داغ میں پرچا ہی لوں گا باتوں باتوں میں انھیں — شرط یہ ہے میرا ان کا سامنا ہونے لگے
تسلیم :- چاہتا ہوں اتنی میں تاثیر اپنے عشق میں، — شرم کے اُٹھ جائیں پردے سامنا ہونے لگے

داغ :- آشوبِ حشر اُس بتِ خود سر سے کیا کہیں — محشر کا حال فتنۂ محشر سے کیا کہیں
امیر :- اس بُت کے جورِ خالقِ اکبر سے کیا کہیں — آپس کی چھیڑ داورِ محشر سے کیا کہیں

داغ :- یہ تو پوچھیں مرے مرقد پہ گزرنے والے — کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے
امیر :- اِک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہیں مرنے والے — او غریبوں کے مزاروں پہ گزرنے والے
جلال :- ترے سب ناز ہیں گو - زندہ ہی کرنے والے — ڈھونڈھ رکھتے ہیں بہانہ کوئی مرنے والے
منیر :- گزرے جائیں گے یوہیں جیسے گزرنے والے — تم سلامت رہو - جیتے رہیں مرنے والے

داغ :- خوش نوائی نے رکھا ہم کو امیر اے صیاد — ہم سے اچھے رہے صدقے میں اُترنے والے
منیر :- بُت بنے بیٹھے ہیں کس واسطے مرنے والے — کس کے صدقے میں یہ پتلے ہیں اُترنے والے

داغ :- یار کا پاسِ نزاکت دلِ ناشاد رہے — نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے
جلال :- زندگی بھر مزۂ ضبط فغاں یاد رہے — کوئی چٹکی بھی تو لے دل میں جو فریاد رہے
منیر :- ہڈیوں میں گزرِ نالہ و فریاد رہے — نیستاں نعرۂ شیرانہ سے آباد رہے

داغ :- کچھ نرالا ہے جوانی کا بناؤ — شوخیاں زیور ہیں اس سن کے لئے
امیر :- ہے جوانی خود جوانی کا سنگار — سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے

داغ :- فیصلہ ہو آج میرا آپ کا — یہ اُٹھا رکھا ہے کس دن کے لئے
امیر :- وصل کا دن اور اتنا مختصر — دن گنے جاتے تھے اُس دن کے لئے

داغ :- وہ نہیں سنتے ہماری کیا کریں — مانگتے تھے ہم دعا جن کے لئے
امیر :- ساری دُنیا کے ہیں وہ میرے سوا — میں نے دُنیا چھوڑ دی جن کے لئے

داغ :- بعد میرے کیوں نویدِ وصل یار آنے کو تھی — وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی
جلال :- باغ سے کرنے گیا صیاد کب مجھ کو اسیر — جب خزاں جانے کو تھی فصلِ بہار آنے کو تھی
تسلیم :- وائے قسمت کب کیا صیاد نے قیدِ قفس — ایضاً

داغ :- کہاں تھے رات کو ہم سے ذرا نگاہ ملے — تلاش میں ہو - کہ جھوٹا کوئی گواہ ملے
امیر :- دل و جگر کی تڑپ دیکھ کر وہ کہتے ہیں — کہ مدعی سے بھی چالاک یہ گواہ ملے
جلال :- پکار اُٹھوں جو دوبارہ تری نگاہ ملے — کہ دل کو لے گئی آنکھ اس کی دو گواہ ملے

داغ :- سب اہلِ حشر جب اپنے کئے کو پائیں گے — بڑا مزا ہو جو مجھ کو مرے گناہ ملے

امیر :- درِ کریم پہ محشر میں تاکہ راہ ملے — گنا ہگاروں میں چھپ چھپ کے بے گناہ ملے
جلال :- ہر ایک حشر میں ملتا تھا دوست سے اپنے — مجھے بھی ڈھونڈھ کے مجھ سے مرے گناہ ملے

داغ :- دِل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے — جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے
امیر :- گھبرا نہ ہجر میں بہت اے جانِ مضطرب — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

داغ :- تیرا غصہ ہو کہ ہو میری طبیعت ظالم — یہ بلائیں نہیں آئیں کبھی ٹلنے کے لئے
جلال :- ہم ازل ہی پکارے جو ملا بخت سیاہ — یہ بلا آئی ہے سر پہ سے نہ ٹلنے کے لئے

داغ :- خاک ٹھہرے ترے کوچے میں کوئی اے قاتل — مستعد نقشِ کفِ پا بھی ہے چلنے کے لئے
جلال :- رہبرِ جلوۂ گہ یار جو تو ہو اے شوق — ابھی موجود ہیں آنکھیں مری چلنے کے لئے

داغ :- بد دعا لگ گئی کیا تیرے مریضِ غم کی — چارہ گر مرتے ہیں، بیمار کا حال اچھا ہے
امیر :- میزباں مرتا ہے جہاں مزا کرتا ہے — دل کی حالت ہے بری، درد کا حال اچھا ہے
منیر :- ہے بگڑنا ہی سنبھلنا ترے بیماروں کا — لوگ سمجھے ہیں بُرا، اس کو جو حال اچھا ہے

داغ :- یا دکھا دو مجھے تم پاؤں کا ناخن اپنا — یا یہ کہدو مرے ناخن سے ہلال اچھا ہے،
امیر :- کہتے ہیں آج تو ناخن سے مرے دی تشبیہ — کل کہوگے مرے ابرو سے ہلال اچھا ہے

داغ :- بنا ہوں میں نفسِ واپسیں نقاہت سے — نہ آکے جانے کی طاقت نہ جاکے آنے کی
امیر :- نہ چوک وقت کو پا کرکے ہے یہ وہ معشوق — کبھی امید نہیں جس سے جاکے آنے کی
جلال :- ٹھہر رہی ہے جو آنکھوں میں جانِ وقتِ اخیر — یہ منتظر ہے کسی بے وفا کے آنے کی

امیر :- نہ سنے دردِ دل مرا نہ سنے — میں کہوں گا سنے وہ یا نہ سنے
داغ :- میری فریاد دوسرا نہ سنے — تم سنو اے بتو! خدا نہ سنے
امیر :- کسی نا آشنا کا کیا شکوہ — آشنا کی جب آشنا نہ سنے
داغ :- دوستی کیا اسی کو کہتے ہیں — آشنا کی جو آشنا نہ سنے

داغ :- دیدہ و دل میں اس لئے ہے فرق — ایک کا ایک ماجرا نہ سنے
امیر :- حال پھولوں کا جو خزاں نے کیا — کہیں بلبل وہ ماجرا نہ سنے
جلال :- شکوۂ غیر تو وہ سن لے گا — نہ سنے میرا ماجرا نہ سنے

داغ :- راز اپنا کبھی کہا نہ کہے — حال میرا کبھی سنا نہ سنے
امیر :- لاکھ دل چسپ ہی مرا قصہ — مگر اس نے کبھی سنا نہ سنے

داغ :- ہجر میں جو دعائیں مانگی ہیں، — کوئی اللہ کے سوا نہ سنے
امیر :- آہیں کرنا کہیں تو یوں اے دل — کوئی میرے ترے سوا نہ سنے

داغ :- چور ہو جاؤں مگر جاؤں نہ میخانے سے — عہد شیشے سے تو پیمان ہے پیمانے سے
امیر :- ساقیا جاتے ہیں پیاسے ترے میخانے سے — گھونٹ دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے

داغ :- دلِ برباد میں آباد ہوئے عشق و جنوں — کون بستی نہیں بہتر مرے ویرانے سے
امیر :- مرے ہی دل سے پڑی خانہ خرابی کی بنا — گھر تباہی کا ہے آباد اسی ویرانے سے

طرزِ داغ میں رنگِ مومن کی جھلکیاں

(پروفیسر وقار عظیم)

روایت کی مستحکم بنیاد اور شخصیت کے پرتو کی رنگینی ۔ یہ دو عناصر ہیں جن کے صحیح امتزاج کے بغیر نہ کوئی فنی تخلیق وجود میں آتی ہے اور نہ بامعنی بنتی ہے ۔ بامعنی بننے سے میری مراد اس فنی تخلیق کے اُس حسن سے ہے جس کی بدولت اس فن پارہ کو فنی روایت کے تسلسل میں ایک حیثیت حاصل ہوتی ہے، ایک مقام اور درجہ ملتا ہے ۔ روایت کی جو زنجیر ان گنت کڑیوں کے جُڑنے سے بنتی ہے اُس کا حصہ صرف وہی چیزیں بن سکتی ہیں جن میں روایت کا رچاؤ اور شخصیت کی گھلاوٹ میں مل جل کر اپنا عمل کرتے ہیں ۔ دونوں میں سے کسی کی قوت میں بھی کمی ہوتی ہے تو نتیجہ کسی ایسی تخلیق کی صورت اختیار کرتا ہے جو امتداد زمانہ کے تھپیڑوں کی تاب نہیں لاسکتی ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی فن کار کے تخلیقی سرمایہ کا جایزہ لینے کی طیاری کرتے ہیں تو اور بہت سے معیاروں میں سے یہ دو معیار خاص کر ہماری رہنمائی کرتے ہیں ۔

داغ کی غزلوں کو ان دو معیاروں کی کسوٹی پر کسا جائے تو دو چیزیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ ایک یہ کہ یہ غزلیں حرف بہ حرف غزل کی روایت کی ہم رنگی میں ڈوبی ہوئی ہیں اور دوسرے شاعر کی شخصیت کی انفرادیت اور توانائی نے روایت کے رنگ پر اپنا رنگ چڑھاکر غزل کو ایسی صورت دی ہے جو اس سے پہلے اُسے نہیں ملی تھی ۔ لیکن یہی بات شاید ہر غزل گو شاعر کے متعلق کہی جاسکتی ہے، یا کم از کم ہر اچھے غزل گو کے متعلق کہی جاسکتی ہے ۔ ہر اچھے غزل گو کی غزل کسی نہ کسی انداز سے روایت کی اس ہمہ رنگی اور شخصیت کی انفرادیت کا امتزاج اور عکس ہے ۔ اس لئے ایک غزل گو اور دوسرے غزل گو میں امتیاز کرنے کے لئے جہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کس نے ہم رنگ روایت کے کسی پہلو سے تاثر قبول کیا ہے وہاں یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ اس خاص شاعر کی شخصیت کے انفرادی پہلو کیا کیا ہیں اور ان کی پرورش کسی خاص طرح کے ماحول اور فضا میں ہوئی ہے ۔ گویا شخصیت کی انفرادیت کا جایزہ ہمیں لازمی طور پر ماحول کے جایزہ کی طرف رجوع اور مائل کرتا ہے ——— داغ کی غزل میں روایت کے عناصر کی تلاش میں ہمیں زیادہ دیر سرگرداں نہیں رہنا پڑتا ۔ اپنے سفر کی پہلی ہی منزل میں ہمارے سامنے کچھ ایسے غزل گو آجاتے ہیں جن کے نغموں کی گونج خود داغ نے بھی سنی تھی، اُس کے مزے کے لئے اور اپنے مزاج کا جزو بنایا تھا ۔ میرا اشارہ غالب، مومن، ذوق، ظفر اور شیفتہ کی طرف ہے ۔ ہماری غزل ولی، میر، درد، یقین اور مصحفی کے ہاتھوں بنتی، سنورتی اور نکھرتی جب ان شاعروں کے دور تک پہونچی تو ان میں سے بعض نے اس کی روایت کو اپنی قوی، توانا اور موثر شخصیتوں کے رنگ میں رنگ کر اُسے نئی صورتیں دیں اور غزل جو اب تک فلسفیانہ تخیل اور ندرتِ اظہار کو یکجا دیکھنے کی عادی نہیں تھی غالب کی بدولت اس نئے انداز سے آشنا ہوئی جس غزل نے ابتک محبوب کا شرف صرف عورت کو دینے سے اجتناب کیا تھا مومن کی بدولت تغزل کے اُس مفہوم کی سرمایہ دار بنی جو مومن سے پہلے غزل کو کسی اور نے نہیں دیا تھا ۔ ذوق کی زبان دانی اور ظفر کی دردمندی سے بھی غزل کو کچھ نہ کچھ ایسا ملا کہ جو کوئی

اس دور کی غزل پر نظر ڈالتا ہے، اُسے اس میں کچھ امتیازی باتیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ یہی امتیازی باتیں ہیں جو اور بہت سی چیزوں کے ساتھ داغ کے پاس غزل کی روایت کا قصہ بن کر پہونچی ہیں۔ داغ نے ان سے اثر قبول کیا اور اس اثر کا عکس اُن کی غزلوں میں بہت سے پردوں کے باوجود جھلکتا ہے لیکن جو رنگ تمام رنگوں سے زیادہ شوخ اور نمایاں ہے وہ مومن کا تغزل ہے۔ مومن کے تغزل میں بنیادی طور پر کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے داغ کو طبعی مناسبت ہے۔ یہ مناسبت کبھی کبھی تو ایسی صورت میں جلوہ ریز ہوتی ہے کہ مومن اور داغ میں فرق کرنا دشوار ہوجاتا ہے لیکن اکثر اس تاثر کو داغ کے منفرد مزاج نے اپنا بنا لیا ہے۔ لیکن مومن کی عظیم تر شخصیت اور فن کار کی حیثیت سے اُنکا بلند تر مقام دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ داغ کی انفرادیت کے گہرے پردے بھی اُس کے جلووں کو چھپنے سے نہیں روک سکتے اور داغ کی غزل جہاں کہیں مومن سے متاثر ہوئی ہے زبانِ حال سے اس کا اظہار کرنے لگتی ہے۔

مطالعہ کی یہی منزل ہے جہاں آکر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ مومن کا تغزل کیا ہے اور اُس میں بنیادی طور پر کون سی ایسی باتیں ہیں جن سے داغ کو طبعی مناسبت ہے۔

مومن کے تغزل کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغزل کو روایت کا ایک عنصر اور جزو سمجھ کر کبھی رسمی انداز سے نہیں برتتے۔ اُنھوں نے ایک عورت کو اپنا محبوب بنایا ہے اور محبت کے اس رشتہ کی مختلف کڑیوں سے اپنے اندازِ تغزل کو حسن و دل فریبی دی ہے۔ جس طرح اُن کے عشق میں خلوص اور اُن کے محبوب کی دلبری و دلستانی کی ساری صفات کے باوجود ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور روک تھام ہے اور یہی خلوص، یہی رکھ رکھاؤ اور یہی روک تھام اکثر جگہ اُن کے رنگِ تغزل میں نمایاں ہے۔ عورت کو بلا شرکت غیرے محبوبی کا یہ شرف دینے میں جرأت اُنکے پیش رو ہیں لیکن چونکہ جرأت کا عشق محبوب کی فطری شانِ بے نیازی کے احساس اور احترام سے ناآشنا اور محروم ہے اس لئے اُس عاشقی اور اُس محبوبی نے جس تغزل کی تخلیق کی ہے اُس پر بوالہوسی کی عریانی و بے باکی ہے۔ وہ حقیقت اور صداقت سے قریب ہوکر بھی شدت تاثیر سے خالی ہے۔ اس تغزل کو دوست رکھنے والا مسرت کی لطیف کیفیتوں کے بجائے اکثر شرمساری و خجالت سے اپنا دامن بھرتا ہے۔ مومن کے تغزل میں صحت مندی کا جو گہرا پرتو ہے وہ نہ صرف اُسے عشق و عاشقی کی دُنیا میں عالی مرتبہ بناتا ہے بلکہ شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی اُس میں ایک ایسی کشش پیدا کرتا ہے جو مومن سے پہلے کسی کے حصّہ میں نہیں آئی۔ مومن کے بعد البتہ بہت سوں نے اس سے اپنی جھولیاں بھری ہیں۔ مومن کے عشق کا یہی مخلصانہ انداز اور اس کے محبوب کا یہی غیر رسمی لیکن دل آویز تصور ہے جس نے مومن سے تغزل کے ایسے شعر کہلوائے ہیں:-

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ — دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
کیونکہ امید وفا سے ہو تسلّی دل کو — فکر ہے یہ کہ وہ وعدہ سے پشیماں ہوگا
پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے
خدا کی یاد دلاتے ہیں ہجر میں احباب — ہزار شکر کہ اس دم وہ بد گماں نہ ہوا
زانوے بُت پہ جان دی دیکھا، — مومن انجام و اختتام ہرا،
گر نہ تھی اے دل اُس کے رنج کی تاب — کیوں شکایت گزار ہونا تھا،
اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں — تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے
خنجر تو نہ توڑ سخت جانی، — پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

اِن شعروں کو پڑھ کر عشق و عاشقی کے جس رشتہ کا تصور سامنے آتا ہے اُس میں محبوب کا تصور اُس تصور سے بالکل مختلف ہے جو مومن سے پہلے کے شاعروں نے ہمیں دیا ہے۔ اس میں محبوب کے روایتی حسن و محبوبی کو چھوڑ کر شاعر اُس کا ذکر اس اندازِ خاص سے کرتا ہے کہ اُس کے دل کی دھڑکن ہر لفظ میں صاف سنائی دیتی ہے۔

داغ کا محبوب بھی اُردو شاعری کے روایتی محبوب سے مختلف ہے۔ لیکن مومن اور داغ کے محبوب میں اس بنیادی اشتراک کے علاوہ اور کوئی چیز مشترک نہیں۔ مومن کا محبوب پردہ نشین ہے اور اُسے وہ بہر صورت پردہ میں رکھنا چاہتے ہیں داغ کے محبوب کا شیوہ بے نقابی اور بے حجابی ہے۔ مومن کا محبوب اُنھیں کا محبوب ہے، وہ اگر دشمن کی طرف مایل بھی ہوتا ہے تو صرف اس لئے کہ محبت کی چنگاری اور تیز ہو، عشق کا شعلہ اور بھڑکے۔ اپنی دولتِ حُسن کو ہر ایک کی دولت بنانا داغ کے محبوب کا شیوۂ خاص ہے۔ اس محبوب کے متعلق داغ بڑی بے تکلفی سے اس طرح کی باتیں کہ دیتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ محبوب جیسا ہے سب پر روشن ہے۔ اُن کے چھپانے نہ چھپانے سے آخر فرق ہی کیا پڑے گا:-

چاہنے والے ہوں بُرے کہ بھلے — اُن کے دفتر میں نام ہے سب کا

خود محبوب کی دیدہ دلیری بھی ملاحظہ کیجئے:-

پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر — اک نئے آدمی سے ملنا تھا

جب محبوب ایسا ہو تو عاشق کی آزادی کا کیا کہنا۔ وہ کسی پر کیوں بند ہو اور کوئی اُس پر کیوں بند ہو:-

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں — تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا،

جیسے کو تیسا ہرجائی ہونا ایک کے حسن کا زیور ہے اور دوسرا بھی اسے اپنے عشق کی شان سمجھتا اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بناتا ہے۔

مومن اور داغ کے محبوب میں اور اس لئے دونوں کے اندازِ محبت میں جو فرق ہے اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے (اور ہوا بھی ہے) کہ محبوب کے متعلق، تصورِ عشق کے متعلق، عشق و محبت کی مختلف منزلوں اور نسبتوں کے متعلق دونوں شاعر جو کچھ کہیں وہ کسی طرح بھی ایک دوسرے کے مطابق نہ ہو۔ لیکن داغ کی شاعری کے مطالعہ سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ عشق اور محبوب کے متعلق اُن کا جو تصور اور جو نقطۂ نظر ہے اُس نے اُن کی شاعری کے پورے لہجہ کو متاثر کیا ہے اور یہ لہجہ اُن کا اپنا منفرد لہجہ ہے جو نہ داغ سے پہلے کسی اور شاعر کے کلام میں ہے اور نہ داغ کے اُن ہمعصروں میں سے کسی کے یہاں جنھوں نے داغ کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور دوسری یہ کہ اس منفرد لہجہ کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری کا ایک لہجہ اور ہے جو انھوں نے مومن کے تغزل سے متاثر ہو کر اپنایا اور اختیار کیا ہے۔ اور اس کا اظہار اُن کی شاعری میں طرح طرح سے ہوتا ہے۔

داغ کے لہجہ کا یہ عکس اُن شعروں میں بہت نمایاں ہے جن میں داغ محبوب سے مخاطب ہیں۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجئے:-

تم سلامت ہو تو ہر روز قیامت ہو گی — ہم بھی دیکھیں گے تماشا یہ تماشا کیسا

تمھارے واسطے میں غیر کو تنہا نہ چھوڑونگا — سمجھ لینا کہ دو مردے گڑیں گے ایک مدفن میں

تجھے کہاں رات کو آئینہ توڑ کر دیکھو — اور ہوتی ہے خطادار کی صورت کیسی

ہاتھ باندھے ہوئے اغیار کے ساتھ آؤ گے — ہم دکھا دیں گے مزا روزِ جزا ہونے دو

چاہت کا مزا بعد ہمارے نہ ملے گا — ہر شخص سے تم آپ کہو گے ہمیں چاہو

کہو کیا کرو گے مرے وصل کی   جو مشہور جھوٹی خبر ہوگئی

اب اس کے مقابلہ میں محبوب سے مومن کا اندازِ تخاطب دیکھئے:-

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں تھے   یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج وعذاب تھا
شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے   اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا،
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے   ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں   سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
تم بھی رہنے لگے خفا صاحب   کہیں سایہ مرا پڑا صاحب
کیوں لگے دینے خطِ آزادی   کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب
ستم، آزار، ظلم وجور وجفا   جو کیا سو بھلا کیا صاحب

کبھی کبھی داغ کے اندازِ تخاطب میں بھی مومن کے عجز، انکسار اور نیاز مندی کی جھلک نظر آجاتی ہے:-

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ   بس اے خانہ آباد دولت زیادہ
دل کہ ویرانہ ہوگیا بالکل،   اب بھی ہے تیری آرزو اس میں
مجھ سے بہتر مرا ملال رہا   کہ ترے دل میں مہ جمال رہا
تو نے جس دن سے کی مسیحائی   کوئی اچھا نظر نہیں آتا
سب مجھے دیوانہ بنانے لگے   لو وہ تمھارا ہی کہا ہوگیا
شوق نے آوارہ کیا تھا مجھے   خیر ہوئی میں ترے در پر گرا
کہو جب تم کہ ہے بیمار مرا   تو کیوں کر دور ہو آزار مرا
دل لینے کی تم کو آرزو تھی   اب جان سے اپنی لو گئے ہم
کچھ ترا شوق کچھ تری حسرت   اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں

ایک داغ وہ ہیں کہ جو محبوب کو یہ کہکر دھمکی دیتے ہیں کہ اگر تم نے رقیب سے اپنا ربط ضبط کم نہ کیا اور مجھ پر یوں ہی ظلم وستم ہوتے رہے تو سمجھ لو میں تو اس ظلم وستم کے ہاتھوں جان سے جاؤں گا لیکن رقیب کو بھی جیتا چھوڑ کر نہ جاؤنگا کہ تم اُس سے اپنے دل کے ارمان نکالو یا یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے کہ تم روزِ جزا آنے دو ہم تمھیں ایسا مزا چکھائیں گے کہ تم اور اغیار سب ایک ساتھ ہاتھ باندھے ہوئے آؤ گے۔ اُس سے وہ بڑی بے باکی سے وہ اس طرح کی باتیں بھی کر لیتے ہیں:-

کہو کیا کرو گے مرے وصل کی   جو مشہور جھوٹی خبر ہوگئی

یا سہ   تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو   اور ہوتی ہے خطا وار کی صورت کیسی

محبوب کے ساتھ اس اندازِ تخاطب میں جو دریدہ دہنی، ہیکڑپی اور پست درجہ کی غرض مندی ہے اُسکی حدیں ہر جگہ آوارہ مزاجی اور اوباشی سے ملتی ہیں۔ محبوب سے مخاطب ہوتے وقت داغ کا لہجہ عموماً ایسا ہی رہا ہے۔ وہ بظاہر ایک غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہیں اور محبوب کو محض اپنی آتشِ ہوس بجھانے کا ایک وسیلہ جانتے ہیں لیکن محبوب کا ہرجائی پن اس میں مخل ہوتا ہے تو اُن کے لہجہ میں بڑے سستے قسم کی طنز اوچھی وضع کی دھمکیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے ــــ اس کے برخلاف مومن کا عشق بوالہوسی کے باوجود محبوب کو محبوب ہی جانتا ہے اور طرز

کے تیروں سے اُس کا کلیجہ چھلنی کرتے وقت بھی حفظ مراتب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ سخت سے سخت بات بھی نرم لہجہ میں کہی جاتی ہے اور محبوب کی شان بے نیازی کے آگے اپنے عشق کی کمتری کا احساس اس درجہ غالب رہتا ہے کہ وہ کبھی کبھی مجبوری اور بے بسی بن کر زبان پر آتا ہے۔ یہ سب کچھ داغ کے مزاج کے خلاف ہے۔ لیکن مومن کی دی ہوئی روایت نے اُنھیں کبھی کبھی یہ راستہ اختیار کرنے کی طرف بھی مائل کیا ہے اور اس لئے وہ کبھی کبھی ایسے لہجہ میں بات کرتے ہیں کہ سننے والے کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ خاص کر جب وہ داغ کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہے کہ ے

سب مجھے دیوانہ بنانے لگے ـــــ لو وہ تمہارا ہی کہا ہوگیا

یا ے

دل لینے کی تم کو آرزو تھی　　اب جان سے اپنی لو گئے ہم

لہجہ کی یہ نرمی مومن کا فیض اثر ہے۔

بات سے بات نکلتی ہے اور محبوب سے اندازِ تخاطب میں مومن اور داغ میں جو زمین آسمان کا فرق ہے وہ ہمارے ذہن کو خود بخود حُسن وعشق کے دوسرے کاروبار کی طرف منتقل کرتا ہے اور اس سلسلہ میں ہماری نظر ایک بار پھر مومن اور داغ کے اُن تصورات پر پڑتی ہے جن کا اظہار دونوں کی غزلوں میں محبوب کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ مومن کے محبوب کے متعلق اب اس بات کے دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اُن کا محبوب غزل کے روایتی محبوب سے الگ ایک ایسا "پردہ نشین" ہے جسکی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی عاشق کا دل اُس کے ہاتھوں سے رخصت ہوجاتا ہے۔ مومن آخر عاشق ہیں اس لئے اُنھیں بھی عاشقوں کی طرح محبوب سے طرح طرح کے گلے ہیں اور یہ گلے اُنھوں نے کبھی کبھی بڑے تیز لہجہ میں کئے ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اُنھیں اپنے محبوب کی دلداری اور پاسِ خاطر اس قدر عزیز ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے لئے ناگوار سے ناگوار بات کو بھی گوارا بنانے سے اجتناب نہیں کرتے۔

ے شبِ وصل غیر بھی کاٹی　　تو مجھے آزمائے گا کب تک

اُس کی پشیمانی کے منظر کی تاب نہیں لاسکتے تو گئی ہوئی زندگی کے چلے جانے پر نادم و پشیمان ہوتے ہیں اور جیسے بے بس ہوکر رہ جاتے ہیں ے

پشیماں آئے ہیں وہ لاشں پر اب　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی بعض کیفیتوں کا اظہار ان شعروں میں ہے ے

گر نہ تھی اے دل اُس کے رنج کی تاب ـــــ کیوں شکایت گزار ہونا تھا،
دل میں اُس شوخ کے جو راہ نہ کی ـــــ ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی،
بس کہ اک پردہ نشیں کے عشق میں ہو گفتگو　　بات بھی کرتے نہیں جُز صنعتِ ایہام ہم
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم　　پر کیا کریں کہ ہوگئے لاچار جی سے ہم

یا ایک مشہور غزل کے چند شعر ے

اگر نہ ہاتھ میں اُس دل ربا کے دل دیتے　　تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آجاتے　　تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم
اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے　　تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم
اُس آفت دل و جاں پر اگر نہ مرجاتے　　تو اپنے مرنے کی ہر دم دُعا نہ کرتے ہم
اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی　　تو بیٹھے بیٹھے ہی یوں چونک اُٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اُس پری کی باتوں پر تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ تو ایک ایک کے منھ کو تکا نہ کرتے ہم

عشق کے خنجر نے گھایل داغ کو بھی کیا ہے لیکن اُنھیں خنجر چلانے والے پر خود خنجر چلانے میں بھی دریغ نہیں۔ وہ محبوب سے برابر کی چوٹ لڑتے ہیں۔ یہاں ایک کی کمتری اور دوسرے کی برتری کا سوال نہیں۔ اس عشق کا سودا ہمسری اور برابری کا سودا ہے اُنھیں اپنے دل کو ٹھیس لگتی محسوس ہوتی ہے تو وہ محبوب کے کلیجہ تک کو چٹکیوں سے مسل دینے میں تامل نہیں کرتے نہ محبوب کی پشیمانی اُنھیں پشیمان کرتی ہے اور نہ اُنھیں اس کا غم ہے کہ اُن کا محبوب اُن کا ہوکر نہیں رہتا۔ وہ اپنا نہیں تو نہ سہی، اُس جیسے اور بہت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زلفِ سیاہ کا دام اُنھیں پریشان نہیں کرتا، محبوب کی شوخی و بدگمانی اُنھیں مضطر نہیں بناتی اور وہ عشق کے ہاتھوں موت سے کارِ مسیحا کے طالب نہیں ہوتے۔ اُنھیں یہ مرض اور خفقان بھی نہیں کہ بیٹھے بیٹھے چونک اُٹھیں یا بات بات پر اشک فشانی کرنے لگیں۔ یہاں تو محبوب کے ساتھ روابط کی نوعیت ہی دوسری ہے:۔

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا
یا ؎
غیر کو ساتھ لے کے ہم ڈوبے آپ نے ضد دلا کے دیکھ لیا
جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا
چاہت کا مزا بعد ہمارے نہ ملے گا ہر شخص سے تم آپ کہوگے ہمیں چاہو
ہاتھ باندھے ہوئے اغیار کے ساتھ آؤگے ہم دکھا دیں گے مزا روزِ جزا ہونے دو
بُرا ہے شاد کو ناشاد کرنا سمجھ کر سوچ کر بیداد کرنا

اگر داغ سے پہلے کسی نے اس اندازِ عشق کی طرح ڈال دی ہوتی تو نہ کسی کو جل بھُن کر یہ کہنا پڑتا کہ ؎

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر مذہبِ عشق اختیار کیا

—— نہ یوں ہزاروں دین دار بُت پرستی اختیار کرتے اور نہ عشق و عاشقی کے آزار میں ہزاروں خانماں برباد ہوتے اور جانیں کھپاتے۔ داغ کے عشق کی نوعیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہاں مجرم کو شبہ کی گنجایش بھی نہیں دی جاتی، اُسے اقبالِ جُرم کرنے یا بریت کی کوئی راہ تلاش کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ یہاں تو عاشق کی جگہ محبوب کو اپنی جان بچانے کی فکر ہوتی ہے اس لئے کہ عاشق کے وار ٹیڑھے ترچھے ہوکر نہیں سیدھے دل پر گرتے اور دوسروں کو بسمل کرنے والوں کو بسمل بناتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ عشق بھی آدمی کی جون میں آجاتا ہے۔ اسے بھی محبوب کو محبوب سمجھنے میں مزا آتا ہے، اسے بھی اُس کی پشیمانی کا خیال آزردہ و افسردہ کرتا ہے، اسے بھی کبھی کبھی تابِ نظارہ نہیں رہتی، اس کا دل بھی کبھی کبھی پگھل کر موم بن جاتا ہے اور پھر اُس کے منھ سے جو کچھ نکلتا ہے اُس میں محبت کا گداز بھی ہوتا ہے اور محبوبی کا دلبرانہ پرتو بھی۔ جس داغ نے محبوب سے یہ کہا تھا کہ "دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا" اس سے کچھ اور بھی سنئے اور سر دُھنئے ؎

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے آنکھوں سے کبھی اُس کو پشیماں نہیں دیکھا
دل سے بھی باتیں نہیں کرتا کبھی میں اس لئے وہ ستم گر بدگماں یہ راز داں ہوجائے گا
جوابِ وصل سے کیونکر نہ ہوں میں شادیِ مرگ خوشی بھی اور خوشی دل رُبا کے آنے کی
فکر ہے دوست کو احوال سُناؤں کیونکر ٹکڑے ہوتا ہے کلیجہ مرے افسانے سے
ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے پر تمھیں شرمسار کون کرے

کعبہ کی سمت جا کے مرا دھیان پھر گیا، — اُس بُت کو دیکھتے ہی بس ایمان پھر گیا
رشکِ دشمن بھی گوارا لیکن، — تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا
شوق ایسا کہ تری راہ میں مرکر بھی چلوں — ضعف ایسا کہ نہیں جان سے جایا جاتا
بارہا دیکھ لیا ہے اُس کو — اور اکثر نہیں دیکھا جاتا

یہ شعر پڑھ کر جتنی داد داغ کو دینے کو جی چاہتا ہے اُس سے زیادہ یہ جی چاہتا ہے کہ حمد و ثنا کے بے شمار پھول مومن کے قدموں پر نثار ہوں کہ اُس کے رنگ نے داغ جیسے کافر کو اپنی دین داری کے رنگ میں رنگا اور جس عاشق کے مُنھ سے کبھی بھول کر بھی محبوب کے لئے خیر کے دو کلمے نہیں نکلتے تھے وہ اُس کی پشیمانی کے خیال کو دل میں جگہ دینے سے گھبراتا ہے، اُس کی بدگمانی کے اندیشہ سے ڈر کر اپنے دل سے بھی باتیں نہیں کرتا، اپنا دردِ دل سنانے سے اجتناب کرتا ہے کہ اس سے محبوب کے شیشۂ دل میں بال پڑجانے کا اندیشہ ہے، اُسی کا جلوہ ہے کہ اُس کا رُخ کعبہ کی طرف سے پھیر دیتا ہے اور پھر اسی کا شوق ہے کہ مرنے کے بعد بھی اُس کی راہ پر چلنے کا آرزو مند ہے۔ یہ سارے مضمون مومن کے ہیں اور اس لئے داغ نے جہاں کہیں انھیں شعر کی شکل دی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مومن کے نغموں کی جھنکار ہے:۔

ع وہ ستم گر بدگماں یہ راز داں ہو جائے گا
ع خوشی بھی اور خوشی دل رُبا کے آنے کی
ع اُس بُت کو دیکھتے ہی بس ایمان پھر گیا
ع تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا

؎ ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے — پر تمھیں شرمسار کون کرے

یہ سب کچھ داغ کی خود بینی، خود پسندی، تبختر اور دریدہ دہنی سے مطابقت نہیں رکھتا لیکن داغ پر کسی کا سایہ ہے اور اس لئے وہ اپنی ڈگر چھوڑ کر اُس کی دکھائی ہوئی ڈگر پر چلتے اور اپنے رنگِ خاص میں ایک ایسا رنگ سمو لیتے ہیں جو اپنی بہار الگ دکھاتا ہے۔

عاشق اور محبوب کے اس رشتہ کے تار بہت دور دور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ رشتہ اس دُنیا میں رقیب کو اپنے پھندوں میں جکڑتا ہے اور یہاں سے بہت دور میدانِ حشر میں عاشق، محبوب، رقیب اسی جال میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان پھندوں میں ایسے پیچ پڑتے ہیں کہ خود داورِ حشر بھی ان میں اسیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مومن اور داغ دونوں کے کلام کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ دونوں نے رقیب اور حشر کو طرح طرح سے اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے لیکن اس "طرح طرح سے" میں دونوں کے رنگ کی امتیازی خصوصیتیں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ مومن اور رقیب کے رشتہ کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے:۔

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں، — کہ سخت چاہئے دل اپنے راز داں کے لئے
دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا — غیر لے جائے ہے پیام مرا
وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی — تمھارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا،
غیر سے سرگوشیاں کریجیے، پھر ہم بھی کچھ — آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

تعلقات کی یہ نوعیت بڑی انوکھی ہے۔ یہاں رقیب کو اپنا ہم راز بنانے کے لئے تخلیہ کی تلاش ہوتی ہے، اُسے قاصد کی رشک انگیز خدمت سونپی جاتی ہے، اُسے ہم مزاجی کے سبب سے اپنا دوست

بنایا جاتا ہے۔ عاشق جب اُسے محبوب سے سرگوشیاں کرتے دیکھتا ہے تو اُس کے دل میں رشک کی خلش تو پیدا ہوتی ہے لیکن اس سرگوشی کو کاروبارِ عشق کا ایک معمول سمجھ کر اُس وقت کا انتظار کرتا ہے جب غیر اپنا حالِ دل بیان کر چکے۔ یہاں تک کہ وہ عاشقی کے اس رشتہ میں رقیب کے وصل کو بھی کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دیتا ؎

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی — تو مجھے آزمائے گا کب تک

اور شاید اسی رواداری کا صلہ ہے کہ رقیب عاشق کا پیامی بھی بنتا ہے اور اُس کی داستانِ غم محبوب کے سامنے بیان کرنے کی خدمت بھی اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔

داغ ایسے عاشق ہیں جو غم کے بوجھ میں بھی رقیب کو شریک کرنے کے قایل نہیں اور اس لئے شبِ فرقت کو بھی اپنی واحد ملکیت بنانا چاہتے ہیں اور اس لئے محبوب کو اس کی اجازت نہیں دیتے کہ غیر اُن سے سرگوشیاں کرے یا اس سے بھی نہیں بڑھ کر اُس کے وصل سے لذت اندوز ہو۔ اُنھیں سخت سے سخت وقت میں بھی ایسی ترکیبیں سوجھ جاتی ہیں کہ جو وصل اُنھیں میسر نہیں آیا وہ کسی طرح رقیب کو بھی نصیب نہ ہو۔ یہی جذبہ ہے جو اُن سے کہلواتا ہے ؎

تمھارے واسطے میں غیر کو تنہا نہ چھوڑوں گا — سمجھ لینا کہ دو مُردے گڑیں گے ایک مدفن میں

اِس رقیب کے ساتھ محبوب کو جس طرح کے سلوک کی طرف مایل کرتے ہیں وہ صرف اسی طرح کے "بازاری عاشق" کر سکتے ہیں جن کی نمایندگی داغ نے اپنی غزلوں میں کی ہے۔ ذرا اس منظر کا تصور کیجئے:-

دیکھی نہ ہوگی سیر کبھی اس شکار کی — دیکھو رقیب پر سگِ درباں کو چھوڑ کر

اس منظر سے راہ گیروں نے جو لطف لیا ہوگا اُس کی تصویر اور زیادہ رنگین بن جاتی ہے اگر تصور یہ دیکھ سکے کہ سگِ درباں رقیب کو بھنبھوڑ رہا ہے اور "وہ شوخ" آڑ میں کھڑا اس منظر سے محظوظ ہو ہو کر تبسم کی بجلیاں گرا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جیسا عشق ہے ویسا ہی محبوب ہوگا اور اُس کی گلی میں چاہنے والوں کی یہی گت بنے گی جو داغ کے تصور نے ناظرین کے سامنے پیش کی ہے۔ ایک طرف تو رقیب کا یہ تصور دیکھئے اور دوسری طرف داغ کے منھ سے اُس کا ذکر ایسے انداز میں سنئے جو داغ کے مزاج اور فطرت سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتا:-

گیا رقیب کے گھر بارہا شبِ وعدہ — بہت ذلیل مجھے تیری جستجو نے کیا

اس جگہ مومن کا یہ شعر بھی یاد کر لیجئے:-

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھکو ملال — دشمنی کا لطف شکوؤں کا مزا جاتا رہا

دشمن کی ندامت نے اُنھیں پیار دلایا — اے کاش مرے ذمہ بھی الزام نکلتا

غیر پر لطف و کرم ہونے لگا — مہربانی کا مزا جاتا رہا

عشق خانہ خراب جب چاہنے والوں کو "دار العمل" سے "دار الجزا" میں لے جاتا ہے تو اُنھیں بھی دل کی بیقراری چین سے نہیں بیٹھنے دیتی اور جس دل میں محبوب کی سچی لگن اور اُس کے رنج و خوشی کا سچا پاس ہے وہ وہاں بھی اسی آگ میں جلتا اور درد میں گھلتا ہے کہ محبوب کی شانِ محبوبی میں فرق نہ آئے۔ وہ شرمسار نہ ہو، پشیماں نہ ہو، جو دل کبھی درد سے آشنا نہیں ہوا اُس میں درد و غم کا کانٹا نہ کھٹکے۔ اور اس لئے جہاں دوسرے نفسی نفسی میں مبتلا ہیں عاشق صادق اب بھی اپنے انجام و اختتام سے بے خبر اسی خیال میں مدہوش اور اسی کوشش میں سرگرداں ہے کہ محبوب کی فردِ جرم اُس کے سامنے پیش نہ ہو۔ وہ اپنے سارے گلے شکوے بھول کر داورِ حشر کے آگے اُس کی بے گناہی اور معصومی کا پیامبر

بن کے جانا چاہتا ہے۔ لیکن داغ جیسا عاشق روزِ جزا کا انتظار اس لئے نہیں کرتا کہ اُسے اس دُنیا میں محرومیوں سے دو چار رہنا پڑا ہے یا جو کچھ اُسے یہاں نہیں ملا وہ اُسے دوسری دُنیا میں حاصل کرنے کا طالب ہے۔ اُس کے نزدیک تو یہ دُنیا بھی ایک تماشا گاہ تھی اور وہ دنیا بھی تماشا گاہ ہوگی، یہاں بھی محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور وہاں بھی۔ بلکہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں طبیعت شوخیوں کی طرف زیادہ مایل ہوگی — کیسے ؟ اس کا اندازہ کچھ شعر سُن کر کیجئے ؎

عرصۂ حشر میں انصاف ہمارا کیسا — دیکھنا یہ ہے کہ ہوتا ہے تماشا کیسا
کہوں گا حشر میں یہ کون میں کون — مزا دے جائے گا انکار میرا
ایسا تو نہ ہو حشر میں تکرار کی ٹھیرے — تو اپنی خطا پر کبھی قایل نہیں ہوتا
رقیبوں کے ہاتھوں سے محشر کے دن — تمھیں چھین کر میں اکڑ لے گیا
دیکھ لینا کہ حشر کا میداں — میرے حاضر جواب نے مارا
محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا — یاں یہ تلاش آئے کوئی خوب رو پسند
محشر میں بعد پرسشِ احوال دیکھنا — ہم دیکھتے پھریں گے تماشا اِدھر اُدھر

داغ جس طرح کے عاشق ہیں، جیسا اُن کا محبوب ہے اور جو حیثیت اُن کے رقیب کی ہے اُس کے اس دنیا میں تو نظر نے ایسے ایسے جلوے دیکھے ہیں کہ کبھی کبھی اُسے اپنے مشاہدہ پر حجاب محسوس ہوا ہوگا لیکن عشق عاشقی کا یہ انداز، محبوبی کی وہ بے باکی اور رقابت کی اوباشی میدانِ حشر میں بھی اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف تو یہ تصویر ہے کہ میدانِ حشر میں عاشق اور محبوب دونوں بارگاہِ ایزدی میں پیش ہوتے ہیں محبوب کے نامۂ اعمال میں جور و جفا اور ظلم و ستم کی نہ جانے کتنی داستانیں درج ہیں، جو مظلوم اور ستم رسیدہ ہیں وہ داد کے طالب ہیں لیکن جب سوال جواب کی منزل آتی ہے تو عاشق صاحب یا تو صاف مکر جاتے ہیں کہ "اے میرے معبود! میں نے تو اس کافر کی اس سے پہلے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی" محبوب عاشق کے منہ سے یہ غیر متوقع بات سنتا ہے تو ہکا بکا رہ جاتا ہے، چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں اور عاشق صاحب اپنے دل میں خوش ہیں کہ دیکھا کیسا بدلا لیا، دوسری طرف منہ پھیر پھیر کر مسکرا بھی رہے ہیں اور محبوب کی بے چارگی سے لطف و انبساط بھی حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرا منظر وہ ہے کہ جب محبوب کے سامنے فردِ جرم آتی ہے اور وہ حسب عادت اپنی خطاؤں سے انکار کرتا ہے۔ بھلا عاشق کو اس کی تاب کہاں، وہ برس پڑتا ہے اور پھر دونوں میں وہ تو تو میں میں ہوتی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ یا پھر یہ تصور کیجئے کہ جب محبوب سے پوچھا گیا کہ کیوں تم نے یہ کیا اور یہ کیا ؟ تو اُس نے وہ لچھے دار تقریر شروع کی کہ داورِ محشر بھی متاثر ہوا اور محبوب صاف بچ کر نکل آیا — یہ منظر تو خیر سب ایسے ہیں جو کچھ زیادہ خلاف توقع نہیں معلوم ہوتے عاشق اور معشوق کی جو حالت جیتے جی دیکھی تھی وہی مرنے کے بعد بھی نظر آئی۔ یہاں شوخی کا جواب دشنام اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی خو ہے تو وہ بھلا کیسے چھوٹے۔ لیکن وہاں جہاں ہر فردِ بشر آنے والے عذاب کے خوف سے ترساں و ہراساں نفسی نفسی میں مبتلا ہے یہ زمانہ سے انوکھے اور نرالے عاشق ایسی حرکتیں کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں جو اس دُنیا میں بھی کی جائیں تو معاملہ تھانہ اور کچہری تک ضرور پہونچے۔ واقعہ کی تصویر یوں ہے کہ محبوب صاحب جن کا ہرجائی ہونا مسلّم ہے حشر کے میدان میں بھی رقیبوں کا ایک جمِ غفیر اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں اور اِن کے سہارے پر اس امید میں وقت کاٹ رہے ہیں کہ مقدمہ پیش ہوگا تو یہ سب ہماری حمایت میں گواہی دیں گے لیکن عاشقِ جاں باز کو ایسی حالت میں بھی بہت دور کی سوجھتی ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ اُس کا ذکر محبوب سے بڑے مزے لیکر اس طرح کرتا ہے کہ ؎

رقیبوں کے ہاتھوں سے محشر کے دن — تمھیں چھین کر میں اکڑ لے گیا

اس کے بعد جو کچھ ہوگا اُس کے تصور سے محبوب گھبرائے یا عاشق مزے لے لیکن ہمیں آپ کو اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں پر اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے کا حق تو آخر ہر ایک کو ہے اور اس حق کی بنا پر داغ اور مومن عاشقی کے سارے عناصر کے متعلق ہم بڑی گھٹیا رائے قایم کرتے ہیں، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ حشر اور محبوب کے رشتہ کے سلسلہ میں بھی داغ نے کبھی کبھی ایسی باتیں کہی ہیں جو اُن کے عام اندازِ سخن سے مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتیں مثلاً ان شعروں میں ؎

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے — آنکھوں سے کبھی اُن کو پشیماں نہیں دیکھا

(محبوب کی پشیمانی اور اپنی بے بسی کا یہی احساس مومن کو بعد مرگ بھی چین نہیں لینے دیتا ؎

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

لوگ جانیں گے تصور ان کا نہیں اسکا ہو — حشر میں آپ دئے جائیے الزام مجھے

اس ترکیب کے سمجھانے میں داغ جیسے عاشق کی فتنہ پردازی کی پوری تصویر ہے لیکن اس ترکیب کے سمجھانے کے پیچھے محبوب کو الزاموں سے بری کرانے کا جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ خالص مومن کے تصور سے مستعار ہے۔

خدا ہے حشر کے دن وہ پکارے — کہاں ہے طالبِ دیدار میرا

یہ وہی داغ ہیں جنھیں حشر کے دن انصاف کی نہیں ایک تماشہ کی توقع اور حسرت ہے۔

کہہ دیں گے ہم تو داورِ محشر سے صاف صاف — اچھوں کو دل نے پیار کیا ہم نے کیا کیا

جانبِ گورِ غریباں وہ نہ آئے — حشر اے اہلِ عدم بس ہوچکا

یہ تصور کہ حشر صرف محبوب کے "قدومِ میمنت لزوم" کا دوسرا نام ہے داغ کی عاشقی کے لئے بیگانہ سا ہے۔

حال کچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ — حال مجھ میں اب کہاں باقی رہا

"حال کچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ" کی بے بسی و بے چارگی داغ کی اپنی بے بسی نہیں بلکہ کسی کا پرتو ہے۔

داورِ محشر کے آگے تو سہی — لوٹ جاؤ تم مری تقریر پر

اندازِ بیان اور اندازِ فکر میں داغ کی شخصیت نمایاں ہے لیکن جذبہ اور احساس میں مومن کی پاسداری کی جھلک صاف نظر آرہی ہے۔

ڈر ہے کہ بھول جائے نہ سفاک روزِ حشر — دُنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

ہم دل کی بات داورِ محشر سے کیا کہیں — یہ راز کہہ کے اُس بُتِ کافر سے کیا کہیں

یارب نہ پوچھ عرصۂ محشر میں رازِ دل، — کرتا ہوں میں حجاب کی باتیں حجاب میں

یہاں مومن کی صنعتِ ایہام کی جگہ "ذکرِ محبوب" کے لئے کسی گوشۂ حجاب کی تلاش ہے

داغ کی غزلوں میں روزِ جزا اور میدانِ حشر سے متعلق بلا مبالغہ صدہا شعر ہیں لیکن ان سارے شعروں میں داغ کی شخصیت کے صرف دو پہلو اُبھرتے ہیں ایک تو اُن کی وہ شاہد بازی جس کا دامن جابجا اوباشی کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور دوسرے عاشق کی حیثیت سے اُن کا وہ جذبۂ انتقام جو مرنے سے پہلے تصور میں اور مرنے کے بعد روزِ جزا میں بار بار اس چیز کی طرف مایل کرتا ہے کہ وہ داورِ محشر کے سامنے محبوب کو جی کھول کر رسوا کریں اور ناکردہ گناہی کی ساری حسرت وہیں نکال لیں۔ اس کے لئے وہ سارے انتظام اس زندگی ہی میں مکمل کرلیتے ہیں۔ روزِ جزا آتا ہے اور تصور وہی ساری باتیں سامنے لاکر پیش کر دیتا ہے جن کے منصوبے مدتوں پہلے بنائے گئے تھے، محبوب سے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ ایک کہکر دو سُنی جاتی ہیں اور دو سُن کر چار سُنائی جاتی ہیں، طنز، تشنیع، گالی گلوج غرض کوئی ایسا حربہ نہیں جو استعمال نہ کیا جاتا ہو۔ جب جی بھر کے رسوائی ہوچکی ہے

تو یہ منتقم عاشق سیر کو نکلتا ہے اور جہاں دوسرے اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہیں یہ پری رویوں کے جلوے دیکھنے میں مصروف ہے اور اُس ہیجان و اضطراب و انتشار کی گھڑی میں بھی اپنے آپ کو صرف اس مشغلے کے لئے وقف کردیتا ہے کہ چُن چُن کر ایک ایک حسین کو اپنے "تیرِ نظر" کا نشانہ بنائے اور جب کسی مہ وش کو چاہنے والوں کے جمگھٹ میں گھرا دیکھے تو موقع پاکر اُچک کر فرار کی راہ اختیار کرے۔ جن صدہا شعروں کا میں نے ذکر کیا اُن میں سے بعض بعض میں کچھ نئے پہلو بھی ہیں لیکن یہ سارے نئے پہلو اُسی خاص شخصیت کے مظاہر ہیں جسے داغ نے عاشق کے روپ میں اپنی داستانِ غزل کا ہیرو بنایا ہے۔

ایک طرف تو یہ صدہا شعر اور دوسری طرف کہیں کہیں ایسے شعر جن میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نادیدہ طلسم کے اثر سے شاعر کا رنگ روپ بالکل بدل گیا ہے۔ جس نے محبوب کی رسوائی کو اپنا نصب العین بنایا تھا وہ اُس کے ذکر کو بھی بے حجابی کے نشتروں سے مجروح نہیں کرنا چاہتا، اپنی شکایتوں کا دفتر اس لئے باز کرنے سے گریز کرتا ہے کہ محبوب کی پشیمانی کی تاب ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ اور اس لئے وہ کہی جانے والی باتوں کے نہ کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کرتا ہے۔ کبھی اُس کا جی چاہتا ہے کہ حشر کے دن محبوب اُسے "میرا طالبِ دیدار" کہہ کر پکارے اور اِس آواز پر ہر آرزو قربان۔ کبھی اُس کا تصور اُس کے سامنے ایسے امکانات کا دفتر کھول دیتا ہے کہ حشر کا بپا ہونا ہی ممکن نہ رہے، کبھی جب اُس سے حالِ دل پوچھا جاتا ہے تو دل کی بات چھپانے کے لئے صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہے کہ ؂

حال کچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ حال مجھ میں اب کہاں باقی رہا

اور پھر جب داورِ محشر کے سامنے ساری داستانِ غم دہرائی جا چکی تو اُس کا دل کسی طرح چاہتا ہے کہ یہ قضیہ یہیں ختم ہوجائے۔ اور وہ اس قضیہ کے ختم کرنے کی صرف ایک معمولی سی جذباتی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے ؎

لوٹ جاؤ تم مری تقریر پر

یا ان سب سے بڑھکر یہ کہ جب روزِ جزا میں محبوب کے ماخوذ ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے تو پیش بندی کے طور پر وہ زندگی ہی میں اُس کی صفائی اور بریت کے لئے مسالہ جمع کرنا شروع کردیتا ہے:-

دُنیا میں لکھے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

یہ سارے خیالات داغ جیسے عاشق کے لئے بڑے عجیب و غریب ہیں اس لئے قیاس یہی کہتا ہے کہ اس جذبہ کا عکس مومن کی نادانستہ اور غیر ارادی خوشہ چینی کا نتیجہ ہے لیکن شاعر نے اس جذبہ کے اظہار میں اکثر جگہ لہجہ وہی رکھا ہے جو پوری طرح اسکی رنگ میں رچا ہوا ہے۔ کہیں کہیں البتہ لہجہ بھی اتنا بدلتا ہے کہ داغ اور مومن ایک معلوم ہونے لگتے ہیں:-

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے آنکھوں نے کبھی اُن کو پشیماں نہیں دیکھا

داغ کے کلام میں شخصیت کی نمایاں انفرادیت کے باوجود ہمیں جابجا مومن کے اندازِ فکر و نظر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اور داغ کے تصورِ حسن و عشق اور اس لئے اندازِ عاشقی و محبوبی میں جو بنیادی فرق ہے وہ دونوں کے رنگِ تغزل میں زمین آسمان کا فرق پیدا کردیتا ہے، لیکن مومن کے طرزِ تغزل میں کچھ ایسی کشش ہے کہ داغ جیسا خود پرست بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا، یہاں تک کہ بعض جگہ اس تاثر نے یہ صورت اختیار کرلی کہ داغ کی شخصیت اور انفرادیت اس کے اندر گم ہوکر رہ گئی لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ عشق، عاشق، محبوب، رقیب اور ان سب کے باہمی رشتہ کے متعلق مومن کے کچھ خاص طرح کے تصورات ہیں۔ یہ تصورات کچھ تو اُن حالات کے پیدا کئے ہوئے ہیں جن میں رہ کر مومن کو عشق کی کڑی منزلیں طے کرنی پڑی ہیں، کچھ اس لئے ہیں کہ اُن کا محبوب ایک خاص طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور بہت کچھ اس لئے بھی مومن کے مزاج نے اس رشتہ میں ایک تیکھا پن پیدا کیا ہے۔ اس عشق میں خود داری اور رکھ رکھاؤ کی ایک خاص سطح ہے جس سے نیچے مومن کبھی نہیں اُترتے۔

داغ کے یہاں یہ سطح بہت پست ہے اور اس کی وجہ ماحول کا فرق، محبوب کی نوعیت کا فرق اور چاہنے والوں کے مزاجوں اور طبقوں کا فرق ہے۔ اس فرق نے دونوں غزل گویوں کے طرزِ بیان کو بھی ایک دوسرے سے جدا کیا ہے لیکن جس طرح بنیادی تصورات کے اختلاف کے باوجود داغ پر مومن کا عکس ہے اسی طرح طرزِ بیان کے معاملہ میں بھی داغ منفرد ہونے کے باوجود طرزِ مومن سے خاصے متاثر ہیں۔

اس سلسلہ میں مومن کے طرز کی سب سے اہم خصوصیت "طنز" پر ہماری نظر سب سے پہلے جاتی ہے۔ طنز اُردو شاعری کی روایت میں فن کے ایک مستقل حربہ کی طرح سب سے پہلے مومن کی وساطت سے داخل ہوئی ہے۔ مومن نے عاشق اور محبوب کے رشتہ کی ساری نزاکتوں کی ترجمانی اسی لطیف وسیلہ سے کی ہے اور عشق کے دشوار سفر کی ساری منزلیں اسی کی رہبری میں طے کی ہیں اُنھوں نے اُردو غزل کو پہلی مرتبہ اس رمز سے آشنا کیا کہ محبوب کے دل میں گھر کرنے کے جتنے آداب عشق نے عاشق کو سکھائے ہیں اُن میں طنز سے زیادہ موثر اور دل نشین کوئی نہیں کہ اس میں زہرِ ہلاہل کی تندی و تیزی بھی ہے اور آبِ حیواں کی لذت و حلاوت بھی۔ محبوب سے کڑوی سے کڑوی اور میٹھی سے میٹھی بات اسی اندازِ خاص میں کہی جاسکتی ہے۔ طنز اظہارِ جذبات کے نازک سے نازک مرحلہ کو کس طرح طے کرتی ہے اس کا اندازہ مومن کے چند شعروں سے لگائیے:-

کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا
ہنسو نہ تم تو مرے حال پر میں ہوں وہ ذلیل کہ جس کی ذلت و خواری سے تم کو شان لگی
ہے شرط ہم پہ عنایت میں گونہ گونہ ستم کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا
غیر ہے بے وفا پہ تم تو کہو، ہے ارادہ نباہ کا کب تک،
مجھ رمز شناس سے یہ باتیں کیا خوب، میں غیر سے بُرا ہوں
رحم فلک اور مرے حال پر تو نے کرم اے ستم آرا کیا
ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب
ستم، آزار، ظلم، جور و جفا جو کیا سو بھلا کیا صاحب
آپ مجھ سے نباہیں گے ہم سے با وفا حُسن و بے وفا ہے عشق
میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو کہیں دامان تر نہ ہو جائے

یہ شعر مومن کے سیکڑوں طنزیہ نشتروں میں سے چند ہیں۔ لیکن ان چند نشتروں میں مومن کے اندازِ بیان کی بہت سی اہم خصوصیتیں اپنی پوری تیزی اور آب داری کے ساتھ موجود دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں عاشق کا لہجہ حد درجہ تند و تلخ ہے اور کہیں حد درجہ نرم اور شیریں اور کہیں سختی، نرمی، اور تلخی و شیرینی کا بڑا لطیف امتزاج ہے۔ ہر شعر کہنے والے کے جذبہ کی ترجمانی اور مصوری اتنی وضاحت سے کرتا ہے کہ اُس کا کوئی پہلو چھپا نہیں رکھتا اس کے باوجود اس پر ایک نازک سا پردہ بھی ہے جو زندگی کی حقیقت کو فن اور شعر کی حقیقت بناتا ہے۔ طنز کا ایک لہجہ یہ ہے کہ ؎

تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

اور دوسرا یہ کہ ؎

جو کیا سو بھلا کیا صاحب

ایک میں تیر اور کمان دونوں عاشق کے ہاتھ میں ہے اور وہ تیر اس مہارت اور مشّاقی سے چلاتا ہے کہ سوفار محبوب کے دل میں اُتر جاتا ہے، دوسرے میں اُس کی حالت ایک ایسے تیر انداز کی ہے جو اپنے سارے تیروں کو ترکش میں رکھ کر صیادی کا منصب اُسے سونپتا معلوم ہوتا ہے جیسے کبھی صید بنایا تھا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ حالات کے اس بدیہی تغیر نے نصب العین کی نوعیت میں

کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ مقصود بہرحال محبوب کو اپنی طرف مایل کرنا اور اپنے ناسور کے لئے مرہم کی جستجو ہے۔ مومن کی طنز یہ کام ہر حیلہ سے نکالتی اور بڑی کامیابی سے نکالتی ہے اور اس کامیابی کا راز یہ ہے کہ طنز میں بھی مومن نے ایک خاص سطح سے نیچے اُترنے سے اجتناب کیا ہے۔ اُن کے اندازِ تخاطب میں ابتذال یا سوقیت کی نام نہاد جھلک بھی نہیں۔

مومن کے طرز کی اس خصوصیت کو داغ نے بھی جی کھول کر برتا ہے یہاں تک کہ طنز اُن کے اندازِ بیان کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔ لیکن عشق کے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی داغ کے مزاج نے اپنا راستہ الگ بنایا ہے اور طنز کو طنز کی سطح سے اُتار کر طعن و تشنیع کی سطح پر لاکر کھڑا کر دیا ہے اور اس طعن تشنیع میں بھی کبھی بھاری بھرکم پن پیدا کرنے یا قایم رکھنے کی ناحق کوشش ہرگز نہیں کی، اس لئے کہ اُن کے نزدیک اُن کا محبوب اس کا مستحق ہی نہیں کہ اُس سے بات کرتے وقت لطافتوں کا سہارا لیا جائے یا حسنِ بیان کے پردے ڈالے جائیں۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کے بجائے ہر بات صاف صاف، کھلم کھلا اور برملا کہتے ہیں اور شاید اس لئے کہتے ہیں کہ اسی کو کارگر جانتے ہیں۔ چند شعر دیکھئے:-

غیر کا حال چھپائے سے کہیں چھپتا ہے ـــــ گو کسی وجہ سے میں آپ کے منہ پر نہ کہوں

خوبیاں کل تو بیاں ہوتی تھیں، ـــــ آج ہے شکوۂ اغیار یہ کیا،

تجھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو ـــــ اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں، ـــــ تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

کیوں رنج دئے دل کو جو فریاد کا ڈر ہے ـــــ تھی آپ کی مرضی کہ یہ مضطر بھی نہ ہوتا

ہوئی جاتی ہیں کیوں نیچی نگاہیں ـــــ کہو تو کیا ہے قربان اس حیا کے

نفرت ہے صرف وصل سے اچھا یوں ہی سہی ـــــ لو اور کوئی بات سُنو وہ نہیں سہی

بے داد کرکے چاہتے ہو لو جفا کی داد ـــــ بہتر، بجا، درست سہی آفریں سہی

ان سارے شعروں میں طنز اپنا ایمائی منصب ترک کرکے کھری کھری سنانے پر اُتر آئی ہے اور اس لئے مومن کے جذبہ کی شدید تلخی کے باوجود اُس میں جو شاعرانہ لطف ہے وہ اس میں باقی نہیں۔ طعن، تشنیع اور جلی کٹی کا یہ انداز اور کہیں موزوں ہو تو شعر کی نزاکت اور لطافت پر یقیناً بار گزرتا ہے اور یہی چیز مومن اور داغ کے رنگ میں فرق پیدا کرتی ہے اور داغ کی غزل کا مطالعہ کرنے والا شدت سے محسوس کرتا ہے کہ مومن سے لی ہوئی جس مخصوص روایت کو داغ اتنی کثرت اور اتنی آزادی سے برتا ہے۔ اپنی ہم نشینی میں اُس کی صورت کتنی مسخ کی ہے لیکن یہ بات کہتے ہی داغ کے کچھ ایسے شعر بھی دماغ میں چکر کاٹنے لگتے ہیں جہاں داغ کی طنز اور مومن کی طنز میں ذرا بھی فرق نہیں معلوم ہوتا ہے

عمر بھر آپ نے مجھ کو کبھی اچھا نہ کہا ـــــ خیر اچھا نہ سہی آپ کا بیمار تو ہوں

مومن پہلا مصرعہ شاید کسی اور طرح کہتے ہیں لیکن داغ نے دوسرا مصرعہ یقیناً مومن کے رنگ میں ڈوب کر کہا ہے۔
دو شعر اور دیکھئے:-

سچ ہے تیری ہے آرزو مجھ کو، ـــــ کہیں جینے دے یوں ہی تو مجھ کو،

ہر اک میں عیب نکلیں گے کہاں تک ـــــ تمھیں اچھے سہی سارے جہاں سے

پہلے شعر میں ذرا کم اور دوسرے میں پوری طرح مومن کی طنز کی شوخی اور گرمی بھی ہے اور سطح کی وہ ہلکی لیکن نمایاں بلندی بھی جو داغ کی طنز میں عموماً باقی نہیں رہتی۔ چھوٹی بحر کا ایک شعر ہے:-

ذکر مہر و وفا تو ہم کرتے ـــــ پر تمھیں شرمسار کون کرے

طنز کا ایمائی انداز خالص مومن کا ہے :-

ہم مٹ گئے تو پرسشِ نام و نشاں ہو اب   اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

خیال کے طنزیاتی پہلو اور اُس سے بھی زیادہ اس کے خالص طنزیاتی انداز میں مومن کی عاشقانہ اور فن کارانہ شخصیت کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

اسی غزل کا ایک دوسرا شعر ہے :-

ظالم کہیں خدا نہ کرے تو سنے اُسے   جو کچھ شبِ فراق میں وردِ زباں ہو اب

شعر میں 'ظالم' کے لفظ کی موزوں ترتیب اور اندازِ تخاطب میں ایک سفاکانہ روا داری سے مومن کے انداز کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ خصوصًا یہ مصرع کہ "ظالم کہیں خدا نہ کرے تو سُنے اُسے" وہی فضا پیدا کرتا ہے جو مومن کے حُسنِ تغزل کے لئے مخصوص ہے۔

دو تین شعر اور سنئے اور غور کیجئے کہ ان کی طنز میں داغ سے کہیں زیادہ مومن کی شخصیت کا پرتو ہے کہ نہیں ؎

تو نہ کر نخوتِ شباب بہت   ہم نے دیکھے ہیں انقلاب بہت

داغ کو زندگی اور فن دونوں میں پردہ داری سے جو فطری بے تعلقی ہے وہ شاید اُنھیں اس طرح کا شعر ہرگز نہ کہنے دیتی اگر مومن کی طنز نگاری کا سحر اُنھیں اپنا گرویدہ نہ بناتا۔ "ہم نے دیکھے ہیں انقلاب بہت" میں لہجے کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ طنز کی جو نشتریت ہے اُس سے داغ کا مزاج نا آشنا اور اُن کا فن بیگانہ ہے۔

اُس کو مٹائے دیتی ہے بیداد آپ کی   اب کیجئے کرم ستمِ روزگار پر
اُٹھ نہیں سکتی حیا کے بوجھ سے   رحم آتا ہے نگاہِ یار پر

داغ کی طبیعت کا وہ تبختر اور غرور جو کچھ تو اُن کے ماحول کا پیدا کیا ہے اور کچھ قسامِ ازل کی ودیعت ہے نہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی کے احسان مند ہوں اور نہ اس طرف مایل کرتا ہے کہ وہ کسی کے درد و الم سے متاثر ہو کر اُسے دور کرنے کی سبیلیں تلاش کریں۔

"اب کیجئے کرم ستمِ روزگار پر"
اور "رحم آتا ہے نگاہِ یار پر"

میں کردار کی نرمی اور بیان کی جو گھلاوٹ ہے اُس سے داغ کا کردار قطعی نا آشنا ہے۔ کردار میں یہ انقلاب کسی کی آشنائی کا طفیل ہے — اور یہ آشنائی مومن کے سوا کسی اور کی نہیں۔

مومن کے طرزِ بیان کی ایک اور خصوصیت جس سے اُن کے اندازِ تغزل میں انفرادیت بھی پیدا ہوئی ہے اور امتیاز بھی ملا ہے کہ مومن اپنے محبوب سے اپنے فایدہ کی بات اس طرح گھما پھرا کر کہتے ہیں کہ محبوب کو اُس میں اپنے نفع کا پہلو نظر آنے لگتا ہے اور یوں وہ نادانستہ کوئی ایسی بات کرنے کی طرف مایل ہو جاتا ہے، جس سے عاشق کا بھلا ہو جاتا ہے۔ اُن کے طرزِ ادا کے اس پہلو کا عکس بعض شعروں میں دیکھئے :-

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے   اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستا ورنہ   دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے   منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا   میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا، جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
سرمگیں آنکھوں سے نامہ کو لگاتے کیوں ہو — خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو
درباں کو آنے دیجئے پہ میرے نہ کیجے قتل — ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

ان شعروں پر الگ الگ اور پھر ملا کر نظر ڈالئے تو کئی نتیجے نکلتے ہیں :-

(۱) عاشق جن چند باتوں میں محبوب سے التفات و توجہ کا طالب ہے اُن میں سے چند یہ ہیں کہ وہ اُسے جلوہ دکھاتا رہے، یہ جلوہ اُس کے لئے مخصوص ہو، رقیب اس سے محروم رہیں، محبوب اُس پر ظلم و ستم تو کرے کہ یہ اُس کی فطرت ہے لیکن اتنا نہ کرے کہ عاشق کے لئے اُس کی برداشت ممکن نہ رہے۔

۲- یہ ساری باتیں اگر عاشق محبوب سے صاف صاف کہے تو اُسے یقین ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک کو قابلِ اعتنا نہ سمجھے گا اس لئے اُس نے سوچا کہ بات اس پیرایہ میں کہی جائے کہ محبوب کے مخصوص میلانات کے باوجود ان پر عمل کرنے پر مجبور ہوجائے۔

۳- اپنی بات وہ ایسے لفظوں میں ادا کرے کہ وہ محبوب کے مرتبہ کے بھی شایانِ شان ہو اور خود اُس کی محبت کی سطح اُس سے کم نہ ہو جس سطح پر اُس نے اُسے ہمیشہ رکھا ہے۔

۴- اِن ساری چیزوں میں عاشق (یا شاعر) کی شخصیت اور محبوب کی سماجی حیثیت کو بڑا دخل ہے۔

ع اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

ع دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

ع منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

ع ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا

ع خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

کو ایک مرتبہ پھر اس پورے سیاق و سباق میں، دیکھئے تو لہجہ کی "پُرکاری" کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اِن شعروں کے اندازِ خاص کو نظر میں رکھ کر اب داغ کی طرف رجوع کیجئے۔

عاشق کی حیثیت سے داغ کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ محبوب کے مقابلہ میں کسی طرح کی کمتری کے احساس کو بھی قریب نہیں آنے دیتے۔ وہ محبوب کو محبوب جان کر بھی خود کو اُس کا ہمسر بلکہ کبھی کبھی عشق کے کاروبار میں شریک غالب سمجھتے ہیں اور اس لئے جب اُس سے کوئی مطالبہ کرتے ہیں تو اُنھیں کسی نازک وسیلۂ اظہار کا محتاج یا دست نگر ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہر بات کھُلی کھُلی کرنے کے عادی ہیں اور اُنھیں معلوم ہے کہ محبوب سے کام نکالنے کا سب سے آسان اور سب سے موثر طریقہ یہی ہے اس لئے کہ جس طرح کے محبوب سے اُنھیں سابقہ پڑا ہے اُس کا طرزِ زندگی اور اس لئے اندازِ نظر بھی عشق کے کسی مرحلہ کو حسن یا نزاکت سے طے کرنے کے موافق نہیں۔ لیکن عشق اور محبت کا ظالم رشتہ ہی ایسا ہے کہ عاشق کو ہمیشہ طلب و احتیاج کا غلام رکھتا ہے۔ لیکن داغ نے اس طلب و احتیاج میں بھی اپنے احساس برتری کو ٹھیس نہیں لگنے دی اور اس بات میں اُنھیں مومن سے بڑی مدد ملی ہے۔ اُنھوں نے محبوب سے جب کسی بات کا مطالبہ کیا ہے تو اکثر تو بات خوب کھُل کر اور بغیر کسی پردہ داری کے کی ہے لیکن بہت سے موقعے ایسے بھی آئے ہیں جب اُنھوں نے سیدھی بات کرنے کے بجائے مومن کی "فن کارانہ کج روی" کی پیروی کی ہے؟ اس کا اندازہ کچھ شعر پڑھ کر کیجئے ؎

(۱) بنے ہو بزم میں ساقی تو یہ خیال رہے — کسے سرور نہ آیا، کسے سرور آیا
(۲) کیا ہاتھ اُٹھاتے ہی نہ اُٹھے گی قیامت — بس جان لو تم فیصلہ ہے اب کی دُعا میں

(۳) دیکھی نہ ہوگی سیر کبھی اس شکار کی — دیکھو رقیب پر سگِ درباں کو چھوڑ کر

(۴) جو ہوتی خوبصورت تو نہ چھپتی قیس سے لیلیٰ — مگر ایسے ہی ویسے پردۂ محمل میں رہتے ہیں

(۵) قیامت کی تجلّی ہے تمہارے روئے روشن میں — مجھے ڈر ہے کہ دیکھو آگ لگ جائے نہ چلمن میں

(۶) بُرا ہے شاد کو ناشاد کرنا — سمجھ کر سوچ کر بیداد کرنا

(۷) دیکھو دیکھو مجھ پہ برساتے رہو تیرِ نگاہ — صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا

(۸) کیجئے تیغِ تبسم سے ہلاک — جو بھی اچھوں کو اچھا چاہیئے

گھبرا کر بات کر کے محبوب کو اپنی راہ پر لگانے کی جو تعلیم داغ نے مومن سے حاصل کی ہے اُس کا پرتو اوپر کے آٹھوں شعروں میں ہے (اور یہ آٹھ شعر اُن بے شمار شعروں میں سے چند ہیں جن سے بیان کے اس خاص پہلو کا اظہار ہوتا ہے) لیکن ان سب میں داغ، اُن کے محبوب اور اُن کے رقیب کے منفرد کرداروں کا بڑا واضح عکس موجود ہے۔ دوسرے اور چھٹے شعر میں اپنا مطلب نکالنے کے لئے داغ نے محبوب سے جو کنایہ کی بات کہی ہے اُس میں دونوں جگہ دھمکی کا سا انداز ہے "بس جان لو" اور "سمجھ کر سوچ کر" کا اندازِ تخاطب داغ کو بھی عجیب نہیں معلوم ہوتا اور محبوب بھی اسے خوشی سے گوارا کر لیتا ہے بلکہ اس طرزِ تخاطب سے متاثر ہو کر وہی کرتا ہے جو عاشق کا مدعا ہے۔ عاشق محبوب سے وصل کا طالب ہے اور وہ کسی طرح میسّر نہیں آتا۔ دعائیں بھی ہوتی ہیں تو بے تاثیر رہتی ہیں اور اس لئے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اور ایک کامیاب ایکٹر کی طرح آنکھوں میں ایک جذب کی کیفیت طاری کر کے عاشق کہتا ہے "بس جان لو تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور محبوب بے چارہ گھبرا کر دعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ کر کہتا ہے "خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔ اب ہم تمہارا کہا کریں گے"۔ یہی صورت چھٹے شعر کی ہے۔ داغ کا یہ کہنا کہ "سمجھ کر سوچ کر بیداد کرنا، محبوب کو نہ جانے کس کس وہم میں مبتلا کرتا ہے اور وہ جفا سے باز آجاتا ہے۔

اب آگے چلئے۔ مومن کہتے ہیں ؎

منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو — محفل میں، تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے

اور ؎

جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں — ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا

داغ بھی اسی طرح کی کوئی چال چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی چال کا انداز ہی اور ہے ؎

دیکھو دیکھو مجھ پہ برساتے رہو تیرِ نگاہ — صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا

محبوب ان کی طرف دیکھ رہا ہے اور یہ بے حد مسرور ہیں لیکن اتنے میں رقیب آجاتا ہے اور محبوب کی نظر پلٹ کر اُدھر جانے لگتی ہے۔ ابھی اپنا پورا سفر طے نہیں کر سکتی کہ داغ کی عیّاری ایک ڈرامہ کا روپ اختیار کر کے پوری فضا پر چھا جاتی ہے اور ہر طرف ایک شور سنائی دیتا ہے ؎

دیکھو دیکھو مجھ پہ برساتے رہو تیرِ نگاہ

محبوب کی نظریں گھبرا کر پھر ادھر پلٹ آتی ہیں اور عیار اس فرصت کو غنیمت جان کر کہتا ہے۔

؎ صید جس دم آنکھ سے اوجھل ہوا جاتا رہا

تماش بینی محبوب کی ایک ایسی کمزوری ہے جس سے داغ نے بار بار فایدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن رقیبانہ کردار کا جو عکس اس شعر میں ہے کسی اور میں کم ہوگا ؎

دیکھی نہ ہوگی سیر کبھی اس شکار کی — دیکھو رقیب پر سگِ درباں کو چھوڑ کر

اس مشورہ میں جس مدعا کا حصول مقصود ہے وہ ظاہر ہے لیکن مشورہ کی نوعیت میں عاشق کے کردار اور مزاج کی پستی اور

محبوب کی طبیعت کی پستی اُس سے بھی زیادہ ظاہر ہے اور واضح ہے۔

مومن کا محبوب "پردہ نشین" ہے اور وہ اُسے اپنی غرض مندی کی خاطر بھی بے پردہ نہیں کرنا چاہتے لیکن داغ تو ایسے جلووں کے بھوکے ہیں جن میں پردہ داری کو ذرّہ برابر دخل نہ ہو اسی لئے کنایۃً کہتے ہیں کہ ؎ "مگر ایسے ہی ویسے پردۂ محمل میں رہتے ہیں"

ان سب شعروں کو پڑھ کر بھی اسی طرح کے کچھ بدیہی نتیجے نکال سکتے ہیں جو مومن کے شعروں نے ہمارے ذہن پر مترتب کئے تھے۔

(۱) ان شعروں میں بھی عاشق محبوب سے کچھ چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے، التفات و توجہ کا، جلوۂ عام کا جو اس کے لئے مخصوص ہو، رقیب سے بے تعلقی کا، ظلم و ستم سے باز رہنے کا۔

(۲) ان ساری باتوں کا اظہار وہ بھی اپنی عادت اور اپنے معمول کے خلاف ایسے انداز میں کرنا چاہتا ہے کہ بات محبوب کو اپنے فایدہ کی بات معلوم ہونے لگے اور اس طرح وہ اسے زیادہ قابلِ اعتنا جانے۔

(۳) اس انداز کے اختیار کرتے وقت اُس کا اپنا مزاج اور محبوب کے معاملہ میں اُس کی ماہرانہ مزاج شناسی اُس کی رہبر و رہنما ہو

(۴) اور اس لئے اُس کے تخاطب کا طرز اُسی سطح کا ہے جس سطح کا اُس کا عشق اور اُس کا محبوب ہے۔

داغ کے اندازِ بیان کا ایک پہلو اور ہے جس پر مومن کے طرز کا اثر بہت واضح ہے۔ مومن نے اپنی غزل میں جہاں ایک طرف عاشقی اور محبوبی کے روایتی اور فرسودہ تصور کو چھوڑکر اُسے اپنی زندگی کا ترجمان بنایا ہے اور عشق کی ایک مریضانہ کیفیت کو احساس کی صحیح تازگی دی ہے دوسری طرف اُس کے اشاروں کنایوں اور علامتوں کو بھی اپنے لئے بیگانہ قرار دیا ہے۔ اُن کی غزل گل، بلبل اور شمع و پروانہ اور یہاں تک بادہ و ساغر کے سہارے کو اپنی بقا کا سہلا نہیں سمجھتی۔ کسی حد تک داغ کا بھی یہی حال ہے لیکن اُن میں چونکہ مومن کی شخصیت کی عظمت نہیں اس لئے وہ کبھی کبھی دریوزہ گری سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ مومن نے نہ صرف روایتی بیان کو ترک کیا ہے بلکہ کچھ ایسے لفظوں کے استعمال کو عام کیا ہے جو اُن کے مفہوم عشق کی وضاحت زیادہ صحیح طریقہ سے کر سکتے ہو۔ رقیب کے لئے دشمن اور غیر کے لفظ کی تخصیص تکرار اور کثرت اس کی ایک مثال ہے۔ داغ اس خاص معاملہ میں مومن کے بہت بڑے پیرو ہیں اور مومن کے "دشمن" اور "غیر" کو اُنھوں نے اُن کے مخصوص مفہوم سے وابستہ کئے بغیر بھی محض رسمًا برتا ہے۔ مثال کے لئے صرف چند شعر دیکھئے:-

احسان مانتا ہوں ستم ہائے غیر کا
بگڑا ہوا مزاج تمھارا بنا دیا

تم غیر کی تعریف کرو قہرِ خدا ہے،
معشوق کو یوں بندۂ احساں نہیں دیکھا

خوبیاں کل تو بیاں ہوتی تھیں
آج ہے شکوۂ اغیار یہ کیا

تم اپنے ہاتھ سے دو پھول غیر کو چن کر
یہ داغ کب دلِ امید وار سے اُٹھا

غیر بھی میری طرح کرتے ہیں آہیں کیونکر
ہم بھی دیکھیں تو پلٹتی ہیں نگاہیں کیونکر

سراغِ مہر و اُلفت غیر کے دل میں نہ پائیں گے
عبث وہ رات دن اس سعی بے حاصل میں رہتے ہیں

پائی مرے سُراغ سے دشمن نے راہِ دوست
اے بیخودی مجھے نہ رہا ہوشِ نقشِ پا

رشکِ دشمن نے مجھے آنکھیں دکھائیں دور سے
شوقِ نظارہ جو سوئے روزنِ در لے چلا،

دشمن کی ندامت نے اُنھیں پیار دلایا
اے کاش مرے ذمّہ بھی الزام نکلتا

الٰہی کیوں نہیں اُٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھکو ملال
دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

داغ ان شعروں میں 'غیر' اور 'دشمن' کے الفاظ کو استعمال تو کئے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں خیال کا انداز ایسا

نہیں جس کی بنا پر ان میں سے خاص لفظ کے اِس شعر میں ہونے کا جواز ثابت کیا جاسکے۔ جہاں رقیب کو 'غیر'! 'دشمن' کہا گیا ہے وہاں کچھ اور بھی کہہ دیا جاتا تو شعر کے مفہوم یا اُس کے مجموعی تاثر میں کوئی فرق نہ آتا اس لئے کہ مومن کے یہاں ان ان لفظوں کے استعمال کے ساتھ معانی کا جو خاص اور نازک مفہوم وابستہ ہوگیا ہے وہ داغ کے استعمال میں کہیں موجود نہیں۔ یہ لفظ تو غزلوں میں اس لئے لائے گئے ہیں کہ مومن نے ان میں ایک دلکشی پیدا کردی تھی۔

یہی حال 'پردہ نشین' اور "ہم نشین" کے لفظوں کا ہے، یہ دونوں لفظ داغ کے لغت میں داخل نہیں ہیں اُن کے چاروں دیوانوں میں مشکل سے چند شعروں میں ملتے ہیں اور اُن کی ان شعروں میں موجودگی مومن کی اثر آفرینی اور اثرانگیزی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فرق صرف یہی ہے کہ داغ نے 'دشمن' اور 'غیر' کے لفظ کو پوری آزادی سے اور جی کھول کر برتا ہے اور 'پردہ نشین' اور 'ہم نشین' کے لفظ ان کے مقابلہ میں اپنے شعروں میں کم لائے ہیں۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح اُن کا محبوب "پردہ نشینی" کے اوصاف سے بیگانہ ہے اسی طرح اُن کے عشق کو "ہم نشین" کی "ہم نشینی" گوارا نہیں۔

داغ کے کلام پر مومن کے رنگِ تغزل کے جو نقوش ہیں کہیں ہلکے، کہیں گہرے وہ خیال، فکر، جذبہ اور احساس کے علاوہ بیان کے مختلف پہلوؤں میں بھی طرح طرح سے اُبھرتے اور چمکتے ہیں اور اس کی وضاحت اُن بہت سی مثالوں سے ہوتی ہے جو تاثر کے اِن پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے سلسلہ میں اب تک پیش کی گئی ہیں لیکن داغ کی غزل پر مومن کی غزل یا اُن کے مخصوص اندازِ غزل کا اثر ان بے شمار جستہ جستہ شعروں میں بھی نظر آتا ہے جن میں داغ نے دانستہ یا غیر ارادی طور پر مومن کے کسی خاص مضمون سے خیال اور بیان دونوں کی شمعیں روشن کیں اور دونوں کو جلا دی ہے۔ اس طرح کی تھوڑی سی مثالوں کو اس "حکایتِ لطیف" کی آخری کڑی سمجھ لیجئے۔

مومن کی غزل کا ایک بے حد محبوب اور پسندیدہ مضمون وہ ہے جس میں مومن نے اپنے عشق کے اُس پہلو کو بے نقاب کیا ہے جہاں وہ مومن ہوکر بھی بتوں کے پجاری ہیں۔ مومن نے اپنے مقطعوں میں اپنے تخلص کے بے تکلف صرف سے ایسے ایسے فایدے اُٹھائے ہیں کہ شاعروں کو اُس پر رشک آتا ہے اور شعر سے لطف لینے والے اُس پر سر دھنتے ہیں۔ مومن کا تخلص اور اس تخلص کی آغوش میں پرورش پانے والی دین داری ایک طرف اور صنم پرستی کی لذت دوسری طرف — ان دونوں کے جو جو تصادم مومن کے مقطعوں میں ہوئے ہیں اُن میں جیت ہمیشہ بتوں ہی کی ہوئی ہے اور یہ جیت کبھی کبھی تو ایسی ہے کہ بڑے بڑے خدا پرست کو کعبہ کا مجاور بننے کے بجائے صنم خانہ کا پجاری بننے کی ترغیب دلاتی ہے۔ مومن کے بارہا سنے ہوئے شعروں میں سے چند کا اعادہ شاید اس جگہ بے محل نہ ہو۔

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں
خیر ہے مومن تمھیں کیا ہوگیا

رات دن بادۂ و صنم مومن
کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا،

عرضِ ایماں سے ضد اُس غارت گرِ دیں کی بڑھی
تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

زانوئے بُت پہ جان دی دیکھا
مومن انجام و اختتام مرا،

چھوڑ بُت خانہ کو مومن سجدہ کعبہ میں نہ کر
خاک میں ظالم نہ یوں قدرِ جبیں سائی ملا

مومنِ دیندار نے کی بُت پرستی اختیار
ایک شیخِ وقت تھا سو بھی برہمن ہوگیا

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ہم بندگیِ بُت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

ان شعروں پر کسی تبصرہ کے بغیر اب داغ کے کچھ شعر دیکھئے ؎

وہ بُت دل میں مہماں ہوا چاہتا ہے، نیا دین و ایماں ہوا چاہتا ہے
لو اے سنو سنو کہ وہ داغِ صنم پرست مسجد میں جا کے آج مسلماں ہو گیا
ڈرو اللہ سے اے داغ دیکھو ہوش میں آؤ بتوں کی یاد میں غافل خدا سے اس قدر رہنا

چاہئے تو اس جگہ مومن کا یہ شعر ایک بار پھر پڑھ لیجئے ؎

رات دن بادۂ و صنم مومن کچھ تو پرہیز گار ہونا تھا،
کم ہو گا داغ سا بھی مکار اس جہاں میں اُس بُت پہ شیفتہ ہو اور نام لے خدا کا
ہوئے ہیں داغ کے مذہب سے حیراں کافر و مومن کبھی اس حال میں دیکھا کبھی اُس حال میں دیکھا

مومن کا شعر ہے ؎

دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومن ہو رہے وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا
بے نیازی کی ادا ان میں نہ ہوتی ہرگز داغ یہ بُت جو نہ اللہ کے پیارے ہوتے
پھر اُس بُت پر فدا ہیں حضرتِ داغ قسم کھائی تھی کعبہ میں خدا کی
بندۂ عشق ہو ایسے کہ الٰہی توبہ تم تو معشوق کو اے داغ خدا مان گئے

داغ کے ان شعروں میں بندگیِ عشق، شیفتگیِ بُت اور دینداری اور صنم پرستی کی جو کشمکش ہے اُسے داغ کے مزاج اُن کے تصورِ عشق اُن کی شاعری کے مجموعی انداز اور خود اُن کے تخلص سے کوئی مناسبت اور مطابقت نہیں لیکن مومن کے رنگِ تغزل سے اُنھیں جو فطری مناسبت اور اس لئے شیفتگی ہے اُس نے اُن سے یہ شعر کہلوائے ہیں۔ اور ایسے شعر تو داغ پورے کلام میں سیکڑوں ہیں جنھیں پڑھ کر ذہن فوراً مومن کے کسی نہ کسی مشہور شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ صرف چند شعر سُن لیجئے

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے آنکھوں سے کبھی اُس کو پشیماں نہیں دیکھا (داغ)
پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے (مومن)
خدا کا ذکر تو اُس بُت کے سامنے کرتے مگر وہ ایک ہی کافر ہے خود پسندوں میں (داغ)
خدا کی یاد دلاتے ہیں ہجر میں احباب ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا (مومن)
جوابِ وصل سے کیونکر نہ ہوں میں شادیٔ مرگ خوشی بھی اور خوشی دل رُبا کے آنے کی (داغ)
خوشی نہ ہو مجھے کیوں کر قضا کے آنے کی خبر ہے لاش پہ اُس بے وفا کے آنے کی (مومن)
گیا رقیب کے گھر بارہا شبِ وعدہ بہت ذلیل مجھے تیری جستجو نے کیا، (داغ)
اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا (مومن)
کہا ظالم نے میرا حال سُن کر وہ اِس جینے سے مر جائے تو اچھا (داغ)
مرچکیں کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بُری طرح (مومن)
خدا جانے کہے کیا جا کے قاصد، دل اس سے پیشتر جائے تو اچھا (داغ)
رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل، نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے (مومن)
بتوں سے عفوِ جرمِ عشق بھی چاہیں تو کہتے ہیں خدا تو ہم نہیں بخشیں گنہ امیدواروں کا (داغ)
مُنے کیوں عرض مضطرب مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا (مومن)
فکر ہے دوست کو احوال سناؤں کیونکر ٹکڑے ہوتا ہے کلیجہ مرے افسانے سے (داغ)

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں   کہ سخت چاہئے دِل اپنے راز داں کے لئے   (مومن)

ان شعروں کی حیثیت 'مشتے نمونہ از خروارے' کی ہے، ورنہ مومن اور داغ کے کلام کو اس نظر سے پڑھا جائے کہ دونوں کے یہاں سے مشترک مضمونوں کے اشعار کی تلاش مقصود ہو تو ایسے سیکڑوں شعر ملیں گے جس میں داغ نے خیال کی شمع مومن کے چراغ سے روشن کی ہے۔ یہ فرق البتہ ہوگا کہ اس شمع پر فانوس خود داغ نے چڑھایا ہے اور یہ صورت تاثر کی ان اکثر مثالوں میں موجود ہے جو اب تک پیش کی گئی ہیں۔ داغ، مومن کے ایک خاص انداز سے متاثر ہوئے اور اُن کی شخصیت نے اس انداز کو اپنے خاص رنگ میں رنگ لیا پھر بھی دونوں رنگوں کی آمیزش ایک ایسا رنگ پیدا کرتی ہے کہ اُس میں دونوں کی شوخی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ داغ کو لوگ کو اپنی انفرادیت کی وجہ سے پسند کرتے اور سراہتے ہیں، آئندہ بھی ایسا ہوگا لیکن اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ داغ کو داغ بنانے میں جہاں اور بہت سی چیزوں کا حصہ ہے مومن کے تغزل کو بھی اس میں خاصا دخل ہے اور اس دخل نے بہرحال اچھے نتیجے پیدا کئے ہیں، خیال کے اعتبار سے بھی اور اظہار و بیان کے اعتبار سے بھی۔ یہ ممکن ہے کہ خود داغ کو اس کا احساس نہ ہو۔

گوشوارۂ کلامِ داغ

نام دواوین	غزلیات تعداد اشعار	رُباعیات	مخمسات	مسدس	قصائد	قطعات تاریخی	قطعات غیر تاریخی	سہرا	سلام	اشعار متفرق	جملہ تعداد اشعار
گلزارِ داغ	۳۸۹ / ۴۹۴۳	۷	۶ / ۷۵ بند	۱ / ۲۳ بند	۲ / ۱۲۰ اشعار	۲ / ۲۰ شعر	۰	۰	۰	۰	۵۲۷۸
آفتابِ داغ	۱۲۹ / ۱۴۵۲	۸	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۴۶۸
مہتابِ داغ	۲۹۲ / ۴۱۷۶	۱۹	۲ / ۱۷ بند	۰	۶ / ۵۱۰ اشعار	۴۳ / ۳۳۰ شعر	۴ / ۴۶	۴ / ۴۰	۲ / ۲۳	۱۲۰	۵۳۱۸
یادگارِ داغ	۱۵۶ / ۱۶۷۲	۸	۰	۰	۲ / ۱۹۶ اشعار	۶۴ / ۱۲۹ شعر	۳ / ۵۶	۲ / ۳۳	۱ / ۲۱	۱۰۸۸	۲۶۱۱
میزان	۹۶۶ / ۱۲۲۴۳	۴۲	۸ / ۹۲ بند	۱ / ۲۳ بند	۱۰	۱۰۹	۷	۶	۳	۱۲۰۸	۱۴۹۶۵

(داغ - نوراللہ محمد نوری)

داغ عظیم آباد میں

(ڈاکٹر مُبارک حسین مُبارک عظیم آبادی)

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا　　داغ آیا تو باغ باغ آیا

استادی حضرت داغ مرحوم کے عظیم آباد آنے کا ذکر سرسری طور پر بعض تذکروں میں مذکور ہے۔ تاریخ ادب اردو مؤلفۂ بابو سکسینہ مترجمہ میرزا عسکری مرحوم (صفحہ ۳۶۷) میں بھی لکھا ہے کہ لکھنؤ، پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ لیکن عظیم آباد آنے کا سبب، ورود، استقبال و خیر مقدم، جائے قیام وغیرہ کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

پچیس برس قبل تک ایسے چند اشخاص بقید حیات تھے جو ان کیفیتوں کو بچشم خود دیکھ چکے تھے لیکن اب چشم دید واقعات بیان کرنے والے کوئی موجود نہیں، خود میری عمر چھیاسٹھ برس کی ہے اور ان واقعات کو بہتّر برس ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اُس وقت میرا عنفوانِ شباب تھا اور سن کے تفاوت کے سبب میں خود اس انجمن میں شریک نہ تھا جس میں شعرائے عظیم آباد پروانہ دار داغ کے گرد جمع ہوتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ اِن سطور میں عرض کروں گا، اُن میں کچھ تو وہ واقعات ہیں جنھیں میں نے خود میر باقر صاحب مرحوم سے (جن کے مکان میں استاد مُقیم ہوئے تھے) سنا ہے اور کچھ وہ واقعات ہیں جنھیں اس صوبہ کے مشہور و معروف مورخ فصیح الدین بلخی صاحب (مولف تاریخ بہار مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند) نے میر باقر مرحوم اور اُن کے بعض رفقا سے دریافت کرکے اپنی یادداشت میں محفوظ رکھا ہے۔ بلخی صاحب موصوف کے پاس نادر تاریخی مواد کے علاوہ مشاہیر کے حالات کا جو ذخیرہ ہے اسی میں مجھے حسن اتفاق سے اُستاد مرحوم کے عظیم آباد آنے کے متعلق وہ تاریخی قطعات ("تاریخ قدوم" مصنفۂ حضرت شاہ محمد یحییٰ صاحب ابوالعلائی سجادہ نشین خانقاہِ ابوالعلائیہ محلہ شاہ کی املی پٹنہ) خود مصنف کے دستِ خاص کے لکھے ہوئے مل گئے جن کو شاہ صاحب مرحوم نے اُستاد مرحوم کی ملاقات کے بعد ہی نظم کئے تھے۔ غرض ان سطور میں جو واقعات مذکور ہیں اُن کی صحت و صداقت میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں اور اُن کی تصدیق بیشتر خود مثنوی فریادِ داغ کے اشعار سے ہوتی ہے۔ یہ اشعار جابجا ذیل میں اپنے اپنے موقع پر درج ہیں۔

تشریف آوری کے اسباب — گلزارِ داغ کی اشاعت سے استاد مرحوم ہندوستان میں ایک مشہور و معروف سخن گو اور صاحبِ طرز شاعر تسلیم کرلئے گئے تھے۔ ان کی غزلیں عام طور پر محفلوں میں گائی جاتی تھیں اور بہتیرے اشعار شعرا کے زبان زد تھے۔

اس زمانہ میں یعنی ۱۲۹۹ھ کے قبل سے استاد مرحوم کے علاتی بھائی اور شاگرد مرزا شاہ محمد عرف مرزا شاغل عظیم آباد میں مقیم تھے۔ یہ شاعری اور شطرنج بازی کے دلدادہ تھے۔ عظیم آباد میں میر محمد باقر تخلص باقر مرحوم ساکن گرہٹہ جو ایک قدیم خاندان کی یادگار اور شاعری میں حضرت وحید الہ آبادی کے شاگرد اور خوشنویسی میں استاد تھے۔ شاعری اور شطرنج بازی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ ان کے مکان پر دن بھر شاعری اور شطرنج بازی کے چرچے اور مشغلے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں میر باقر اور مرزا شاغل کے درمیان بے حد ربط و اتحاد تھا۔ میرزا صاحب نے میر صاحب ہی کے مکان کو اپنی نشستگاہ قرار دیا تھا۔ ۱۲۹۹ھ میں استاد مرحوم نے رامپور سے کلکتہ جانے کا قصد کیا تو مرزا شاغل کو بھی اپنے ارادہ کی اطلاع دی یہاں انھوں نے لوگوں سے اس کا ذکر کیا تو شہر کے رؤسا اور

شعرا نے باصرار اِن سے خط لکھوایا کہ راہ میں کچھ دن یہاں بھی ضرور قیام کیجئے۔ اُستاد مرحوم کو بھی یہاں آنے کا اشتیاق تھا۔ رام پور سے دہلی پھر لکھنؤ آکر وہاں سے کانپور الہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد تشریف لائے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

مل گئی جب حضور سے رخصت — میں ہوا رام پور سے رخصت
چل کے دلّی سے لکھنؤ پہونچا — ہمہ تن شوق و آرزو پہونچا
راہ میں کان پور الہ آباد، — میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد
اتنے میں آگیا عظیم آباد، — تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد

عظیم آباد میں استقبال اور جائے قیام ۔ اُستاد مرحوم نے لکھنؤ ہی سے اپنے آنے کی تاریخ اور وقت کی اطلاع بھیجدی تھی مرزا شاغل نے رؤسا اور شعرا کو اس کی خبر کردی تھی۔ گاڑی پہونچنے کے وقت شعرا کے علاوہ کئی رئیس اپنی اپنی سواریاں لیکر اسٹیشن پر موجود تھے۔ استاد مرحوم اُتر پڑے مجمع سے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے ہر ایک رئیس اصرار کررہا تھا کہ میرے ہاں چل کر قیام کیجئے آخر بھیڑ کو چھانٹتے ہوئے مرزا شاغل آئے تو استاد مرحوم نے کہا کہ حضرات کے خلوص و اخلاق کا ممنون ہوں فی الحال مجھے اجازت دیجئے کہ مرزا شاغل کے ساتھ جاؤں پھر آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گا۔ اس کے بعد مرزا شاغل اُن کو میر باقر مرحوم کے مکان پر لے گئے۔ اس واقعہ کو استاد مرحوم نے اس طرح نظم کیا ہے:۔

پیشوائی کے واسطے احباب، — آئے تھے شوقِ دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے — اپنی اپنی سواریاں لائے

. . . .

کوئی کہتا تھا مرے گھر چلئے — اِس طرف آیئے اِدھر چلئے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا — رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے — میرزا شاغل آئے جب وہ ہٹے
میر باقر کے گھر قیام ہوا، — خوب دعوت کا اہتمام ہوا

اہلِ شہر سے ملاقاتیں ۔ فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے — بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے (داغؔ)

اُستاد مرحوم کے آتے ہی میر باقر مرحوم کا مکان ایک تماشا گاہ بن گیا۔ دن بھر جوق جوق ہر طبقے اور مذاق کے لوگ اُن سے ملنے کو آتے تھے اور وہ بھی بعضوں کے گھر بازدید کو تشریف لے جاتے تھے۔ اور دعوتیں شعراء و ادبا کی ہوتی تھیں اور ماہرانِ موسیقی کے جلسے ہوتے تھے۔ استاد مرحوم موسیقی کے بھی شایق تھے اور صوفیانہ طریقت کے بھی دلدادہ۔ اس سلسلہ میں وہ شاہ یحیٰی صاحب مرحوم سجادہ نشین خانقاہِ ابوالعلائیہ محلہ شاہ کی املی عظیم آباد کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب مرحوم تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے اور اپنے زمانہ کے ہر واقعہ کی تاریخ نظم کرکے اپنے سفینے میں لکھ لیا کرتے تھے چنانچہ اس ملاقات کی تاریخ تین قطعوں میں اسی طور پر نظم کی ہے۔

"قطعہ تاریخ قدوم نواب مرزا صاحب متخلص بہ داغ از رامپور عظیم آباد"

جنابِ داغ در شہرِ من آمد — رسیدند آرزومنداں زہر سو
بہ لوحِ دہر تاریخِ قدومش — رقم کردم قدومِ داغِ حق گو
۱۲۹۹ھ

ایضاً

جناب داغ عالی جاہ آمد در عظیم آباد
مثالِ گل بہار افزائے دل، چوں ماہ نور افشاں

ہمیں مصراعِ تاریخ از درونِ من بروں آمد
رسیدہ مرہمِ دلہائے رنجوراں، انیسِ جاں

سنہ ۱۲۹۹ھ

ایضاً

یکتائے زمانہ داغ خوشگو
در ملکِ سخنوری بود شاہ

در وصفِ کمال آں سخنور
دامانِ دراز نظم کوتاہ

امروز بہ ارضِ ہند مثلش
نبود یک فرد یعلم اللہ

در پٹنہ برائے سیر آمد
نور افشاں، نور پاش چوں ماہ

شد طبع نیاز مند مسرور
از دیدنِ آں یگانہ دلخواہ

تاریخِ قدوم اگر بہ پُرستر
گو۔ مقدم داغِ صاحبِ جاہ

سنہ ۱۲۹۲ھ

اشخاصِ عظیم آباد کی تعریف - خود اُستاد مرحوم بھی یہاں کے لوگوں سے مل کر بہت محظوظ ہوئے چنانچہ خود فرماتے ہیں :-

ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی
یہ مروت کہیں نہیں دیکھی

کیسی مہماں نوازیاں دیکھیں
کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں

ان کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو
ان کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو

دیں وہ مہماں کو جسقدر چاہیں
بخشدیں گھر کا گھر اگر چاہیں

تشریف آوری کے اعزاز میں مشاعرے - یوں تو روزانہ بہت اشخاص ملنے کو آتے تھے اور غزلیں پڑھنے کی فرمائش کرتے تھے۔ لیکن خاص طور پر تشریف آوری کے اعزاز میں دو مشاعرے منعقد ہوئے۔ اول مشاعرے کی کیفیت یہ ہے کہ میر باقر مرحوم نے اپنے استاد وحید الہ آبادی کا یہ مطلع ؎

اُدھر آئینہ رکھا ہے اِدھر وہ تن کے بیٹھے ہیں
جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

پڑھا تو استاد مرحوم نے بھی اس کی تعریف کی اس پر میر باقر مرحوم کی تحریک اور اہلِ جلسہ کی تائید سے یہ بات قرار پائی کہ ایک اعزازی مشاعرہ منعقد ہو اور اس مطلع کا مصرع اول طرح قرار پائے۔ استاد مرحوم سے بھی غزل کی فرمائش کی گئی۔ گرمی کا موسم تھا آپ صحن میں ٹہل رہے تھے فرمایا بہتر ہے ابھی غزل کہ لوں پھر لوگ ملنے کو آجائیں گے تو مشکل سے موقع ملے گا، دو شخص قلم دوات اور کاغذ لے کر سامنے بیٹھ گئے۔ چند لمحہ تامل کرکے آپ نے کاتبوں سے کہا کہ اچھا یہ مصرعہ لکھ لو ؎

”بھویں تنتی ہیں خنجر ہات میں ہے تن کے بیٹھے ہیں“۔ پھر کچھ دیر تامل کرکے فرمایا ؎ ”کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں“

غرض اِس طور پر فی البدیہہ بہت سے اشعار لکھوائے اور اس کے بعد کاتبوں سے مسودہ لیکر خود دیکھنے لگے۔ بعض اشعار کو قلم زد کرکے بعض میں خفیف تبدیلی کی اور منتخب اشعار کو اپنی بیاض میں نقل کرلیا۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ اتنے اشعار قلم زد کیوں فرمائے گئے۔ ہنس کر فرمایا کہ جس کو پسند آئیں وہ لے لے۔ تاریخ مقررہ پر مشاعرہ ہوا تو اول غیر طرح جو غزل پڑھی اُس کا مطلع اس جگہ نقل کرتا ہوں۔ پوری غزل آفتابِ داغ میں موجود ہے :-

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے
ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے

کھاتے ہیں داغ دوست مرے دل کے داغ سے
سچ ہے چراغ ہوتا ہے روشن چراغ سے

طرح کی غزل کے ایک شعر کو لوگوں نے کئی کئی بار پڑھوایا اور اس قدر داد دی کہ واہ وا اور سبحان اللہ کی صدا سے مکان گونج اٹھا جان علی خاں مرحوم اور منور علی خاں مرحوم دو بزرگ جو اس مجمع میں موجود تھے یعنی صاحب مذکور الصدر سے بیان کرتے تھے کہ اس شعر کو لوگوں نے دس بار سے کم نہیں پڑھوایا ہوگا اور مجمع میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس کو یہ شعر یاد نہ رہ گیا ہو ؎

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے ۔ کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں ،

شاید اس محل پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ حضرت امیر مینائی نے جب اس زمین میں غزل کہی تو مقطع میں استاد مرحوم کی غزل کی یوں داد دی ہے ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے ۔ بھویں تنتی ہیں خنجرہائے عریاں ہیں ہے تن کے بیٹھے ہیں

دوسرا مشاعرہ ۔ دوسرا مشاعرہ بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس مشاعرہ کی طرح میں بھی استاد مرحوم نے سیر غزل پڑھی جس کا مطلع یہ ہے ؎ (آفتاب داغ)

طور کے پہلو میں اک تبخانہ ایسا چاہئے
شور اُٹھے جلوۂ جانانہ ایسا چاہئے

اِس مشاعرہ میں بھی استاد مرحوم کی غزل سابق مشاعرہ کی طرح بیحد مقبول ہوئی ۔

مدتِ قیام ۔ استاد مرحوم اپنی اول تشریف آوری قیام کے متعلق فریادِ داغ میں یوں تحریر فرماتے ہیں :۔

آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی ، یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی
کیا قیامت تھی شہر کی گرمی ، کاش گنگا میں ڈوبتی گرمی
آگ کی طرح آپ میں گرمی ، مثل اخگر حباب میں گرمی
طبع گرمی سے کیوں نہ عاری ہو ، جائے نوری وہاں تو ناری ہو
بے جلے کوئی استخواں نہ رہے ، عنصر آب کا نشاں نہ رہے
رنگ جل جل کے ہو گئے کاجل ، جل گئے لے چلے جو گنگا جل
شعلہ زن ہو تنورِ طوفاں بھی ، کانپتا ہے یہاں زمستاں بھی
رنگت آخر طپش سے زرد ہوئی ، گرمیِ طبع داغ سرد ہوئی
سوئے کلکتہ میں روانہ ہوا ، دور تک ساتھ اک زمانہ ہوا

نظم بالا سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ استاد مرحوم یہاں صرف آٹھ دن ٹھہرے ۔ مگر تشریف آوری کے اعزاز میں دو تین مشاعرے ہوئے (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) اِس آٹھ دن کی قلیل مدت میں دو تین طرحی مشاعروں کا منعقد ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے ۔ اول مشاعرے کی طرحی غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اِس مقطع سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ساون سے پہلے آئے اور اتنا پہلے آئے کہ دو تین طرحی مشاعرے منعقد ہو سکے ۔ تشریف آوری کس مہینے میں ہوئی اس کا پتہ نہیں چلتا ۔ قیاس سے کام لیا جائے تو جیٹھ یا بیساکھ میں تشریف لائے ہوں ، یہ گرمیوں کی گرم بازاری کا زمانہ ہو ۔ گرمی کی جو شکوہ سنجی کی گئی ہے وہ اس کی تصدیق کرتی ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کلکتہ نہیں جاسکے وہاں یہاں سے زیادہ گرمی ہوگی ۔ اس لئے ساون کے منتظر یہاں رہے ۔

یہاں مشہور ہے کہ استاد مرحوم ایک بار اور بھی یہاں تشریف لائے تھے مگر یہ شہرت غلط ہے تحقیقات سے معلوم ہوا کہ استاد مرحوم کے ایک شاگرد تخلص وفا بہار شریف کے رئیسِ اعظم اُنھوں نے استاد مرحوم کو بہار شریف تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ مگر کسی وجہ سے تشریف نہ لاسکے۔ وفا صاحب مرحوم کے بیٹے، پوتے اور خاندان کا خاندان بہار شریف میں موجود ہے۔ مجھ کو اُن لوگوں سے یہ معلوم ہوا ہے۔ اس سفر کے بارے میں استاد مرحوم کی وہ غزل جو آفتابِ داغ میں ہے جس کا یہ مقطع ہے ؎

اجمیر ہو کے جائیں گے اے داغ ہم بہار
اب کے برس سفر کا ارادہ ہی اور ہے

اس مقطع میں بہار سے بہار شریف مراد ہے۔ غرض چمن زار عظیم آباد میں استاد مرحوم کی آمد ایک بہار کی مانند تھی جو غنچہ و گل کو شگفتہ کرکے روانہ ہوگئی۔

داغ کے دو غیر مطبوعہ خط

نواب میر حسن علی خاں کے نام

(مرسلۂ یاسین علی خاں بی۔ اے۔ حیدرآباد)

(۱) نواب صاحب تغافل شعار سلمہ اللہ تعالےٰ

تین دن سے خط کا منتظر ہوں، جواب ندارد۔ لفظ بی جو شرح کے واسطے ہے اس پر خفا ہوئیں۔ میں نے خوب جھاڑا ہے۔ کچھ روپیہ لڑکی سے لیا۔ پچاس یہاں سے گئے۔۔۔۔۔۔ آپ سے مانگتی ہے۔ ذرا ان کو جھاڑئے گا۔ میں نے جو ان کو خط لکھا ہے وہ ان کے خط میں ہے اس کو ان سے لے کر آپ پہونچائیں تو زہے عنایت، ایک غزل ملفوف اور بھیجتا ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ پہلی سب غزلیں مبیضہ صاف چڑھ گئیں کہ ابھی کوئی باقی ہے۔ یہاں خیریت ہے۔ گرمی کی شدت ہے۔ بچوں کو دُعا کہئے۔ فقط فصیح الملک داغ دہلوی ۔ ۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ

---

(۲) نواب صاحب تغافل شعار

کال ایک ہفتہ کے بعد آپ کا خط ملا۔ کیفیت معلوم ہوئی۔ آپ کی استانی کا خط بھی ملا۔ آج تک میں نے کسی کو آپ کا شاکی نہیں پایا۔ بندۂ خدا تم نے اپنی استانی کو ناراض کیا۔ میرے گھر گئے اور بغیر کھانا کھائے وہاں سے چلے گئے۔ وہ تم سے سخت ناراض ہیں۔ تمھاری یہ حرکت مجھے بھی پسند نہیں آئی۔ جلد جائیے اور ان کے راضی کرنے کی کوئی صورت نکالئے ورنہ مجھ پر وبال آئے گا۔ خدا آپ سے جلد ملائے۔ فکرِ قرض کھائے جاتا ہے۔ بچوں کو دعا فقط

فصیح الملک داغ دہلوی

۱۳ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ

کلامِ داغ میں محبوب کا تصوّر

(پروفیسر شریف انصاری - لاہور)

انسانی زندگی میں عشق و محبت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں انسان فطرتاً حُسن پرست واقع ہوا ہے اور حُسن و جمال سے تاثر و تلطف اُس کے خمیر میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حُسن و محبت کی داستان اپنی کہنگی و فرسودگی کے باوجود بہت ہی دلچسپ و بوقلموں ہے۔ غزل درحقیقت اس داستان کا ایک دلفریب اسلوبِ بیان ہے۔ لیکن جس طرح داستانِ محبت کا محور ایک پیکرِ جمال ہونا ضروری ہے اُسی طرح غزل میں محبوب کا تصور بھی ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو غزل کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنفِ سخن بھی دیگر اصناف کی طرح انقلاباتِ زمانہ کے ساتھ بگڑتی اور بنتی سنورتی رہی ہے۔ سوسائٹی کے مذاق اور کلچر کا اثر اس پر بھی ہوا ہے اور اس کے رجحانات میں بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات میں بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات میں محبوب کے تصور کی تبدیلی بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے جس نے کبھی کبھی اس کی پوری دُنیا ہی بدل ڈالی ہے۔

غزل وہ صنفِ سخن ہے جس کا وجود سوائے شعرائے ایران کے اور کہیں نہیں ملتا۔ ایرانیوں نے اپنے مزاج و ماحول کو اس میں سموکر اسے ایک مخصوص رنگ دیا۔ فارسی کے ذریعہ یہ اُردو میں پہونچی اور اپنے ساتھ کچھ روایات بھی لائی۔ غزل کی اِن روایات کو ہندوستان میں تقویت اس لئے پہونچی کہ کم ازکم شمالی ہند میں مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت اور زبان بالکل ایرانیوں کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ایران میں غزل کو سب سے زیادہ عروج تصوف کی تحریک سے ہوا تھا۔ اس تحریک نے ایک طرف تو برتری و عظمت پیدا کرکے اُسے قربِ الٰہی کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف سچا عشق غیر جنس کے ساتھ کرنا سکھایا۔ ہندوستان میں غزل کا عہدِ زریں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایسا پُرآشوب زمانہ تھا جس میں لوگوں کے ذہنوں پر پست خیالات چھا رہے تھے دُنیا کی بے ثباتی، تقدیر کی حد بندی، ایک عام ہراس، ناامیدی اور یاس لوگوں کے دلوں میں گھر کرگئی تھی۔ انھیں حالات کا نتیجہ تھا کہ اس دور میں تصوف کا زور ہوا۔ تصوف کے اس زور نے ایرانی روایت کو اور چوکھا کردیا۔ چنانچہ ہمارے شعرائے متقدمین نے اس رنگ کو اپنایا اور اُردو غزل میں محبوب کے دو تصور قایم ہوئے ایک حقیقی، دوسرا مجازی۔ مجازی معشوق کا اطلاق ایک مرد پر بھی ہوتا ہے اور ایک عورت پر بھی۔

خواجہ میر دردؔ کا کلام عشق حقیقی کے رنگ میں رچا ہوا ہے جس میں اُن کا روئے سخن زیادہ تر ذاتِ باریِ تعالیٰ کی طرف ہے اور جہاں کہیں حقیقی و مجازی دونوں رنگوں کی جھلک ہے وہاں انھوں نے اپنے لب و لہجہ نیز ایمائی اندازِ بیان سے ایسا مبہم کردیا ہے کہ یا تو حقیقت ہی کی چھاپ لگ جاتی ہے یا پھر یہ نہیں کھُلتا کہ محبوب کوئی مرد ہے یا عورت۔ البتہ میر تقی میرؔ کے تغزل میں محبوبِ حقیقی سے تخاطب کم اور مجازی سے زیادہ ہے۔ اُن کا مجازی محبوب ایک امرد ہے۔

تاہم میرؔ کے کلام کا بیشتر حصّہ وہ ہے جہاں محبوب کی جنسیت کا پتہ نہیں چلتا، تغزل کے اس حصّہ میں میرؔ نے اپنے عشق و محبت سے لبریز جذبات کی ایسی سچّی تصویریں کھینچی ہیں کہ ناظر اُنھیں دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے۔ دردؔ کا حقیقی عشق ہمارے

فطرت میں بلندی اور روح میں بالیدگی پیدا کرے تو کرے لیکن اُس میں مجاز کی سی دلکشی نہیں پائی جاتی۔ میر کا محبوب مجازی ہے مگر اُس سے نباہ میر کے سے سلیقہ شعار عاشقوں کا کام ہے بعد کے متغزلین میں جرأت، غالب، مومن اور پھر داغ نے ہمیں ایک ایسے محبوب سے روشناس کرایا ہے جسے انسان نے ہمیشہ اپنی محبوب ترین چیز سمجھا اور وہ "عورت" ہے۔ محبوب کی شکل میں یہ عورت اپنی ساری دلربائیوں کے باوجود اہلِ نظر کی آنکھ کا سرمہ اور صاحبِ دل کے زخموں کا مرہم ہے۔ یہ ہرجائی بھی ہے اور اکثر جگہ اس کسی شاہد بازاری کی شوخی و بے باکی کا پرتو بھی ہے یہ پرتو ان اساتذہ کے مخصوص ماحول، رنگِ طبیعت اور جذبات کے تحت ہلکا اور گہرا دونوں ہے۔ جرأت اس صحت مند تصور کے بانی ہیں، اور اُن کے کلام کا یہ حقیقت پسندانہ پہلو اُنھیں معاصرین میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔

جرأت دلی کے تھے مگر ذہنی طور پر وہ بلاشبہ لکھنوی تھے۔ لکھنؤ کے درباروں، راگ رنگ کی محفلوں اور حسینوں مہ جبینوں کی صحبتوں میں اُن کا کافی وقت گزرا بنابریں اُن کے تغزل میں چھچھلا پن، ہوس پرستی اور لطیف سی خارجیت ہے۔ اُن کی معاملہ بندی میں کوئی حجاب نہیں۔ اُنھوں نے اشاروں کے بجائے تفصیل سے کام لیکر اپنے کلام میں ایک عیب کو راہ دی ہے جس سے وہ بچ بھی سکتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ بصارت سے محروم ہوجانے کے بعد اُن میں جو ایک احساس کمتری پیدا ہوا تھا وہ اُن کے کلام میں اس عریانی کی شکل میں ظاہر ہوا ہو، بہرصورت اسباب کچھ بھی ہوں اُن کے عشق و محبت میں رکھ رکھاؤ نہیں۔ چنانچہ اُن کا محبوب بھی پست ہے۔ اُس کی رفتار و گفتار، ناز و انداز اور شوخی و شرارت میں ایک چھچھورا اور بازاری پن ہے۔ ذیل کے چند اشعار اس کی وضاحت کردیں گے ؎

شب گھر جو رہا مرے وہ مہماں　　تھا صبح یہ کس ادا سے کہنا
طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے　　قربان گیا یہاں کا رہنا

بیٹھیں کیا دور، کہ چاہے ہے یہی کثرتِ شوق　　آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھے
کیا رُک کے وہ کہے ہے جو ٹک اُس سے لگ چلوں　　بس بس پرے ہو، شوق یہ اپنے تئیں نہیں

مرزا غالب نے "سبزۂ خط" کا دو ایک جگہ تذکرہ تو کیا ہے مثلاً ؎

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　　یہ زمرد بھی حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

یا:- آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست　　دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

مگر یہ محض رسم پوری کی ہے ورنہ اُن کا محبوب بھی اُسی قبیل کا ہے جس قبیل کا جرأت کا محبوب ہے، اُن کے جذبات کے اظہار میں اُن کی ذہانت، طباعی اور شگفتہ مزاجی کو بڑا دخل تھا۔ وہ اپنی واردات قلبیہ کے بیان بڑی پُر لطف باریک بینی سے کام لیتے ہیں اُن کے محبوب کی باتوں میں عبارت، اشارت اور ادا کی کارفرمائی ہے۔ اُن کا محبوب کوئی بھی ہو اُن کے عشق میں ایک وضعداری اور بلندی ضرور ملتی ہے۔ وہ وصل کی آرزو میں مرتے ہیں مگر ہوسناکی میں مبتلا نہیں ہوتے۔

عاشق مزاج مومن بھی غالب کی طرح ایک انفرادیت کے مالک ہیں۔ لیکن دونوں کی انفرادیت میں فرق ہے۔ مومن کی بعض خصوصیات اُنھیں غالب سے ممتاز کرتی ہیں۔ غالب اپنی رند مشربی اور ظرافت کے باعث کہیں کہیں کھل جاتے ہیں اسکے برعکس مومن نازک خیالی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ہیں۔ غالب نے امرد کا تذکرہ روایتاً سہی کیا ضرور ہے مگر مومن کے کلام میں ڈھونڈے سے بھی ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو کسی "سبزہ آغاز" کے بارے میں ہو۔ مومن کا محبوب بھی جرأت و غالب کی طرح "پری وش" ہی ہے لیکن اُس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ "پردہ نشین" ہے جس کی طرف مومن نے باربار اشارے کئے ہیں۔ مومن کو غالب کی طرح فلسفہ و تصوف سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اُن کا عشق خالصتہً مجازی تھا۔ بنابریں

اُن کے کلام میں صرف وارداتِ حسن و عشق کا تجزیہ و تذکرہ ملتا ہے۔ تاہم اس مجاز کے بیان میں اُنھوں نے ایسی جدّت نازک خیال اور طرفگی سے کام لیا ہے کہ پڑھنے والا انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ مومن کا عشق بلند ہے۔ اُن کے تغزل میں جنسی آسودگی نام کو نہیں اور معاملہ بندی میں بھی اک خاص متانت پائی جاتی ہے۔

محبوب کے اِن مختلف تصورات نے داغ کے۔ پسِ منظر کا کام کیا۔ اُنھوں نے جرأت کی معاملہ بندی اور مومن کی رنگینی میں اپنے مذاق و پسند کا اضافہ کرکے ایک نیا اندازِ تغزل اور پھڑکتا ہوا محبوب پیش کیا۔ یہ محبوب شاہدِ بازاری ہے لیکن اُس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ محض روایت یا تخئیل کے پیداوار نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے پُرخلوص اظہار نے داغ کے کلام اور اُن کی زندگی میں بڑی گہری مطابقت پیدا کر دی ہے۔ وہ رسمی ڈگر سے ہٹ کر اپنے جذبات و احساسات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کا ہر شعر اُن کی زندگی کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ داغ کے اِس رنگِ تغزل اور اِس سہل الحصول محبوب میں کوئی عظمت تو یقیناً نہیں پائی جاتی مگر اُس کی دلکشی و دلربائی کا یہ عالم ہے کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

اب قبل اس کے کہ ہم اِس کرشمہ ساز کو زیادہ قریب سے دیکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس دور کے معاشرہ پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ داغ نے جس پُرآشوب زمانہ اور گھن لگتے ہوئے معاشرہ میں آنکھ کھولی اُس میں لوگ اپنی وضعداری کو نباہنا ہی بہت کچھ سمجھتے تھے۔ دلّی کا تاج و تخت لٹ چکا تھا اور اُس کی مرکزی حیثیت بھی خطرے میں تھی۔ نماز روزہ نجات کا ذریعہ اور اخلاق و شرافت کے چند بندھے ٹکے اُصول تھے۔ ایسے زمانہ میں دفع الوقتی ہی زندگی کا نصب العین ہوتی ہے اور اس دفع الوقتی میں شاعری ایک بہت بڑا سہارا۔ چنانچہ داغ کی شاعری نے اُس سماج کو دفع الوقتی کا ایک آلہ فراہم کیا۔ غدر کے بعد وہ دربار رامپور سے وابستہ ہو گئے تو وہاں کی فضا بھی دلّی کی فضا سے مختلف نہ تھی وہی مشاعروں کی کثرت، وہی شعرا کے جھگڑے اور وہی آپس کی نوک جھونک تھی۔ شعرا میں دلّی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کے استادانِ فن موجود تھے۔ البتہ لکھنوی شعرا کی کثرت کی وجہ سے رامپور کا مذاق دلّی کے مذاق سے مختلف تھا۔ وقتی عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے عوام و خواص عریاں اور چوچلے بھری باتیں پسند کرتے تھے۔ داغ کا اس رنگ سے متاثر ہونا ناگزیر تھا لہٰذا وہ مقبولِ عام و خاص ہونے کی خاطر اس رنگ میں رنگ گئے مگر ذوق، ظفر، غالب، مومن، نیر و شیفتہ کی محفلوں کے نقش بھی اُن کے ذہن سے بالکل نہ دھل سکے۔ رامپور سے اُکھڑ کر وہ حیدرآباد پہونچے اور وہاں اُنھیں خاص فراغت نصیب ہوئی۔ غرض داغ نے شروع سے آخر تک درباری ماحول میں زندگی گزاری۔ خود پیدائیشی نواب اُس پر طرّہ یہ کہ نوابوں کی صحبت نتیجہ یہ ہوا کہ تعیش پسندی اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی اور مرتے دم تک تاکنا جھانکنا نہ گیا — یہاں تک کہ یہ شوق میدانِ حشر میں بھی جاری رہا ؎

محشر میں بعد پرسشِ اعمال دیکھنا ہم دیکھتے پھریں گے تماشا اِدھر اُدھر

یوں تو داغ کی شاہد بازی کے بہت سے واقعات ہوں گے جو پردۂ خفا میں ہیں لیکن اُن میں سے ایک واقعہ جسکا اظہار ہی نہیں ہوا بلکہ جس کا اعتراف خود داغ نے اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں کیا ہے بہت ہی اہم ہے۔ یہ واقعہ اُنکی زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ رامپور کے دورانِ قیام میں داغ "بے نظیر کے میلے" میں کلکتہ کی ایک نغمہ گو طوائف نامہ منیر متخلص بہ حجاب پر فریفتہ ہو گئے اور اس فریفتگی نے اتنا طول کھینچا کہ اُنھوں نے حجاب کی خاطر لکھنؤ عظیم آباد اور کلکتہ کے سفر کئے، ان مقامات پر اُن کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے اور داغ نے اُن میں شرکت بھی کی — چنانچہ

"مہماں نہیں دیکھا، ارماں نہیں دیکھا" والی غزل جس کا مطلع ہے ؎

کیوں پوچھتے ہو کون ہے یہ کس کی ہے شہرت — کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

عظیم آباد کی کہی ہوئی ہے اور یہیں اُن کی وہ معروف غزل بھی ہوئی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے ؎

بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں — کسی سے آج بگڑی ہے، جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں — عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

اسی حجاب کا تذکرہ داغ نے مثنوی کے علاوہ اپنے بعض اشعار میں بھی کیا ہے ؎

در پردہ تم جلاؤ، جلاؤں نہ میں چہ خوش — میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو
دیکھ کر جلوہ غش ہوئے موسیٰ — داغ مجھ کو حجاب نے مارا

مولانا احسن مارہروی کے بیان کے مطابق یہی حجاب حیدر آباد بھی بلائی گئیں اور داغ کا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزرا —— لیکن اس کے علاوہ بھی کئی طوائفیں اُن کی منظور نظر رہیں۔ جن کا تذکرہ عزیز یار جنگ، مولانا احسن اور نواب میر حسن علی خاں جیسے عزیز شاگردوں نے کیا ہے۔ داغ کے سلسلہ میں اِن حالات و واقعات کا تذکرہ کسی حد تک ضروری اس لئے ہے کہ ان کی واقفیت سے ہمیں داغ کی زندگی، اُن کے محرکات شعری اور اُن کے محبوب کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آیئے اس معلومات کی روشنی میں اُن کے محبوب کی خصوصیات کو دیکھیں۔ داغ نے اپنے محبوب کا تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے ؎

چمپئی رنگ پھر اُس رنگ میں بجلی کی چمک — مات کندن ہے ترے رنگ نے سونا کیا ہے
بھرا دا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
چتونیں شوخ، چلبلی تقریر — اُس میں پھر شرم بھی حیا بھی ہو
گلشن میں ترے لبوں نے گویا — رس چوس لیا کلی کلی کا
یہ ناز، یہ نگاہ، یہ چنچل پن، یہ شوخیاں — تم اِس سے بھی سوا ہو، قیامت سے کم نہیں
اللہ رے کیا فتنہ گری ہے دم رفتار — جچتی ہے قیامت ترے دامن کی ہوا سے
وہ دل پہ چھری پھیر گئے ناز و ادا سے — اب کوئی مرے کوئی جئے اُن کی بلا سے
اُن سے بغیر چھیڑ کئے چین ہی نہیں — کتنی شریر طبع ہے کیا چلبلا مزاج

اِس مختصر سے تعارف سے معشوق کا جو سراپا ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ ایک ایسے چھلاوے کا ہے جس میں شوخی و شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُس کی رفتار و گفتار، ناز و انداز اور مختلف اعضائے جسمانی سے شباب، مستی اور اچپلاہٹ ٹپک رہی ہے، رنگ کا انتخاب بھی نہایت دل آویز ہے۔ اِس چمک دمک اور آب و تاب کم از کم شمالی ہندوستان میں تو اپنا جواب نہیں رکھتی۔ آخری شعر میں شاعر نے کس قدر بے ساختگی و بے تکلفی کے ساتھ اُس چھیڑ چھاڑ کا تذکرہ کیا ہے جس کا ایسے چنچل کے ساتھ ہونا ضروری ہے —— بظاہر داغ کے اس محبوب اور جرأت کے معشوق میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جرأت کو سراپا نگاری سے خاص شغف تھا اور اُنھوں نے مختلف سراپوں میں اپنے معشوق کا یہی انداز بتایا ہے۔ بایں ہمہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جرأت نے لکھنوی فضا سے متاثر ہو کر محبوب کے لوازم حسن کا تذکرہ بھی کر ڈالا ہے اور گاہے گاہے بے جا عریانی سے بھی کام لیا ہے۔

جرأت کے مقابلہ میں داغ محبوب کے حُسن و ادا کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ متعلقاتِ حُسن کی بدمزاقی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اور نہ جرأت کی طرح ڈھکی ہوئی چیزوں کو اس طرح کھولتے ہیں کہ بیان میں ابتذال و رکاکت پیدا ہوجائے۔ حالانکہ نہ وہ کوئی معلّمِ اخلاق ہیں اور نہ اُن کی محبوبہ پارسائی کی دعویدار ہے۔ وہ تو مومن کی "راحتِ جان" کی طرح "پردہ نشین" یا گھر کی چہار دیواری میں بیٹھنے والی بھی نہیں محض بازاری عورت ہے اس لئے وہ ہرجائی اور سہل آمیز ہے۔ اُس کی یہ کمزوری یا خوبی بھی داغ ہی کی زبانی سنئے ؎

جاہنے والے بُرے ہوں کہ بھلے ۔۔۔ اُن کے دفتر میں نام ہے سب کا
لڑتی جاتی ہے غیر سے بھی آنکھ ۔۔۔ مجھ سے بھی بات کرتے جاتے ہیں
کیا رہیں ہم کہ ترا چال چلن، ۔۔۔ پاس رہکر نہیں دیکھا جاتا
تمھاری طرح بھی ہوگا نہ کوئی ہرجائی ۔۔۔ تمام رات کہیں ہو کہیں ہو سارا دن
دو دن بھی کسی سے وہ برابر نہیں ملتا ۔۔۔ یہ اور قیامت ہے کہ مل کر نہیں ملتا
اُس شوخ دغا باز کا کھلتا نہیں کچھ بھید ۔۔۔ جب تک اُسے باتوں میں ٹٹولا نہیں جاتا
وصل کی اُن سے ہوگئی امید ۔۔۔ سلسلہ جب کلام کا نکلا

اور یہ کوئی مضمون آفرینی نہیں حقیقت ہے۔ داغ کے محبوب تعلق ہی اُس طبقہ سے رکھتے تھے جس میں آئینہ کی سی پریشان نظری عام ہوتی ہے۔ پسند خاص ہوجائے تو مولا کی دین مگر اس کرم کے یہ معنی نہیں کہ فیضانِ عام بند ہوجائے۔ آپ اس کو بدچلنی کہیں یا اس کی تاب نہ لاسکیں تو بلا سے۔ وہاں تو غیر سے آنکھ لڑتی ہی رہے گی۔ سہل آمیزی کا یہ عالم ہے کہ سلسلۂ کلام نکال لیجئے تو وصل کی امید کا بندھنا کوئی بڑی بات نہیں مگر ایک قباحت یہ ہے کہ اُسکے ربط و تعلق میں استواری نام کو نہیں۔ بس دو چار دن کا خلا ملا پھر طوطے چشمی اور غیروں سے اختلاط۔ جس کے نتیجہ میں رقابت مول لینی پڑتی ہے۔ داغ نے بھی رقابت مول لی ہے اور چونکہ اصلیت ہے اس لئے اُنکے کلام میں رقیب کا تذکرہ بھی دوسرے شعرا کے روایتی تذکرہ کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ محبت کی منزل میں رقیب کی شخصیت بھی بڑی اہم ہوتی ہے۔ عاشق و معشوق کے بعد مثلث کا جو آخری ضلع رہ جاتا ہے اُس کی خانہ پُری اسی کی ذات سے ہوتی ہے۔ اسی کی بدولت رشک کا اور پھر حسد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب ٹھن جاتی ہے تب تو مارنے مرنے کے ڈھنگ بن جاتے ہیں۔ داغ نے اس موقعہ کی تصویر کس قدر ہو بہو اُتاری ہے ؎

تمھارے واسطے میں غیر کو تنہا نہ چھوڑوں گا، ۔۔۔ سمجھ لینا کہ دو مُردے گڑیں گے ایک مدفن میں
غیر کو ساتھ لیکے ہم ڈوبے ۔۔۔ آپ نے ضد دلا کے دیکھ لیا

لیکن جیسا کہ ابھی کہا گیا یہ کبھی کبھی کی بات ہوتی ہے بالعموم اُس کے نام سے محبوب کے ساتھ اک چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی ہے کبھی عاشق اُس کا تذکرہ کرکے محبوب کو اور کبھی محبوب اُس کا نام دُہرا کر گفتگو کے لئے ایک موضوع فراہم کر دیتا ہے۔ رقیب پر حملے شروع ہوجاتے ہیں۔ اُس کی بُرائیاں جتائی جاتی ہیں اور اپنی خوبیاں دکھا کر محبوب کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کیجاتی ہے۔ داغ اِس مرحلے سے بھی گزرے ہیں۔ چند شعر سنتے چلئے ؎

افسوس ہے رقیب نے کی آپ سے دغا ۔۔۔ مجھ کو بھی رنج آپ کے سر کی قسم ہوا
غیر سے مل کے کیا لیا تم نے ۔۔۔ ہم سے ملتے تو کچھ مزا ملتا
تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا ۔۔۔ نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا
رشکِ دشمن بھی گوارا لیکن ۔۔۔ تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا

اُن کے خط میں مجھے غیروں کے سلام آتے ہیں ۔۔۔ رسم تحریر بھی مٹ جائے یہی مطلب ہے

ظاہر ہے معشوق کے سامنے اس شکوہ و شکایت میں بھی اک کیف حاصل ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ رقیب کی دشمنی بھی تکلیف دہ ہونے کے بجائے دلچسپ بن جاتی ہے اور اگر اس حد تک ساتھ دینے کے بعد وہ مرجاتا ہے تو اس کا رنج بھی عاشق کو ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ داغ جیسا طرحدار اور باوضع عاشق ہو۔ اُن کا یہ شعر کسی ایسے ہی حادثے کی یاد تازہ کرتا ہے ؎

دشمنی کا لطف، شکوؤں کا مزا جاتا رہا ۔۔۔ مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال

اس کوچہ میں قدم رکھنے کے بعد قاصد کی ضرورت ہوتی ہے کچھ اس لئے کہ دو بدو نہ ہونے لگے اور کچھ رقیب کے خیال سے ۔ داغ کے یہاں اس کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ بڑے آن بان والے عاشق تھے۔ اُنھیں اپنی وضع کی پاسداری بھی لازم تھی —— چند شعر اس کے متعلق بھی سنئے ؎

لطف کیا جب دو بدو ہونے لگی ۔۔۔ چاہئے پیغامبر دونوں طرف

تاڑلی اُس نکتہ چیں نے بات سمجھائی ہوئی ۔۔۔ کیا قسم کھاکر ہوا ہے منفعل پیغامبر

چار دن اور مصیبت کے گزارے ہوتے ۔۔۔ نامہ بر رہ کے وہاں تجھکو خبر لانی تھی

خدا جانے اُٹھا لایا کہاں سے ۔۔۔ وہ خط لکھیں مجھے جھوٹا ہے قاصد

داغ کے محبوب کی دُنیا وسیع بھی بہت ہے۔ یہاں "اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو" والا عقیدہ آپ کو نظر ہی نہ آئے گا، وہ شاہد باز تھے اور اُن کی رنگین طبیعت کسی ایک پر قانع ہو نہیں سکتی تھی۔ درحقیقت وہ غمِ دوراں وغمِ جاناں دونوں کے قایل نہ تھے اُنھوں نے "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کے مصداق ایک معشوق کے بچھڑنے پر دوسرے سے دل اٹکا لیا اور اندوہِ فراق میں کبھی مبتلا نہ ہوئے۔ داغ ان حسینوں کی دُنیا میں بہت پیرے ہوئے تھے اُنھوں نے بہت کچھ دیکھا تھا اور بقول شخصے کھل کھیلا تھا۔ اس خیال کی تائید اُن کے معروف معاشقہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ داغ اور حجاب کا یہ تعلق اُن کی ۵۰ و ۵۵ برس کی عمر کے درمیانی زمانہ کا ہے۔ ظاہر ہے جب اس عمر میں اُن میں یہ امنگ و ترنگ تھی تو عالمِ شباب کا کیا کہنا خود ہی کہا ہے ؎

روز معشوق نیا، روز ملاقات نئی ۔۔۔ ہائے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی

غرض اُن کی محبوبہ کوئی مخصوص حسینہ نہیں تھی اور نہ ہی جرأت کی طرح اُن کی دُنیا محدود تھی۔ جرأت تو اپنی بصارت کھو بیٹھنے کے بعد یا تو اُس چنچل کے خیال میں مگن رہے جسے اُنھوں نے اس حادثہ سے قبل کبھی دیکھا تھا یا پھر جو فتنۂ روزگار حُسن اتفاق سے ہاتھ لگ گئی اُسے چھو چھاکر ایک لمساتی خط بھی حاصل کیا اور اس کا مزے لے لے کر خاکہ بھی کھینچا۔ داغ کے یہاں نہ یہ معذوری ہے اور نہ مومن کا سا بلند نظریۂ عشق، وہ تو ہمیشہ اسی مسلک کے قایل رہے کہ:-

دل بہل جائے گا کہیں نہ کہیں ۔۔۔ کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں

عشق کے اس تصور نے کلامِ داغ میں عاشق کے تیور بھی بڑے تیکھے رکھے ہیں۔ ہماری شاعری میں عاشق اپنے محبوب کے مقابلہ میں ایک احساسِ کمتری کا شکار رہا ہے۔ اور ہمارے متغزلین نے عاشق کا حلیہ اکثر و بیشتر مضحکہ خیز ہی کھینچا ہے داغ نے اس بدعت کو بڑی بُری طرح توڑا اور عاشق کو اُس کی برتری سے روشناس کرایا ہے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

یکتا ہوں میں ہزار میں کیا سو ہزار میں ۔۔۔ یہ کیا کہا کہ داغ تو ہے کس شمار میں

خدا کی قسم ہم کو حسرت نہیں ۔۔۔ تری آرزو جن کو ہے اُن کو ہے

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا — دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا،
ہم لطف کے بندے ہیں خدا کی قسم اے واعظ — ہم سے نہ کبھی نازِ ستمگر کے اٹھیں گے
مجھے تم جانتے ہو داغ ہوں میں — کہیں جاتا ہے خالی وار میرا

چوتھے شعر میں داغ نے بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ وہ حقیقتاً لطف کے بندے تھے۔ محبوب کے نازو انداز بھی ایک گوارا حد تک سہتے تھے اور اس کے آگے وہ اس لئے نہیں جانا چاہتے تھے کہ پھر تیر کی سپردگی کی منزل آجانے کا خدشہ تھا جسکے تصور سے وہ گھبراتے تھے چونکہ یہ اُن کے خوش رکھنے کے مقصد کے منافی تھا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ نواب مرزا بہرصورت قلعۂ معلّی میں پروان چڑھے تھے، بنا بریں کچھ شاہانہ بو بھی اُن میں تھی لہذا محبت کی دُنیا میں معشوق کی محکومی اُنھیں گوارا نہ تھی۔ وہ خود شوخ و چلبلے واقع ہوئے تھے اور محبوب بھی طرحدار اور طرار ڈھونڈھتے تھے، مگر ایسا معشوق جس کے عشاق کی فہرست میں اُن کا نام کسی شمار و قطار ہی میں نہ ہو۔ داغ اُسے دور ہی سے یہ کہکر سلام کرلیتے تھے کہ ؎

اِک نہ اِک ہم لگائے رکھتے ہیں — تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا،

داغ کے محبوب میں اُس کی شوخی و سہل آمیزی کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہے جو روایتی محبوب میں تو سرے سے ملتی ہی نہیں لیکن جرأت، غالب و مومن کے معشوق میں بھی نہیں پائی جاتی۔ یہ اُس کی حاضر جوابی ہے، روایتی محبوب میں تو اُسکی غنچہ دہنی اکثر اِک سربستہ معمّے کی شکل اختیار کرلیتی ہے اس لئے اُس کے بات کرنے یا جواب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھئے خواجہ صاحب اپنے محبوب کے بارے میں کہتے ہیں ؎

کب دہن میں ترے سمائے سخن — نہیں تیرے دہن میں جائے سخن

میر صاحب کا ارشاد ہوتا ہے ؎

سچ پوچھو تو کب ہیگا اُس کا سا دہن غنچہ — تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

حضرتِ غالب کا سراپا ناز ڈھول دھپّا تو نہیں کرتا مگر تلخ بہت ہے۔ یا تو عاشقِ نامراد سے تو تکار سے بات کرتا ہے یا پھر اُس کی زبان بندی کردیتا ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمھیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے،
بات پر واں زبان کٹتی ہے، — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی،

مومن کا دشمن ایمان کچھ تو اپنی پردہ نشینی کے باعث حیادار ہے اور بولتا ہے یا بولتا ہے تو پھر ایک لطیف طنز کے ساتھ

"مرچک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے" — کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بُری طرح

اب رہے جرأت صاحب تو اُن کا محبوب بہت کچھ داغ کے محبوب سے مائل ہوتے ہوئے بھی اس معاملہ میں رکیک زیادہ ہے اور اُس کے جواب میں ایک سستا پن ہے۔ اُس کی چوچلے بھری باتوں میں خیالات کی گندگی صاف نمایاں ہوجاتی ہے۔ لیکن داغ کے محبوب میں عاشق کی بات کے جواب کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ اُس کے جواب کی خوبی یہ ہے کہ اُس میں تیکھے پن کے ساتھ ایک لطیف سی وضعداری قایم رہتی ہے اور سبک پن نہیں آنے پاتا۔ وہ بازاری سہی مگر اُس کی ایک خاص سطح ہے جس سے نیچے آنا اُسے گوارا نہیں۔ یا یوں کہئے کہ اُس کی صاف گوئی میں بھی سوقیانہ پن نہیں ہے۔ ذیل کے چند اشعار اس خیال کی توضیح کردیں گے ؎

ہاتھ گردن میں ڈال کر بولے — "کس سے ملئے ترے گلے مل کر"
حشر کا وعدہ بھی کرتے نہیں وہ کہتے ہیں — "فرض کرلو جو کئی بار قیامت آئی"

وقت ملنے کا جو پوچھا تو کہا "کہدیں گے" — غیر کا حال جو پوچھا تو کہا "کہتے ہیں"

غیروں سے التفات پہ ٹوکا تو یہ کہا — "دنیا میں بات بھی نہ کریں کیا کسی سے ہم"

وصل کے باب میں کی عرض تو وہ کہنے لگے — کیوں مرے جاتے ہو ہو جائے گا، ہو جائے گا

محبوب کی ان چند خصوصیات کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ داغ کا محبوب یکسر مجازی ہے۔ اُنکا محبوب سراسر جسم ہے اور ذہنی طور پر کسی حیثیت کا مالک نہیں۔ داغ کا عشق بھی خالص جسمانی ہے اور وہ محبوب کو سوائے جسم کے کسی ذہنی حیثیت کا مالک ہی نہیں سمجھتے۔ اُن کا تعلق ذہنی نہیں جسمانی ہے اور عاشق و معشوق محض جنس کی تشنگی بجھانے کے لئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اس سے زیادہ اُن میں کوئی ربط و اتحاد نہیں۔ غالب کے یہاں یہ تعلق جسم سے بڑھکر ذہن تک پہونچتا ہے اور عاشق کو فلسفیانہ نکات سمجھاتا ہے۔ پھر غالب کی بے تکلفی میں ایسا ضبط و احتیاط پایا جاتا ہے جو پاس ادب اور فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتا ہے اور اُن کی شوخی پھکڑ پن کے حدود تک نہیں پہونچتی۔ مومن کا عشق ہی نسبتاً اونچا ہے۔ اُن کی شکوہ و شکایت میں ایک پردہ داری کا پہلو ہے اور اس طرح مومن اپنے محبوب کی بے باکیوں کی روک تھام کر لیتے ہیں، جرأت و داغ کے محبوب بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں لیکن داغ کا محبوب جرأت کے محبوب کے مقابلہ میں ایک رکھ رکھاؤ کا مالک ضرور ہے۔ وہ بازاری ہوتے ہوئے بھی پاسِ وضع کا خیال رکھتا ہے اُس کی شوخی اور البیلے پن میں ایک خاص شان ہے۔ جرأت محبوب کے بیان میں اکثر کھل جاتے ہیں اور اُسے جسمانی طور پر عریاں کر دیتے ہیں۔ برخلاف اسکے داغ نے رمز و ایما کی کیفیات کو برقرار رکھا ہے۔ وہ اپنی خوبیِ بیان اور حسنِ ادا سے محبوب کو اور چمکا دیتے ہیں۔ داغ کا آرٹ درحقیقت اُن کی زبان ہے جس میں بلا کی نزاکت، لطافت اور لوچ ہے۔ داغ نے اپنے محبوب کی مصوری آرٹ کا جادو جگایا ہے اس جادو نے تصویر میں کوئی عظمت یا رفعت تو نہیں پیدا کی البتہ اُسے نازک، نفیس اور روشن کر دیا ہے۔ داغ کا یہی کارنامہ اُنھیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔

خواجہ میر درد کا غیر مطبوعہ قطعہ جو داغ سنایا کرتے تھے

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اس سے — مذکور کسی طرح کا جا کیجئے اس سے

سو بار یونہی ٹھہر چکی اب کے نہ ملئے — یوں بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے

جوں جوں وہ رکے ہے تو یہی آوے ہے جی میں — پھر چھیڑئے اور باتیں سنا کیجئے اس سے

ہم درد میاں کہتے نہ تھے چھوڑ یہ باتیں
پائی نہ سزا اور وفا کیجئے اس سے

(مرسلہ یاسین علی خاں بی۔ اے)

داغ

(پروفیسر فراق گورکھپوری)

میرا لڑکپن ہی رہا ہوگا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت بھی داغ کا کلام پڑھ کر اور سُن کر مجھے غصّہ آجاتا تھا اور شاعر کے متعلق توہین اور نفرت کے جذبات میرے اندر اُبال کھانے لگتے تھے۔ اُردو کے کسی بھی اور شاعر کے کلام کا یہ ردِّ عمل مجھ پر نہیں ہوتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو خوبیاں، داغ کے کلام میں ہیں وہ دوسروں کو نظر آئیں اور مجھے نظر نہ آئیں۔ ان خوبیوں کا احساس مجھے اُس وقت بھی تھا اور رفتہ رفتہ یہ احساس بڑھتا گیا لیکن غصّہ اور نفرت کا جذبہ اس بڑھتے ہوئے احساس سے نہ کم ہوا نہ کمزور پڑا۔ میں بیک وقت داغ کو صفِ اول کا شاعر مانتا رہا، ان کی فطنت (genius) کا قایل رہا اور کلامِ داغ کے متعلق اپنے اندر انتہائی ناپسندیدگی کا جذبہ پاتا رہا۔

پینتالیس برس سے برابر میرا یہی حال رہا ہے۔ کلامِ داغ کے محاسن مجھ سے خراجِ تحسین بھی حاصل کرتے رہے اور مجھے غصّہ بھی دلاتے رہے۔ جھلّانے کا لفظ میری حالت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا بلکہ ہماری طرف کا ایک رائج لفظ زیادہ صحیح مصوّری میری حالت کی کرتا ہے۔ یعنی میں کلامِ داغ پڑھ کر کچکچا اُٹھتا تھا۔ اب جبکہ "نگار" داغ نمبر نکال رہا ہے تو مجھے اپنے مرکزی ردِ عمل کو کچھ واضح کرنا پڑے گا۔ بات کیا ہے؟ غالب کے مرجانے کے بعد اُردو شاعری بہ استثناء ایک دو شاعروں کے معشوق کی عزت کرنا بھول گئی اور معشوق سے بیگانگی۔ نرمی۔ خلوص اور جذباتی قربت محسوس کرنا بھول گئی اور نصف صدی سے زیادہ تر بھولی رہی۔ تہذیبِ محبت مٹ چلی تھی۔ غالب کے بعد تہذیبِ محبت کا چراغ حالی، شیفتہ، شاد عظیم آبادی اور آسی غازیپوری کے کلام میں جھلملاتا رہا۔ یوں تو پرستاری اور ہم آہنگی، نرمی اور انسانیت کا جو جذبہ میر کے یہاں ملتا ہے وہ جذبہ اُس شکل میں تو غالب کے یہاں بھی نہیں ملتا۔ لیکن غالب کے یہاں کچھ دوسری اتنی رچی ہوئی خوبیاں ملتی ہیں کہ یہ کمی پوری ہوجاتی ہے۔ غالب کے بعد جن شاعروں کا نام میں نے گنوایا ہے اُنھیں چھوڑکر دوسرے شعرا کے کلام سچے اور پرخلوص جذباتِ محبت سے عموماً محروم ہے۔ پھر بھی ان شاعروں کے یہاں ایسے عشقیہ اشعار نہیں ہیں یا عموماً نہیں ہیں جنھیں سُن کر ایک شریف آدمی کے دل میں آگ سی لگ جائے۔ غالب کے بعد اس طرح غصّہ دلانے والا عشقیہ کلام صرف داغ کا ہے۔

دلّی کے اخلاقی انحطاط کی اِنتہا لال قلعہ کی زندگی اور ہزارہا مُسلمان جاگیرداروں کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ تہذیب کا ظاہری پہلو اس کے تمام ٹیم ٹام تو ان تمام جگہوں اور لوگوں میں ملتے ہیں۔ لیکن تہذیب کی روح اس زندگی میں مردہ ہوچکی ہے۔ ایک کڑاپن اور خشونت نے تہذیب کی روحانی برکتوں پر غلبہ پالیا ہے۔ دل سینوں میں ریجھنا اور پگھلنا بھول چکے ہیں۔ اس انحطاطی دور میں دلّی کی تہذیب کا دل قصّاب کا دل بن گیا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اب معشوق سے پریم اور محبت مخصوص کرنے اور برتنے کے بدلے اب اُس کی چٹکیاں لی جاتی ہیں۔ بجائے اُداس یا غمگین ہونے کے اب ایک بے حیا کھسیاہٹ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ دِل کے معاملے اب کھُلی معرکہ آرائی کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ محبت کا جذبہ ایک انتقامی جذبہ بن جاتا ہے۔ اب ذہنی طور پر بجائے معشوق کو گلے لگانے کے جذبہ کے اس پر چڑھ بیٹھنے کا جذبہ کار فرما ہے۔ نرم بولی

یا شایستہ لہجہ اب چرب زبانی میں بدل جاتی ہے اور ٹھیٹھ کرکے اسے بیان کیجئے تو کہنا پڑے گا کہ محبت کے دل اور زبان پر چربی چڑھ جاتی ہے۔ دونوں کی لچک مٹ کر ایک خشک کرے پن میں یا اکڑپن میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ دل اور زبان دونوں ہڈی کے بن گئے ہیں یا نہایت سخت و کرخت گوشت کے۔ اب شاعری اپنی گھلاوٹ سے بجائے نرم بول بولنے کے پتھر مارتی ہے۔ داغ کے کلام میں یہ تمام خرابیاں اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہیں۔ سپردگی کا جذبہ ڈاکہ زنی کا جذبہ بن گیا ہے۔ بازاری عشق نے حسن پر ہلا بول دیا ہے۔ ہم آہنگی، مغائرت میں بدل گئی ہے۔

لیکن اس تمام عمل میں ایک ہنگامہ آرائی کی شان ہے اور یہ شان اور آن بان، یہ ہما ہمی جس تیور کے ساتھ داغ کے کلام میں نظر آتی ہے داغ کے پہلے یا داغ کے بعد اردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔ داغ کی زبان میں فلیتے جرے ہوئے ہیں۔ جو رہ رہ کر چھوٹتے چلے جاتے ہیں۔ دلی کی بھرپور زندگی اور لال قلعہ کی رنگ رلیاں داغ کے کلام میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہوگئی ہیں کہ دیکھنے سننے والے دیکھتے سنتے رہ جاتے ہیں۔ گالی دینے کا بھی جیبل چھپٹے مارنے کا بھی ایسا سلیقہ سب کو کہاں آتا ہے۔ دلی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موج زنی کے ساتھ داغ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے۔ داغ کے متعلق رائے عامہ بالکل سچائی پر تھی کہ یہ شخص زبان کا لاثانی جادوگر ہے۔ اردو شاعری نے داغ کے برابر کا فقرے باز نہ آج تک پیدا کیا ہے نہ آیندہ پیدا کرسکے گی۔ داغ کے جذبات پر نفرین بھیجتے ہوئے بھی بے اختیار منھ سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔ داغ کا تغزل سراسر واسوخت سہی لیکن اس کی بے پناہ قوتِ اظہار کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ مغلیہ خاندان کی تلوار کی فاتحانہ شان اور چکا چوند پیدا کردینے والی چمک دمک جب زندگی اور جذبات کی تاریک پستیوں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے تو وہ داغ کی شاعری بن جاتی ہے۔

لیکن داغ کو محض غیر شریفانہ اور عامیانہ جذبات کا جادو بیان شاعر سمجھنا پوری سچائی نہیں ہے۔ الفاظ، محاوروں، چست فقروں اور بالکل بے لاگ یا فطری بے ساختہ باتوں کا لاثانی شاعر ہونے کے علاوہ داغ کچھ اور بھی ہے۔ مومن کے نفسیاتی۔ تجزیوں کی پرچھائیاں بھی داغ کے بہت سے اشعار پر پڑتی ہیں۔ پھر دلی کی زبان میں جو لطیف اشاریت آگئی تھی وہ بھی داغ کی غزلوں میں وہ باتیں پیدا کردیتی ہے۔ جنھیں دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ غالب بھی للچا اُٹھے تھے۔ دلی کی چٹکیاں لینے والی بے ساختگی کی ایسی مثالیں اردو کا کوئی دوسرا شاعر آج تک پیش نہیں کرسکا۔ داغ کے ایسے اشعار بیک وقت سامنے کی باتیں بھی معلوم ہوتے ہیں اور جادو بھی۔

بول چال کی زبان پر جیسی قدرت داغ کو تھی ویسی قدرت کسی اور شاعر کے یہاں ڈھونڈھنا سعیِ لاحاصل ہے۔ اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جو بولی ٹھولی کی شکل میں وجود میں آتا ہے سمٹ کر داغ کی زبان میں جذب ہوگیا تھا۔ اس امر میں داغ ہمیں شیکسپیر، مولیر وغیرہ مصنفین کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن افسوس داغ کی بولی کے پیچھے جو دنیائے خیال ہے حسین نہیں ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی لیکن صرف کبھی کبھی وہ بہت حسین بھی ہے۔

داغ کے بعد ہندوستان کی زندگی اور شاعری کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوتی ہے قومی شعور میں ایک نئی سنجیدگی اور شائستگی آنا شروع ہوتی ہیں۔ آج داغ کو مرے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں اردو شاعری کہاں سے کہاں پہونچ گئی یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ عربی، فارسی لغات کا جتنا اثر اس دور کی شاعری پر نظر آتا ہے اتنا اثر پہلے کی اردو شاعری پر نظر نہیں آتا۔ پھر بھی شاعری کی زمین کو داغ کی خوش خرامیوں نے جس طرح ہموار کردیا تھا، اس کی مٹی کو داغ نے جس طرح نرما دیا تھا، زبان کو داغ نے جس طرح ہندی کی چندی کردیا تھا جو سلجھاؤ، صفائی، سبک روی داغ نے اردو شاعری کو عطا کی تھی وہ بھی خارسیت کے ساتھ ساتھ داغ کے بعد کی اردو شاعری کا مستقل جزو بن گئی۔ میر،

غالب اور داغ کی زبانیں آج کی اُردو شاعری کے اجزائے ترکیبی بن گئی ہیں - اُردو کی کامیاب شاعری میں جو آج ہمیں سلجھاؤ نظر آتا ہے وہ بہت کچھ داغ کا رہین منت ہے - داغ نے مستقل اثر اُردو زبان پر چھوڑا ہے - اس باب میں شاعری کی زبان پر داغ کا وہی احسان ہے جو انگریزی زبان پر خاص کر انگریزی نثر پر ڈرائیڈن کے کارناموں کا رہا - یوں تو ہر زبان کی شاعری کا آغاز سادہ اور بے تکلف زبان و بیان سے ہوتا ہے لیکن یہ زبان شروع میں توتلی اور ہکلی رہتی ہے - رفتہ رفتہ اس میں پیچیدگیاں اور پیچیدگیوں کے ساتھ بھاری پن پیدا ہونے لگتا ہے - بعد کو، بہت بعد کو ایک ایسا شاعر یا ادیب ہر زبان میں پیدا ہوتا ہے جو سادہ اور بے تکلف بیان کے ایسے سانچے زبان کو دیدے جو اس زبان کے خدوخال اور اس کی نوک پلک کو مستقل طور پر متعین کردیں — اُردو زبان کے حق میں یہ کام ناسخ نے کرنا چاہا تھا لیکن کامیابی داغ کے ہاتھ رہی - داغ نے اُردو زبان کے خدوخال کو اس کے نکھ سکھ کو اور اس کے جسم کی لکیروں کو اس طرح اُبھارا اور چمکایا کہ اب وہ آسانی سے جانی پہچانی جاسکتی ہے ملک میں اُردو اور ہندی کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے لیکن ہندی والے بھی رہ رہ کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اُردو زبان میں جو بے ساختگی ہے جس طرح اُردو سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے اگر یہ صفت ہندی میں نہ آئی تو ہندی کا مستقبل تاریک ہے -- تو کیا یہ صفت جس حد تک جس خوبی سے جس کامیابی سے داغ نے اُردو زبان کو دی اُس طرح کسی اور نے یہ صفت اور صلاحیت اُردو زبان کو دی ؟

داغ اور جلال

داغ کو جلال اور امیر مینائی سے ملنے کی بڑی آرزو تھی - چنانچہ داغ کا شعر ہے ؎

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ ملتے امیر احمد و سید جلال سے

جلال سے باہمی مذاق اور چشمک بھی ہوا کرتی تھی، داغ، جلال کو غلط گو شاعر کہا کرتے تھے، ایک مشاعرے میں داغ نے مطلع پڑھا اور جلال سے داد طلب ہوئے - مطلع یہ تھا :-

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

جلال نے مسکراکر کہا مصرعہ نہیں لگا، جب جلال کی باری آئی تو فوراً دوسرا مصرعہ لگاکر پڑھا ؎

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر، ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

جلال لکھنوی کو حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں کی جانب سے بھی کچھ وظیفہ مقرر تھا، شاید کسی وجہ سے بند ہوگیا تھا، جلال نے ایک درخواست موسومہ مدارالمہام ذیحجہ ۱۳۱۹ھ میں سجادہ (حضرت کنج نشین بہدری) صاحب کے پاس بھیجی تھی، اور سجادہ صاحب اور داغ نے، مولوی عباس علی خانساماں کے ذریعہ کوشش کی تھی - یہ درخواست محفوظ ہے گو پارینہ ہوگئی ہے -

(مرسلہ سخاوت مرزا - بی - اے - ال - ال - بی)

داغ کی عشقیہ شاعری میں رندی اور شاہد پرستی

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی - ایم - اے - پی ایچ - ڈی - شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی - لاہور)

اُردو میں بدنام شاعروں کا ایک خاصا طویل سلسلہ ہے، نظیر اکبر آبادی، میر تقی میر، مصحفی، جرأت، رنگین، انشا، واجد علی شاہ اختر، مومن اور داغ ایک طرف ہیں، نظیر اکبر آبادی اس لئے بدنام ہیں کہ طریق راسخہ شعراء سے منحرف تھے اور بقول شیفتہ:-

"اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقین جاریست و نظر بآن ابیات در اعداد شعرا نشایدش شمرد[1]۔"

گویا اُن کی خطا یہ تھی کہ عوام کی زندگی کی ترجمانی کرتے تھے، میر بیچارے[2] کی یہ خطا بتائی جاتی ہے کہ وہ جس عطار کے لونڈے پر مرتے تھے اسی سے دوا لیتے تھے۔ مصحفی یوں بدنام ہیں کہ ایک طرف امرد پرستی میں مبتلا ہیں اور دوسری طرف عصمت[3] نام ایک شاہد بازاری کی محبت میں اسیر ہیں، جرأت معاملہ بندی کے ملزم ہیں کہ اُن مضامین کو جو عاشق و معشوق کے درمیان گزرتے ہیں موضوعِ سخن بناتے تھے، ان کے بارہ میں شیفتہ کی رائے سنئے:-

"سخن بمضامینے کہ میان عاشق و معشوق می گزرد می کرد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوں از اصول و قوانین این فن بہرہ نداشتہ نغمہائے خارج از آہنگ می سرودہ و آوازہ اش کہ چوں طبل دور رفتہ ازانست کہ پذیرائی خاطر و گوارائی طبع اوباش و الواط حرف منیردہ[4]۔"

رنگین اور انشاء کو اُن کی ظرافت اور خوش طبعی لے بیٹھی، ریختی اور ہزل انھوں نے بطور تفنن طبع اختیار کی تھی، لیکن انکے سامنے اُن کے تمام ادبی، علمی اور شاعرانہ کمالات محو ہوکر رہ گئے، بیچارہ واجد علی شاہ اپنی لذت پرستی، بیگمات کی کثرت اور راگ و رنگ کے الزام میں ایسا بدنام ہوا کہ آج اس کی پچاس سے اوپر تصانیف[5] کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، مومن نے بقول مولانا ضیاء احمد[6] اپنی علمیت کا پردہ ڈالا لیکن کسی پردہ نشین کے عشق نے انھیں بھی بدنام کر کے چھوڑا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی نواب مرزا خاں داغ ہیں۔ سکسینہ لکھتے ہیں:- "انھوں (جرأت) نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کی تکمیل متاخرین میں نواب مرزا خاں داغ کے ہاتھوں ہوئی[7] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" "بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں[8] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" "داغ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے اشعار ہیجان اور مخرب اخلاق ہوتے ہیں[9] ۔ ۔ ۔ ۔ داغ کے اشعار صرف ایسے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جسکو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں[10]۔"

---

[1] گلشن بیخار، مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۳۲ — [2] عندلیب شادانی — [3] مصحفی، ابواللیث صدیقی، مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور — [4] گلشن بیخار نولکشور، صفحہ ۴۴ — [5] بحوالہ بنی، از واجد علی شاہ اختر — [6] دیوان مومن، ضیاء احمد — [7] تاریخ ادب اُردو، رام بابو سکسینہ مترجمہ عسکری نولکشور تیسرا اڈیشن صفحہ ۱۹۵ — [8] ایضاً صفحہ ۳۷۰ — [9] ایضاً صفحہ ۳۷۱ — [10] ایضاً ۳۷۲

دوسری طرف بدنام شعراء کا ایک اور سلسلہ ہے۔ یہ لکھنوی اساتذہ ہیں جو کنگھی چوٹی اور انگیہ محرم میں گرفتار ہیں۔ ان کی بوالہوسی کسی انگیہ کی چڑیا کو ہاتھ میں لانا عنقا کو دام میں لانا سمجھتی ہے۔ ان کا عشق 'سبزہ خط' سے شروع ہوکر "ملائم پیٹ" سے گزرتا "اک شئے مخملی" تک جا پہونچتا ہے، یہ محبوب کے جسم کے رونگٹے رونگٹے سے عشق کرتے ہیں لیکن یہ معشوق جس کا دہن نقطہ اور کمر موہوم ہے خود بھی دھوکہ ہے، اور پھر اس معاملہ میں یہاں تک شدت اختیار کی جاتی ہے کہ محبوب کے دروازے کی بلی مرغ جاں کو توڑ ڈالتی ہے اور محبوب کی ناک کا چوہا 'رخت تن' کاٹ ڈالتا ہے[1] اور پھر یہ عاشق جانباز جب پینے پلانے کی طرف آتا ہے تو افیون کھاتا ہے اور افیون کھاکر ہی خودکشی کرلیتا ہے۔[2]

ان بدنام شاعروں کی فہرست میں اور اضافہ ممکن ہے لیکن ان سب ناموں کو اُردو شعر و ادب کی تاریخ سے خارج کردیں تو پھر کیا رہ جاتا ہے اور اگر یہ غور کریں کہ ان بدنام شاعروں نے زبان کی ترقی اور عہد بہ عہد اصطلاح نہ کی ہوتی تو آج ہماری زبان کہاں ہوتی تو ان شاعروں پر بدنامی کا لیبل لگانے سے پہلے ہمیں ایک مرتبہ ضرور تامل ہوگا اسی فہرست میں سے آج نواب مرزا خاں داغ دہلوی موضوع سخن ہیں۔

اس مضمون کے عنوان سے شاید شبہ ہو کہ میرے نزدیک داغ کی شاعری میں رندی اور شاہد بازی کے سوا اور کچھ نہیں اس لئے میں پہلے اسی کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں داغ کی شاعری کیا بہ لحاظ موضوعات اور کیا باعتبار زبان بڑی وسعت رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے یہاں وہ تمام رسمی مضامین جو غزل میں اُن سے پہلے ادا ہوتے چلے آئے تھے بلکہ اُن میں سے بعض ان کے بعد بھی غزل میں اُن سے پہلے ادا ہوتے چلے آئے تھے بلکہ اُن میں سے بعض ان کے بعد بھی غزل میں دخیل رہے موجود ہیں لیکن ان کے پہلو بہ پہلو ایسے اشعار بھی بہ کثرت ہیں جو ذاتی واردات اور واقعات پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں اُن کی عشق پرستی، شوقِ وصال، آلامِ فراق، تلذذ وغیرہ سب کچھ شامل ہیں، دوسری طرف ایسے عارفانہ مضامین ہیں جو بظاہر ایک رند شاہد باز کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتے۔ ایک طرف شوخی ہے جو کہیں بھی پھیل کر پھکڑ یا فحش تک نہیں پہونچی لیکن جگہ جگہ طبیعت کی شگفتگی ضرور ظاہر کرتی ہے۔ اس میں زاہد و واعظ پر پھبتیاں اور طعن ہے لیکن ساتھ ہی شدید قسم کی مذہبیت، رسول اکرم سے محبت، حج بیت اللہ کے شوق کا اظہار، اپنی معصیت کا اعتراف اور عفو کی طلب بھی پائی جاتی ہے۔

باعتبار زبان و بیان داغ کی شاعری اُردو زبان کی تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نذیر احمد کی نثر کی طرح محاورہ بندی کا شوق بھی کہیں کہیں داغ کو لے ڈوبا ہے۔ ایسے چند اشعار ضرور نکل آئیں گے جن میں محض محاورہ بندی کے شوق میں تصنع اور آورد پیدا ہوگئی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کے کلام میں بے ساختگی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے داغ کی ایک اہمیت اور ہے۔ میر اور سودا بیشک اُردو شاعری کے آفتاب و ماہتاب ہیں لیکن ان کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہونے کے باوجود کہیں کہیں کھٹکتی ہے۔ اس کی وجہ انشاؔ سے سنئے:-

"ازیں گفتگو ہا عدم حفظ مرتبۂ افصح اُردو در سخن گفتن یعنی مرزا رفیع دہلوی علیہ الرحمۃ۔ و میر صاحب عالی قدر میر محمد تقی صاحب باوجود لہجہ اکبرآباد و شمول الفاظ بزرے و گوالیار در وقت تکلم از سبب تولد در مستقر الخلافۃ مذکور خاطر داعی آثم نیست۔"[3]

---

[1] مرغِ جاں کو توڑے گی بلی ترے دروازے کی — رختِ تن کو کاٹے گا چوہا تمھاری ناک کا

[2] بوسۂ خالِ سیاہ دیتے نہیں صاحب اگر — ایک دن سننا کہ بندہ کشتۂ افیوں ہوا

[3] دریائے لطافت، الناظر پریس لکھنؤ صفحہ ۳۳

دہلی کی ٹکسالی زبان کی حدود بھی انشا نے متعین کی ہیں :-

"مکانیکہ کہ درآں مجمع فصحا است قلعہ مبارک بادشاہی است و دو محلہ دیگر یکے بنگلۂ سید فیروز کہ از خانہ مرزا اکم مرثیہ خوان متوفی تا حویلی اسمٰعیل خاں صفدر جنگی و ازآنجا تا حویلی ملکہ آفاق ملکہ زمانیہ بنت فرخ سیر بادشاہ یک ضلع محسوب است بلکہ نزد بعضے کابلی دروازہ و بیروآں نیز تا تکیۂ شاہ خدا یار، و ایں طرف از حویلی نواب شبیر جنگ مرحوم و چوک نواب سعادت خاں بہادر برہان الملک جنت آرامگاہ تا پھاٹک حبش خاں داخل آں باشد لیکن قدرے درایں مقام تامل است - آنچہ شک را درآں گنجایش نیست ایں است کہ تا حویلی ملکہ آفاق فصاحت از در و دیوار می بارد و از چتلی قبر تا ترکمان دروازہ یک طرف و تا دہلی دروازہ کہ بہ دتی دروازہ شہرت دارد یک طرف، و تا چوک سعد اللہ خاں طرف دیگر و حویلی و بازار نواب امیر خاں مرحوم و سہ راہہ بیرم خاں کہ بہ ترا ہہ مشہور است و محلہ فولاد خاں و کوچہ چیلہا جزو دہلی دروازہ است"[1]

داغ نے فصاحت کی ان حدود ہی میں آنکھ کھولی، ۱۲۴۶ھ[2] میں چاندنی چوک میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۲ھ میں جب اُن کی والدہ نے صاحبِ عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر سے نکاح کرلیا تو مرزا صاحب بھی قلعۂ شاہی میں پہونچ گئے، زباندانی اور شاعری کی مشق اس طرح "مجمع فصحا یعنی قلعہ مبارک" میں ہوئی، صفِ اول کے شاعروں کی فہرست میں داغ کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ موقع ملا ہوگا اور اس اعتبار سے ان کا سارا کلام ایک تاریخی سند کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن داغ کی شاعری اور زباندانی کے اس "بحرِ بیکراں" کے بیان کے لئے بھی ایک سفینہ درکار ہے، اسی لئے "ظرفِ تنگنائے مضمون" میں صرف دو پہلوؤں یعنی رندی و شاہد پرستی کی تحدید کرلی گئی ہے۔

داغ کی شاہد پرستی کے سلسلہ میں سب سے پہلے مثنوی فریاد داغ[3] کا ذکر کرنا چاہئے، اس میں کلکتہ کی ایک طوائف حجاب بائی سے داغ نے اپنے معاشقے کا حال نظم کیا ہے۔ مثنوی رام پور میں لکھی گئی اور ۱۳۰۰ھ میں مکمل ہوئی[4] اُس وقت داغ کی عمر ۵۴ سال کی تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں جب طبیعت کا یہ رنگ تھا تو جوانی میں کیا کچھ نہ ہوا ہوگا، حجاب بائی کا ذکر مثنوی میں جابجا کرتے ہیں :-

کس قیامت نے پائمال کیا،	سحر بنگالہ نے حلال کیا[5]
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی	لنترانی جواب میں کیسی
یا الٰہی نجات غم سے ملے	وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

داغ کی حجاب سے ملاقات رامپور کے مشہور بے نظیر کے میلے میں ہوئی تھی، صفت معشوق کے عنوان سے سراپا لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں :-

رُخ سے ظاہر تھا نور کا عالم	اور اس پر غرور کا عالم

[1] ایضاً صفحہ ۲۲-۲۳ — [2] جلوۂ داغ، مطبع شمسی حیدر آباد دکن ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰ — [3] فریاد داغ، مطبع نشی محمد علی مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد ۱۸۸۵ء پہلا اڈیشن — [4] فریاد داغ صفحہ ۵۳ -

[5] آفتاب داغ میں بھی ایک شعر دیکھئے :-

مسخر کرلیا آخر کو بنگالے کے جادو نے	بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں

مہتاب داغ میں اسی طرح کے اشعار موجود ہیں۔

جٹی جٹی بھوؤں کی وہ تحریر — کیوں نہ دل اس لکیر پہ ہو فقیر
ایسے بھر وہ دونوں قبۂ نور — شیشۂ دل ہو جن سے چکنا چور
گات بانکی بدن سڈول تمام — فتنہ قد فتنہ چشم فتنہ خرام
نشہ حسن کی ترنگ غضب — نوجوانی کی تھی اُمنگ غضب
اُف رے عہدِ شباب کی مستی — بے پئے ہے شراب کی مستی
رقص، طاؤس باغ سے اچھا — شعر کا لطف داغ سے اچھا

سراپا کی تفصیل کے بعد ابتدائی ملاقات کا حال ہے، قدرتی طور پر یہ منزل زیادہ دشوار نہیں تھی۔ داغ بہت جلد کامیاب کامران نظر آتے ہیں۔

ایک اک دم میں سو مزا راتیں، — لطف کے دن وہ عیش کی راتیں
رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی کھلی ڈھکی کیا کیا
عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا — چار دن شاد ماں نہ دیکھ سکا

اور اس کے بعد:-

آگئی ہجر کی گھڑی سر پر — یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر،
قصد ٹھہرا وطن کے جانے کا — رنگ بدلا نیا زمانے کا،

چلتے وقت راز و نیاز کی باتیں اور عہد و پیمان ہوتا ہے۔ حجاب بائی کلکتہ کی تعریف کرتی ہے پھر بھی:-

جی نہیں چاہتا ہے جانے کو — پر چلے ہیں تلق اُٹھانے کو
ایسے ویسوں سے جی نہیں ملتا — داغ سا آدمی نہیں ملتا

چلتے وقت یوں تسلی دیجاتی ہے:-

آتے جاتے ہیں سب خدائی میں — مر نہ جانا مری جدائی میں
زندگی شرط ہے تو آئیں گے — لطف صحبت کے پھر اُٹھائیں گے
دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں — اس قدر دور رام پور نہیں،
مصرعۂ میر پڑھ کے فرمایا — پھر ملیں گے اگر خدا لایا،

اس کے بعد داغ نے حالتِ ہجر اور گلہ فلک کج رفتار کے عنوان سے حالتِ فراق اور اپنے رنج و الم کی کیفیت بیان کی ہے:-

دل کی حالت بری ہے سینے میں — سانس چلتی چھری ہے سینے میں
چبھتی ہے کوئی شے کلیجے میں — ہوک سی اُٹھتی ہے کلیجے میں
دل سے پہروں کلام کرتا ہوں — زندگی کو سلام کرتا ہوں
اشک اُمڈے برس گئیں آنکھیں — دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں

اس عرصہ میں، نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا اور داغ نے حجاب بائی کو دوبارہ بے نظیر کے میلے میں شرکت کی دعوت بھیجی، اس کا جواب، دیکھئے:-

ایسے میلے میں کیوں نہ آئیں ہم — کہ جہاں تم سا شخص پائیں ہم
کیا نہیں ہم کو شوق خوب کہی — کیا نہیں ہم کو ذوق خوب کہی
باغ کی ہم بہار لوٹیں گے، — داغ کی ہم بہار لوٹیں گے

معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں اور کوئی حایل تھا اور حجاب بائی کے آنے کی صرف یہ صورت تھی کہ وہ طلب کریں، داغ نے یہ بھی گوارا کیا اور بقول خود :-

ان کی کس کس طرح اطاعت کی　　پھر انھوں نے بھی یہ عنایت کی
صاف دل سے مراسلا بھیجا،　　کہ بنارس انھیں بلا بھیجا

بنارس سے رام پور کی منزل دور نہ تھی، حجاب کی آمد پر گویا عید آگئی۔

تھا یہ اس گلعذار کا آنا،　　یا نسیمِ بہار کا آنا،
پھر وہی ساعتِ سعید آئی　　کہ برس دن کے بعد عید آئی،
میرے غم خوار جا کے لائے انھیں　　نہ بنی کچھ بغیر آئے انھیں

لیکن آنے کے بعد بھی حجاب قایم رہا اور رقیب روسیہ کے ڈر سے داغ کے دل کا داغ سلگتا ہی رہا - آخر :-

چار دن میں یہ اتفاق کی بات،　　اُن سے اُن سے ہوئی نفاق کی بات

اب ان کے لئے میدان صاف تھا۔

گزری اوقات عیش وعشرت سے　　دو مہینے تک ایک صورت سے
دوست اپنا وہ مجھ کو جان گئے　　میرے کہنے کو دل میں مان گئے

حجاب بائی غالباً اپنے پیشے اور تربیت کی مناسبت سے زیادہ دن تک کسی کی پابند ہو کر نہیں رہ سکتی تھی اور بہت جلد رامپور اسے قید خانہ معلوم ہونے لگا۔

بولی میری بلا قفس میں رہے،　　آدمی کیوں پرائے بس میں رہے
قید خانہ ہے رام پور مجھے،　　جلد رخصت کریں حضور مجھے،

چلتے وقت رسمی طور پر ان کی تسلّی بھی کی گئی، نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رہا یہاں تک کہ حجاب نے داغ کو کلکتہ طلب کیا اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے جلوۂ داغ کے مصنف لکھتے ہیں :-

"ایک مرتبہ بہ ضرورت خاص رامپور سے دلّی اور لکھنؤ وغیرہ مقامات میں ہوتے ہوئے کلکتہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں کم و بیش تین مہینے قیام کیا تھا۔"[1]

یہ "ضرورتِ خاص" جسے چھپانے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی سوائے حجاب بائی سے ملاقات کے کچھ اور نہیں۔ آئینۂ داغ کے مؤلف بھی اس سفر کا حال اس طرح لکھتے ہیں :-

"رام پور میں آپ کا یکایک خیال ہوا کہ کلکتہ چلئے ----- داغ صاحب نے سیاحتِ کلکتہ کی یادگار میں ایک مثنوی کہی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ایک شاعرہ حجاب نامی سے آپ کو محبت ہوگئی تھی جس کے فراق میں آپ نے مثنوی فریادِ داغ لکھی۔"[2]

بہر حال اس سفر کی تفصیل داغ نے خود لکھی ہے۔ پہلے دہلی گئے :-

جا کر اپنے وطن میں جی نہ لگا　　اس بنائے کہن میں جی نہ لگا

وہاں سے لکھنؤ پہونچے، جہاں :-

بہت اُجڑے ہوئے مکاں دیکھے　　مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے

---

[1] جلوۂ داغ، مولانا احسن احسن مارہروی، مطبع شمسی حیدر آباد ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۵ - [2] فریادِ داغ، محمد نثار علی شہرت دہلوی، صفحہ ۲۰

یہاں کی خاطر مدارات اور تواضع سے فرصت پاکر کانپور اور الہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد پہونچے یہاں قیام زیادہ رہا۔

خوش گلو بھی کئی سُنے میں نے
خوبرو بھی کئی چُنے میں نے

آخر کار منزلِ مقصود پر جا پہونچے، ناخدا کی مسجد کے سامنے بالائے بام قیام کیا اور دل کھول کر دادِ عیش دی۔

بخت بیدار و یار ہے دم ساز
اے شبِ وصل تیری عمر دراز

صبح سے شام تک جمال کے لطف
شام سے صبح تک وصال کے لطف

عیش و عشرت کی بات بات اچھی
رات سے دن تو دن سے رات اچھی

ہر گھڑی نوک جھونک ہوتی تھی
دم بدم روک ٹوک ہوتی تھی

رات عیش و نشاط میں گزرے
صبح تک اختلاط میں گزرے

مدعی لاکھ ڈر دکھاتے ہیں
وہ جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں

عیش و عشرت کا یہ زمانہ بھی مختصر نکلا، داغ کی رخصت کی مدت ختم ہوئی اور رامپور سے طلبی پر انھیں واپس آنا پڑا، لیکن مثنوی کے خاتمے تک وہ یہ لگی بجھ نہیں پائی۔

یا الٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

یہ مثنوی ذاتی اور وارداتی قسم کی ہے اس میں ایک گوشت پوست کا مرد ایک عورت کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے اور یہ محبت بلاشبہ جنسی کشش کی ایک شکل ہے، پڑھنے والوں کو یہ صورتِ حال پہلے ہی تسلیم کرلینا چاہئے، اسے میر حسن کی رموزالعارفین سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہئے بلکہ سحرالبیان سامنے رکھنا چاہئے جس کے متعلق ایک طرف یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر عشقیہ مثنوی اُردو میں نہیں لکھی گئی اور دوسری طرف انشا کہتے ہیں کہ مثنوی نہیں کہی سانڈے کا تیل بیچتے ہیں[1]۔ اس مثنوی میں دو موقعے ایسے آئے ہیں جہاں بقول بعض میر حسن کھسل گئے ہیں۔ ایک سراپا کے بیان میں بعض اشعار جہاں بعض اعضا کی بہت کھلی تشریح کی گئی ہے۔ دوسرے عاشق و معشوق کی ملاقات کا منظر جہاں دو ایک شوخ اشعار میر حسن کے قلم سے نکل گئے ہیں لیکن ان پر بھی پست مذاقی، فحش نگاری یا ابتذال کا لیبل لگانا مشکل ہے کیونکہ ان میں بھی مناظر اور جذبات صرف اشاروں اور کنایوں میں ادا ہوگئے ہیں، اگر اس بنا پر میر حسن کی سحرالبیان فحش ہے تو پھر عاشقانہ شاعری کا بیشتر دفتر غرق آب کرنا پڑے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ نثر میں میر امن کی باغ و بہار سے لے کر شرر اور سرشار کے ناولوں سے گزرتے ہوئے ٹیڑھی لکیر تک سارے ناول دریا برد کردئے جائیں گے اور لے دے کر راہِ نجات اور میلادِ اکبر ہی ہمارے ادبی شہکا ٹھیریں گے۔

جب میر حسن پر اعتراض کی یہ نوعیت تو بیچارے داغ تو بالکل معصوم ہیں۔ انھوں نے وصل کا لفظ بار بار استعمال کیا ہو عیش و عشرت کا جابجا تذکرہ ہے۔ لیکن معاملات درون پردہ کی تشریح یا تفصیل کہیں بیان نہیں کی ہے اور جو کچھ کہا بھی ہے اسے اشاروں اور کنایوں میں ادا کیا ہے۔ شعر کا حسن اگر حسن معنی اور حسن بیان کا مجموعہ ہے تو اس مثنوی کا بیشتر حصہ حسین قرار پاتا ہے۔ اس میں اصلیت اور واقعیت ہے۔ جذبات نگاری اور سراپا نگاری ہے۔ ہجر اور وصل کے عالم کا بیان ہے اور ہر جگہ بات صفائی اور سادگی سے بیان کی ہے۔

اس مثنوی سے ایک بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ داغ کی عشقیہ شاعری محض نقالی یا رسمی نہیں، اگرچہ اس قسم کے

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۵۲

رسمی اشعار انکے یہاں موجود ہیں لیکن یہ داغ کے اصلی رنگ کو ظاہر نہیں کرتے :-

چشم پر شوق میں مژگاں ہیں زباں کے کانٹے
میں جو از بسکہ ترا تشنۂ دیدار رہا

ترے دستِ حنائی میں ہے چور
کسی کو ہاتھ کا سچا نہ پایا

تصور میں مرے تیری کمر ہے
اُسے دُنیا سے کچھ عنقا نہ پایا

واں شبِ وعدہ ملی پاؤں میں منہدی اسنے
یاں کلیجا کوئی ملتا ہے تمنائی کا

آنسو بہا رہا ہوں خط یار پڑھ کے باربار
یوں دانہ ڈالتا ہوں کبوتر کے رو برو

بنا حلقۂ زلف آغوش شوق
گرفتار اُن کی کمر ہو گئی

غبار آلودہ ہیں پائے حنائی
مٹا کر آئے ہو مدفن کسی کا

وہ اپنا دستِ حنائی بھی رکھتے ڈرتے ہیں
علاج کون کرے میرے دل کے چھالوں کا

لگائے بیٹھے ہیں منہدی عبث شب وعدہ
تمہیں امید ہے رنگِ حنا کے آنے کی

اس قسم کے اشعار داغ کے یہاں اور بھی مل جائیں گے لیکن یہ داغ کا اصلی رنگ ظاہر کرنے کی بجائے اس عہد کی مقبول طرز کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ناسخ اور آتش کا دور گزر چکا تھا لیکن لکھنویت کے علمبردار امیر، منیر، جلال، تسلیم اور اُن کے بکثرت متبعین موجود تھے۔ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد ان میں سے اکثر نے دربار رام پور میں پناہ لی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد تو لکھنؤ اور دلی اُجڑکر جو بستیاں آباد ہوئیں اُن میں ایک رامپور بھی تھا، داغ بھی ان محفلوں میں آکر شریک ہوئے جن میں اسیر، منیر، جلال، امیر، تسلیم وغیرہ شامل تھے، محفلیں جمتی تھیں، مشاعرے ہوتے تھے اور طرحی مصرعوں پر طبع آزمائی کی جاتی تھی، ایسے مشاعروں سے جہاں ایک خاص قسم کی ادبی فضا پیدا ہوتی ہے وہاں چند پہلو ایسے بھی ہیں جو فنی حیثیت سے شاعری کے لئے مفید نہیں، مشاعروں کے لئے جو اشعار مصرعہ طرح پر لکھے جاتے ہیں اُن میں قدرتی طور پر آورد زیادہ ہوتی ہے یا دلی جذبات اور کیفیات کا وفور ہوتا بھی ہے تو ایک مخصوص اور محدود پیمانے میں ان جذبات کو ادا کرنے میں بڑے تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑتا ہے۔ مشاعروں میں ایک قباحت یہ ہوتی ہے کہ جو رنگ عام پسند اور مقبول ہوتا ہے مشاعروں میں شرکت کرنے والے اس سے لازمی طور پر متاثر ہوتے ہیں، اعلیٰ درجے کے شعرا کے کلام میں جو بھرتی کے اشعار ملتے ہیں یا جن میں محض رسمی مضامین ادا کئے گئے ہیں اور اسی وجہ سے گلزار داغ[1] اور آفتاب داغ[2] میں زیادہ ہیں جو رامپور میں مرتب ہوئے ان اثرات سے کسی قدر آزاد ہوکر داغ نے حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں جو کلام مرتب کیا ہے جو مہتاب داغ، یادگار داغ اور ضمیمہ یادگار داغ میں شامل ہے وہ ان کے پختہ اور اصلی رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔

یہاں داغ کی ہوس پرستی اور رندی کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ قابلِ لحاظ ہے۔ داغ نے ۱۳۰۸ھ[3] میں دربار رامپور سے قطع تعلق کیا اور اسی سال حیدر آباد گئے، اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس سے صرف ایک سال بلکہ چند مہینے کم تھی، اس عمر میں جوانی کی چڑھی آندھی اُتر چکی ہوتی ہے اور بقول غالب قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا، ان حالات میں یہ نتیجہ نکالنا زیادہ صحیح نہیں ہوگا کہ شاہد پرستی کے جو مضامین اس دور میں داغ کے کلام میں ملتے ہیں وہ اُن کے اس وقت کے ذاتی وارِدات اور واقعات کا بیان ہیں، اُن کی شوخی اور تیزی جو بلاشبہ بھرپور جوانی کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے زیادہ سے زیادہ اُن کی

---

[1] گلزار داغ، مطبع انوار محمدی لکھنؤ تینتیسواں اڈیشن، تاریخ طبع اول ۱۲۹۶ھ — [2] آفتاب داغ، مطبع انوار المطابع لکھنؤ، تاریخ طبع اول ۱۳۰۳ھ — [3] جلوۂ داغ، احسن مارہروی، مطبع شمسی حیدر آباد، صفحہ ۴۴، ۴۵

شوخیِ طبع کا نتیجہ ہے یا پھر جوانی کی یاد ہے جو دل میں گدگدی پیدا کرتی رہتی ہے ہمارے اکثر شعرا کی عمر کا آخری حصہ بڑی تنگ دستی عسرت اور معاشی بدحالی میں بسر ہوا ہے - میر، مصحفی، انشا، جرأت سے لیکر غالب تک سب کا انجام کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے - اسی لئے ان لوگوں کے آخر عمر کے کلام میں حزن و ملال زیادہ ہے، داغ کا یہ زمانہ نہایت فارغ البالی اور اطمینان سے بسر ہوا اور طبیعت کی وہ شوخی چلبلاپن اور رنگینی جو قلعہ معلیٰ میں پیدا ہوئی، دربار رامپور میں پروان چڑھی، حیدر آباد میں بھی قایم اور باقی نظر آتی ہے

شاہد پرستی اور رندی کے ان مضامین کا غزل سے خاص تعلق ہے - یہاں غزل کی تعریف اور اس کے عناصر کا تجزیہ مقصود نہیں ہے، حسبِ ذیل دو بیانات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہیں، غیاث اللغات کا مؤلف لکھتا ہے[1]:-

"غزال بفتحتیں . . . . بازی کردن از جوانی و حدیث صحبت و عشق زناں"

دریائے لطافت[2] میں اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے :-

"دراں ابیات سوائے ذکر شاہد و شراب و شکوۂ الم مفارقت و بیان جفا و خوئے بد معشوق زیبا نہ باشد و ہر آنچہ خلاف آنست غزل نبود و تصرفات یاداں اعتبار ندارد و کسانیکہ اشعار غزل برائے اظہار رعب بر ابلہاں و ملقب شدن بہ صاحب طرز جدید معما ساختہ اند کلام آنہا ہمہ غیر فصیح است و دو راز پایۂ قبول و شہرت در بلید طبعاں ہرگز نزدیک عقلا معتبر نیست"

ارتقائی ترتیب سے داغ کی عشقیہ شاعری کے اس عنصر کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے - ایک طرف گلزار داغ اور آفتاب داغ کا کلام جو رامپور کی یادگار ہے دوسرا مہتاب داغ اور یادگار داغ جو آخری دور کا کلام ہے اور جس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ جو رنگ اور جو انداز پہلے دور میں کہیں کہیں جھلکتا تھا اب اس کا جلوہ عام ہوچکا ہے اور وہ شوخی جس میں حیا زیادہ اور شوخی کم تھی اب بدل چکی ہے اب شوخی، شرارت، چلبلاپن، اچپلاہٹ فتنۂ قیامت بن چکی ہے، ان میں داغ ایک رند شاہد باز عاشقی کی بہت سی منزلیں طے کرچکا ہے، وہ اس مزہ سے پوری طرح واقف ہے اور اسے مزہ لے لے کر بیان کرتا ہے، بلاشبہ بعض اشعار ایسے بھی آجاتے ہیں جن میں گن گن کر بوسے لینے کا ذکر، اور "زبان میری دہن میں تیرے، زبان تیری دہن میں میرے" قسم کے مضامین ہیں لیکن بڑی تلاش کے بعد بھی ایسے اشعار کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہوگی اس اعتبار سے یہ دس بیس اشعار بآسانی نظر انداز کردئے جاسکتے ہیں اور ان کی بناء پر داغ کو اوباش یا ان کی شاعری کو فحش یا مبتذل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ان اشعار کی خوبی ان کی شوخی اور بانکپن ہے - بعض لوگ غزل میں غلو تخیل اور مضمون آفرینی تلاش کرتے ہیں، قطع نظر اس بحث سے کہ اس انداز کا غزل سے واقعی کوئی تعلق بھی ہے، داغ کے یہاں اس کی تلاش سعیِ لاحاصل ہے کہ ان کا طرز ہی الگ ہے - اس طرز میں سیدھی سادی واردات اور واقعات عشق بیان ہوئے ہیں - اور عشق بالکل وہی ہے جسے بعض لوگوں نے 'فساد خوردن گندم' کا اثر بتایا ہے - یہ صحیح ہے کہ یہ رنگ اس سے ملتا جلتا ہے جو جرأت نے اختیار کیا ہے لیکن جرأت کے یہاں شوخی اور بانکپن کی جگہ ایک طرح کا احساس کمتری ہے جو غالباً ان کی بصارت سے محروم ہونے کے باعث پیدا ہوا ہے - اور اس کی تلافی انھوں نے غیر معمولی مزاج اور غیر معمولی اندازِ بیان اختیار کرکے ایک انفرادیت کی صورت میں ظاہر کرنے سے کی ہے - اس لئے یہ تسلیم کرلینا پڑتا ہے کہ کہیں کہیں وہ بےشک حد سے بڑھ گئے ہیں یا پھسل پڑے ہیں - داغ کے یہاں اس قسم کا احساس کمتری کہیں نہیں ملتا اور غالباً طبیعت کی شوخی شرارت یا چلبلاپن بھی اسی وجہ سے قایم رہا - ان کے تیور ہزیمت خوردہ عاشق کے نہیں ہیں جو محبوب کی ٹھوکروں سے پامال ہو جاتا ہے، جو رقیبوں سے ڈرتا ہے اور محبوب کے سامنے بھی ذکر رقیب کی جرأت نہیں کرتا، داغ کا انداز بالکل دوسرا ہے - یہ شعر دیکھئے :-

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا — دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا

---

[1] غیاث اللغات، صفحہ ۳۴۸ - [2] دریائے لطافت ص ۲۳۶

یا پھر یہ شعر :- اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں، تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا،

اور یہ مقطع :- ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغ بے وفا نکلا یہ پوچھے اُن سے کوئی وہ غلام کس کا تھا

یہ تیور داغ کے سوا اور کہاں مل سکتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال[1] ہے اُردو غزل میں کم لوگوں نے عشق کی سطح کو بلند رکھا ہے، ان میں مومن خاں مومن بھی ہیں۔ اور جن لوگوں نے خاص طور پر اس سطح کو پست کیا ہے اُن میں متوسطین میں جرأت اور متاخرین میں داغ ہیں۔ معلوم نہیں عشق کی بلند و پست سطح سے کیا مراد ہے، ایسا عارفانہ عشق جس میں عاشق محبوب کے حسن و جمال اس کے خد و خال، زلف و عارض، دہن و کمر سے لگاؤ ظاہر نہ کرے، جیسے محبوب سے ملنے، اسے اپنانے اور غیروں کے تصرف نہ آنے دینے کا خیال نہ آئے، جس میں شوق وصال اور ہجر کا سوال نہ ہو یا جس کے محبوب کا اور کوئی چاہنے والا نہ ہو یا ہو تو عاشق کی بلا سے تو ایسا عشق کم از کم اُردو غزل میں کہیں نہیں ملتا۔ سلطان محمد قلی قطب کی بھاگ متی سے مصحفی کی عصمت اور داغ کی حجاب تک ایک مرد نے ایک عورت سے عشق کیا ہے اور اس پر تصنع یا تکلف کے کتنے ہی پردے کیوں نہ ڈالے جائیں اور پارسائی کی کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کھائی جائیں اس عشق کی تہ میں جنسی لگاؤ ضرور پایا جاتا ہے اور ایک ایسے زمانہ میں جب معاشرتی آزادی کا انداز وہ نہ تھا جو آج ہے اور مردوں عورتوں کا ملنا نہ ممکن تھا اور نہ پسندیدہ' یہ بات قطعاً تعجب انگیز نہیں کہ ہمارے شعرا بازاری عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ داغ کا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ انھوں نے اس حقیقت کو ذرا بے جھجک ہوکر بیان کر دیا لیکن اس اعتبار سے بھی وہ کم از کم اُن غزل کے باکمال استادوں سے زیادہ قابلِ احترام ہیں جنھوں نے اسے چھپانے کے لئے امرد پرستی کا سچا یا جھوٹا پردہ ڈالا ہے جو یقیناً داغ کی صاف گوئی سے زیادہ مکروہ اور نفسیاتی اعتبار سے ایک مریض ذہنیت کا ترجمان ہے۔

داغ نے اُردو غزل کو اس منزل پر پایا جہاں ناسخ اور آتش کے شاگردوں نے اسے پہونچا دیا تھا، یہاں پہونچکر غزل میں رسمی مضامین، رسمی اشارے اور کنائے، خیالی مضامین اور تلاش الفاظ کے سوا کچھ نہ رہا تھا، داغ نے غزل کو ایک نئے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا اور ان حقیقتوں کو خود بغیر جھجکے بیان کیا، پھر اس کے لئے اندازِ بیان ایسا اختیار کیا جس سے زیادہ رچا ہوا انداز غزل کو اس سے پہلے نصیب نہ ہوا تھا، وہ پہلے غزل گو ہیں جن کی غزل زبان اور محاورے کی تاریخ میں بھی ایک بے مثل شاہکار ہے لیکن اس کی تفصیل اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

کتابیات ۔ گلزار داغ ۔ مطبع انوار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۶ھ ـــــ آفتاب داغ ـــ انوار المطابع لکھنؤ ۱۳۰۲ھ ۔

مہتاب داغ ۔ مطبع مفید عام لاہور مرتبہ لالہ سری رام ـــــ ضمیمۂ یادگار داغ ۔ فریاد داغ ۔ مطبع اخبار نیر اعظم مراد آباد ۱۳۰۲ھ

جلوۂ داغ ـــ مولانا احسن مارہروی، مطبع شمسی حیدر آباد دکن ـــ آئینۂ داغ ۔ نثار علی شہرت دہلوی۔

گلشنِ بیخار ۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مطبوعہ نولکشور ـــ مصحفی ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور۔

جرأت اس کا عہد اور عشقیہ شاعری ـــ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مطبوعہ سندھ اُردو اکیڈیمی کراچی۔

بنی ـــ مصنفۂ واجد علی شاہ، مطبوعہ مطبع شاہی مٹیا برج ـــ تاریخ ادبِ اُردو، رام بابو سکسینہ، مترجمہ مرزا محمد عسکری

دریائے لطافت ـــ انشاء اللہ خاں، مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔

غیاث اللغات ۔ غیاث الدین ـــ انتخاب مومن ـــ سید وقار عظیم، مطبوعہ سندھ اُردو اکیڈیمی کراچی۔

---

[1] انتخاب مومن سید وقار عظیم، صفحہ ۱۹

داغ کی شاہد پرستیاں

(یاسین علی خاں بی۔ اے)

داغ کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ اول اول تو اچھے گانے والیوں کو مہینے میں دو چار مرتبہ بلوا کر رات کے کھانے کے بعد گھنٹے دو گھنٹے گانا سن لیا کرتے تھے اور جب تنخواہ بڑھ گئی تو یکے بعد دیگرے دو تین طوائفوں کو ڈیڑھ دو سو ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ انکی نوکری صرف اتنی تھی کہ دوسرے تیسرے روز یا جب بھی طلبی ہو گانا سنا دیا کریں۔ ان محفلوں میں گنتی کے لوگ شریک رہتے تھے، جن میں مرزا خورشید عالم عابد۔ ابوالحمید آزاد۔ بارق نواب صاحب اور نواب عزیز یار جنگ اور تجلی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کبھی ایک دو شاگرد بھی ہوا کرتے مہاراجہ بہادر بھی کبھی کبھی آجایا کرتے تھے۔ سب سے پہلے صاحب جان کو ملازم رکھا۔ یہ آگرہ کی رہنے والی تھی۔ صورت شکل کی زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن گاتی خوب تھی اور چوٹی کا کلام یاد تھا۔ اس کے بعد عمدہ جان کو ملازم رکھا جو میرٹھ کی رہنے والی تھی۔ نہایت شکیل اور بڑی حاضر جواب۔ گاتی بھی خوب تھی۔ وہ کسی سے نکاح کرکے پردہ نشین ہو گئی۔ اس کے بعد آخری زمانہ میں سورت کی رہنے والی اختر جان کو دو سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھا جو ایک نوعمر اور حسین طوایف تھی۔ سال ڈیڑھ سال بعد انے داغ صاحب کی ملازمت چھوڑ دی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک لکھنوی صاحب اس وقت منصف تھے اور بعد کو سشن جج ہو گئے تھے۔ وہ اختر جان پر بری طرح فدا تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اپنے گھر ڈال لیں۔ مگر وہ داغ کی ملازم تھی اور داغ استادِ شاہ تھے، اس لئے چپکے چپکے ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے۔ بالآخر انھوں نے اختر کو سمجھا بجھا کر اس سے یہ کہلوا دیا کہ اب میں سورت واپس جانا چاہتی ہوں آپ میری مدد کر دیجئے۔ داغ صاحب نے مہاراجہ بہادر سے سفارش کی اسے وہاں سے کچھ روپیہ مل بھی گیا لیکن ترک ملازمت کے بعد وہ اپنے وطن نہیں گئی بلکہ کچھ دنوں کے لئے بمبئی جاکر پھر حیدر آباد واپس آگئی یہ قصہ داغ صاحب کے انتقال سے کوئی پونے دو برس پہلے کا ہے چنانچہ ایک خط مورخہ ۳ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں نواب حسن علی خاں صاحب کو لکھتے ہیں:-

"جو کچھ مہاراجہ بہادر کے پاس سے اختر کو مدد خرچ ملا ہے مجھ کو معلوم ہے، بلکہ میں نے مہاراجہ بہادر کو لکھا بھی تھا اور سعی بھی کی تھی۔ یہ لوگ صاف نہیں ہیں، مجرا نہیں شراب بھی ہے اور بھنگ بھی۔ یہ آجکل کمانے کے اچھے ہیں ڈھنگ بھی۔ اختر جان کو یہ شعر بھیجئے۔ شاید کل یہ شعر مکان پر کسی کو میں نے لکھ بھیجا ہے۔ دریافت کرنا" اس زمانہ میں منی جان حجاب بھی حیدر آباد میں موجود تھیں۔ نواب صاحب فرماتے تھے کہ داغ کو اچھی صورت سے عشق تھا اور جب کسی حسین کی صحبت میسر نہ آتی تو انھیں وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ ایک واقعہ اختر جان ہی سے متعلق یاد آگیا۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر اور نواب صاحب دونوں بیان کرتے تھے کہ ایک دن داغ کو ترک ملازمت کے بعد بھی اختر جان کا خیال آیا۔ جمال صاحب ملازم خاص کو بھیجا اور کہا کہ دیکھ ساتھ لیتے آنا جمال صاحب بڑے کمال کے آدمی تھے بہ مشکل دستخط کر سکتے تھے لیکن سلیقہ غضب کا تھا۔ ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ داغ کی اکثر غزلیں یاد کرلی تھیں اور بڑے مزے سے گا کر سنایا کرتے تھے اور نقالی میں استاد تھے۔ یہ گئے اور بہت کچھ ڈورے ڈالے لیکن وہ کب ماننے والی تھی۔ جمال صاحب ناکام واپس ہوئے۔ نواب صاحب نے اختر کی مفارقت میں داغ کا جب

یہ عالم دیکھا تو مہاراجہ بہادر سے اس کا ذکر کیا۔ مہاراجہ بہادر داغ کے شیدائی تھے کسی نہ کسی طرح اختر کو سمجھا کر دوبارہ ملازم کرا دیا اور اپنے پاس سے بھی سو روپیہ ماہوار دیدیا کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ داغ فطرتاً حسن پرست اور عاشق مزاج تھے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ جو تادمِ مرگ ان کے ساتھ رہی۔ اور یہی ان کی شاعری کی کامیابی کا راز تھا۔ اسی لئے داغ نے آخر وقت تک مہوشوں سے سابقہ رکھا اور ہمیشہ شگفتہ اور جان دار شعر کہتے رہے۔ چنانچہ دکن میں جو اچھی غزلیں داغ نے کہی ہیں ان میں کے اکثر شعر ایسی ہی محفلوں میں لکھے گئے تھے۔ بعض دفعہ تو یہ ہوتا کہ گانا ہو رہا ہے۔ داغ شعر لکھوا رہے ہیں۔ آمد کا وہ عالم ہے کہ دو شاگرد علٰحدہ علٰحدہ لکھتے جاتے ہیں پھر بھی جس تیزی سے داغ صاحب شعر کہتے جاتے اس رفتار سے لکھنا مشکل ہوجاتا اور نتیجتاً ایک آدھ شعر یا دو چار مصرع چھوٹ جاتے۔

منی جان حجاب

مثنوی "فریادِ داغ" میں منی جان حجاب کی جوانی کی تصویر داغ نے یوں کھینچی ہے:-

سج دھج آفت غضب تراش خراش — کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش
وہ اٹکتی ہوئی نظر آہا، — وہ لچکتی ہوئی کمر آہا
نشۂ حسن کی ترنگ غضب — نو جوانی کی تھی امنگ غضب
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی — لن ترانی جواب میں کیسی،
گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا — ادھر آنا اُدھر نکل جانا
حسن کی آن بان ہائے غضب — بے نیازی کی شان ہائے غضب
رقصِ طاؤس باغ سے اچھا — شعر کا لطف داغ سے اچھا
جس طرف اُٹھ گئی وہ شوخ نگاہ — شور اُٹھا کہ بس خدا کی پناہ

حجاب کے ہونٹ پر تل تھا اس سے فایدہ اُٹھاتے ہوئے داغ نے ایک رُباعی لکھی ہے:-

تم تو فلکِ حسن پہ ہو ماہِ منیر — سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دلگیر
خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اس کا — بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

داغ کی زبانی آپ حجاب کی جوانی کی کہانی سُن چکے۔ اب مجھ سے کچھ ان کے بڑھاپے کا حال سنئے۔ داغ نے کچھ ایسی چوٹ دل پر کھائی تھی کہ مدت العمر بھلائی نہ گئی۔ رامپور سے قطع تعلق کے بعد داغ بھی حجاب کو فراموش کر چکے تھے، لیکن دکن کی خوشحالی کے زمانہ میں پھر یاد تازہ ہوگئی۔ ۱۳۱۶ھ میں داغ کی اہلیہ داغ مفارقت دے گئیں جس کا ان کو سخت صدمہ تھا۔ اپنی اہلیہ کے انتقال کے کوئی دو سال بعد نواب بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری اور قاضی عبدالحمید ساکن کلکتہ کے توسط سے حجاب سے پھر نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوا اور حجاب اس شرط کے ساتھ ۱۹۰۱ء کے آخری مہینے میں حیدر آباد آئیں کہ جب تک نکاح نہ ہوجائے گا وہ سامنے نہ آئیں گی —— حجاب کے ساتھ ایک شخص خدا بخش بھی تھا۔ جس کو میں نے بھی دیکھا ہے کیونکہ یہ داغ کے انتقال کے بعد بھی آٹھ دس برس تک زندہ تھا اور حیدر آباد ہی میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ خدا بخش ستار خوب بجاتے تھے اور پکا گانا گاتے تھے۔ عمر کوئی ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اکثر امرا کے پاس جایا کرتے اور گانے کی تعلیم ان کے بچوں کو دیا کرتے تھے اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ حیدر آباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ حجاب جب حیدر آباد آئیں تو کچھ دن تک پردہ پر اصرار کا سلسلہ جاری رہا، لیکن آخر کار یہ حجاب ٹوٹا اور وہ سامنے ہوگئیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب داغ قدیم مکان واقع محبوب گنج ہی میں رہا کرتے تھے اور ابھی ترپ بازار والی بڑی کوٹھی میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ حجاب کا قیام نیچے کی منزل میں تھا اور داغ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارا کرتے تھے اور دونوں وقت کا کھانا بھی نئے مہمان کے ساتھ ہی کھایا کرتے تھے۔

نواب میر حسن علی خاں صاحب[1] کا زیادہ تر وقت داغ کے ساتھ گزرتا تھا، لیکن جب انھوں نے یہ صورت دیکھی تو آنا جانا کم کردیا اسی واقعہ کی طرف داغ نے اپنے ایک خط مورخۂ ۲۵ جنوری ۱۹۰۲ء میں اشارہ کیا ہے - وہ خط یہ ہے :-

"نواب بہادر - صاحب عالم بہادر کہتے ہیں کہ کل صبح پتنگوں کے پیچ ہیں بغیر نواب صاحب کی تشریف آوری کے کچھ نہیں ہوسکتا مجھ کو خبر نہ تھی کہ پیچ وہاں لڑیں گے اور دلوں میں پیچ مجھ سے پڑے گا - مرد خدا یہ کیا بات ہے - آپ نے محبت یک لخت کم کر کے کیوں ترک کردی میں نے کوئی بات بغیر آپ کے مشورہ کے نہیں کی - مصلحت وقت نہیں چھوڑی جاتی - آپ کو حسب معمول روز آنا چاہئے اور ماحضر بھی تناول فرمانا چاہئے - اور اگر تنہا کھانا کھانا گوارا نہیں ہے تو بہتر ہے نہ کھائیے - مجھ کو غم بھی نہ کھلائیے - آیئے آیئے - تشریف لایئے - فقط فصیح الملک داغ دہلوی"

واقعہ یہ تھا کہ بی حجاب اور داغ کو بھی پتنگ بازی سے دلچسپی تھی - مرزا خورشید عالم بہادر سے وہ بے پردہ ہوچکی تھیں اور حجاب ہی کے ایما سے پتنگوں کے پیچ مقرر ہوئے تھے - مرزا خورشید عالم بہادر نے داغ سے کہدیا کہ نواب صاحب مجھ سے بے پردگی اور اُن سے پردہ کرنے پر رنجیدہ ہیں اور ان کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا - داغ نے اسی شب تذکرۂ صدر رقعہ نواب صاحب کو لکھا - نواب صاحب کہتے ہیں مجھے داغ صاحب سے بے حد محبت تھی اور جب یہ رقعہ مجھے ملا تو میں صبح کے انتظار میں بے چین رہا اور صبح کو نماز کے بعد ہی وہاں پہونچا - ملازم نے کہا داغ نیچے ہیں اور خود پکوان کی نگرانی کر رہے ہیں، مجھے حیرت ہوئی کہ آج ان کو پکانے کی خوب سوجھی - میں اوپر بیٹھا رہا - تھوڑی دیر میں ملازم آیا اور کہنے لگا سرکار آپ کو نیچے بلاتے ہیں - مجھے معلوم تھا کہ وہ زنانہ حصۂ مکان ہے - اس لئے میں نے ملازم سے کہا مجھے نہیں کسی اور کو بلایا ہوگا - وہ چلا گیا اور پھر بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا - سرکار کہتے ہیں نواب صاحب کو یہاں بلالو - میں نیچے اُترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ داغ ڈیوڑھی کے دروازہ پر میرے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں اور جیسے ہی مجھ کو دیکھا - فرمایا - زود رنج نواب آگئے - اور گلے سے لپٹا لیا - اور ہاتھ پکڑ کر اندر لیچلے - نواب صاحب کہتے تھے جیسے ہی میں نے صحن خانہ میں قدم رکھا تو ایک قہقہہ کی آواز سنی اور بی حجاب میرے سامنے تھیں اور داغ مسکرا رہے تھے، کوئی ۴۰ - ۴۵ کا سن ہوگا - رنگ صاف آنکھیں بڑی بڑی - ناک اونچی بالوں پر خضاب چڑھا ہوا - پتلے پتلے لب - میانہ قد - اونچی پیشانی - مانگ چھٹی چھٹی سی تنگ اطلس کا پاجامہ مغزی ٹکا ہوا - لانبا کرتا اور اس پر سفید اوڑھنی - پاؤں میں دہلی کی جوتی اور دونوں ہاتھوں کی پتلی پتلی اُنگلیوں میں انگوٹھیاں - میں نے سلام کیا - حجاب نے اس کا جواب نہایت ہی خندہ پیشانی سے دیا اور خاموش رہیں - داغ بہت خوش تھے کہنے لگے نواب تمھارے لئے آج بریانی پک رہی ہے - فنجہ حیدرآبادی ہو اندر کے دالان میں دو تخت پڑے ہوئے تھے اور اس پر دو بڑے بڑے قالین بچھے ہوئے تھے - میں اور داغ تخت پر بیٹھ گئے اور حجاب بھی کچھ دور کرسی پر آکر بیٹھ گئیں - اور خاموش رہیں - داغ نے امیری (پروردہ) سے کہا حقہ لا - دو حقے آگئے - تھوڑی دیر تک سکوت رہا اس کے بعد داغ نے فرمایا - آج پتنگوں کے پیچ ہیں - آپ ہماری طرف ہوں گے - دیکھیں تو مرزا خورشید کیسے پیچ کاٹتے ہیں - یہ فقرہ سُن کر حجاب بول اُٹھیں - ہاں نواب صاحب ہماری طرف ہوں گے اور داغ سے کہا سامان تو نواب صاحب کو دکھالیں اور اُٹھ کر برابر کے کمرے میں گئیں اور وہاں سے دو چار پتنگ اور مانجھے کی چرخی لئے ہوئے آئیں اور نواب صاحب کے سامنے رکھدیں - نوابصاحب نے پتنگ اور مانجھا دیکھا اور کہا بہت اچھا سامان ہے آج صاحب عالم بہادر کی خیر نہیں - اس کے بعد حجاب کھلتی گئیں اور کہا آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا - روزانہ آپ کا نام سنتی تھی - آج ملاقات ہوئی - داغ مسکراتے جاتے تھے اور حجاب اور نواب صاحب

---

[1] نواب حسن علی خاں کے پردادا سید محمد صاحب اورنگ زیب کے زمانہ میں حیدرآباد آئے اور صاحب منصب و جاگیر ہوگئے تھے - اسی منصب جاگیر کا کچھ حصہ نواب حسن علی خاں کو بھی ملا تھا اور جس وقت داغ حیدرآباد پہونچے تو یہ امیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے لیکن داغ کے حیدرآباد پہونچنے پر انھوں نے بھی داغ کی شاگردی اختیار کی، لیکن شاگردی سے زیادہ مضبوط رشتہ دوستی و محبت تھا جو اخیر وقت تک باقی رہا۔

کی گفتگو سنتے جاتے تھے۔ داغ نے کہا نواب صاحب صبح کو چائے پیتے ہیں اگر دیر ہوگئی تو خفا ہوجائیں گے۔ حجاب نے زور سے قہقہہ لگایا اور کسی سے کہا کہ چائے جلد لا ورنہ نواب صاحب روٹھ جائیں گے۔ تھوڑی دیر میں اسی تخت پر دسترخوان بچھا۔ صاحب عالم بہادر بھی بلوائے گئے۔ ان کے آتے ہی داغ نے بلند آواز سے کہا۔ صاحب عالم بہادر آج نواب صاحب ہماری طرف ہوں گے اور ان کا کہنا ہے کہ آج دیکھیں تو آپ کیسے پیچ کاٹتے ہیں۔ صاحب عالم بہادر نے کہا اب دیر ہی کیا ہے خود فیصلہ ہوجائے گا۔ نواب صاحب نے داغ اور حجاب سے متعلق ایک طویل غزل کہی تھی اور اس بے پردگی سے قبل خورشید عالم بہادر کو سنا چکے تھے۔ (یہ غزل انھوں نے اپنے دیوان میں نہیں رکھی۔ اس کا صرف مطلع جو اُن سے سنا تھا مجھے یاد رہ گیا) مرزا خورشید عالم بہادر نے داغ سے کہا نواب صاحب نے ایک تازہ غزل کہی ہے اور سننے کے قابل ہے۔ حجاب نے کہا ہاں نواب صاحب سرفراز فرمائیے۔ داغ نے بھی کہا بھئی سناؤ۔ نواب صاحب پریشان تھے کہ پہلی ملاقات میں ایسی غزل کیسے سناؤں۔ بہت عذر کیا لیکن سب کے اصرار پر دو چار شعر اس وقت سنا ہی دئے۔ اس کا مطلع یہ تھا:-

یہ حجاب آپ کا گو ٹوٹنے والا ہے ضرور   روزِ محشر پہ مگر آپ نے ٹالا ہے ضرور

نواب صاحب کہتے تھے کہ یہی ایک ایسی غزل تھی جس پر میں نے اصلاح نہیں لی۔ داغ نیم دراز تھے اُٹھ بیٹھے اور اس شعر کے مزے لینے لگے۔ حجاب بہت خفیف ہوئیں مگر چپ تھیں۔ جب غزل ختم ہوئی تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور اس کے بعد دوپہر کے کھانے سے قبل تک پتنگ بازی ہوتی رہی۔ جب دھوپ تیز ہوگئی تو یہ شغل بند ہوا۔ اور دوپہر کا کھانا کھاکر نواب صاحب اپنے گھر واپس ہوئے اور اس روز سے حسب سابق داغ کے پاس آنے جانے لگے۔ حجاب گرم مزاج تھیں۔ اپنے اور داغ کے بیچ میں کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتی تھیں اور داغ کے اعزہ کو ان کی یہ باتیں ناگوار تھیں۔ اس کے سوا یہ بھی ہوا کہ حجاب نے اپنے چند لواحقین کو جو انکے دست نگر تھے حیدر آباد بلالیا تھا۔ داغ ان سب کو اپنے گھر رکھ نہیں سکتے تھے اس لئے ایک کرائے کا مکان تجویز ہوا۔ حجاب کے لوگ اس میں ٹھہرا دئے گئے اور اس بات کا داغ کے رات دن کے بیٹھنے والوں میں بھی صرف دو تین ہی کو علم تھا۔ حجاب، داغ ہی کے گھر میں رہتی تھیں اور اپنے لواحقین کی خبر گیری بھی کرتی تھیں۔ مکان کا کرایہ تو معمولی تھا لیکن داغ سارے خرچ کی کفالت کے بعد سو روپیہ ماہانہ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ان کو ناکافی ہونے لگا۔ وہ اِدھر اُدھر سے قرض لینے لگیں چنانچہ داغ کی صاحبزادی سے کبھی لے لیتیں کبھی کسی اور سے اس کی جب خبر داغ کو ہوئی تو وہ بگڑ گئے اور حجاب کرایہ کے مکان میں اُٹھ گئیں چنانچہ اسی کا ذکر داغ نے نواب صاحب سے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو ۳ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ کا لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:-

"حجاب کے گھر آپ گئے۔ کیفیت معلوم ہوئی۔ ان کی گزر یوں تو سو روپے مہینے میں بھی نہ ہوگی۔ جب وہ میرے مکان میں تھیں تو گیارہ مہینے بتاتی تھیں۔ مکان دار کو معرفت عبدالحمید (ملازم) کے بلاکر دریافت کرو کہ تمہارا کیا لینا ہے۔ از روئے کاغذ بتاؤ۔ اور نصف کرائے پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر لینا ہو تو اس سے زیادہ یہاں سے نہیں ملیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا جواب لے کے مجھے لکھئے۔"

اس کے بعد ایک اور خط مورخہ ۵ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں لکھتے ہیں:-

"لفظ بی جو شرفا کے واسطے ہے اس پر خفا ہوئیں میں نے خوب جھاڑا ہے۔ ذرا ان کو جھاڑئے گا۔ میں نے جو ان کو خط لکھا ہے وہ اتا کے خط میں ہے اس کو اتا سے لیکر آپ پہونچائیں تو بڑی عنایت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ناچاقیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ لیکن نواب صاحب بیچ بچاؤ کرتے رہتے تھے۔ بالآخر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ چنانچہ اس کے بعد کے خط میں جو ۷ جمادی الاول ۱۳۲۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ نواب صاحب کو لکھتے ہیں:-

"نواب صاحب۔ سلام۔ میں خیر کا طالب ہوں ہر حج کار منظور نہیں۔ مرمت کی کیا صورت ہوئی۔ اس بارش میں

مشکل ہے۔ بی حجاب کل سے وارد ہیں اور آپ کی مشتاق۔ ان کا مکان گرا۔ جان بچ گئی۔ اس کی مرمت ہو رہی ہے۔ یہاں تو کہیں ٹھکانا نہیں۔ زیادہ نیاز۔ فصیح الملک داغ دہلوی"۔

یہ وہ زمانہ ہے جب داغ ترپ بازار کی بڑی کوٹھی میں منتقل ہو چکے تھے۔ اسی سال حجاب اپنے وطن واپس چلی گئیں۔ اسکے دو سبب تھے ایک تو یہ کہ داغ سے جو روپیہ انھیں ملتا تھا وہ ان کی نظر میں ناکافی تھا اور دوسرا یہ کہ داغ کو گانا سننے کا بےحد شوق تھا اور اس وقت ان کے پاس اختر جان طوائف دو سو ماہوار پر ملازم تھی۔ یہ امر بھی حجاب کو سخت ناگوار تھا۔ الغرض ناچاقیاں اتنی بڑھیں کہ وہ اپنے وطن چلی گئیں اور داغ بھی خاموش ہو رہے۔ نواب صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد بھی زرِ نقد حجاب کو تادمِ مرگ بھیجتے رہے جس کی خبر داغ اور حسن علی خاں صاحب کے سوا تیسرے کو نہ تھی۔ حجاب شاعرہ بھی تھیں انکا نمونۂ کلام یہ ہے:۔

امر دشوار تھا اس گھر میں رسائی میری
کششِ دل نے پتہ ٹھیک بتایا تیرا

آج مجھ سے وہ سرِ بزم ادا سے بولے
تو شناسا ہے مرا میں ہوں شناسا تیرا

بزم دلدار میں اغیار کا مجمع ہے حجاب
قصد کیا دل میں ہے اب کیا ہے ارادہ تیرا

بس میں اغیار کے ہے یار اپنا
دل ہے اس غم سے بے قرار اپنا

دل بہت بے چین بے آرام ہے
کیا محبت کا یہی انجام ہے

داغ کی انصاف پسندی

(نفیس سندیلوی)

محمود علی خاں محمود رامپوری داغ کے نہایت عزیز شاگرد تھے اور اپنے استاد کے رنگ میں خوب کہتے تھے۔ ان کی حیات ان کے ایک شاگرد رشید رامپوری نے مرتب کی ہے، اس میں ایک واقعہ درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ داغ شعر و شاعری کے باب میں انصاف پسندی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

صاحب حیات محمود لکھتے ہیں:۔

"ایک روز استاد داغ نے بیٹھے بیٹھے ایک مطلع کہا:۔

کیا کہوں تجھ کو جو بے مہر و ستمگر نہ کہوں
جو زمانہ کہے اس بات کو کیونکر نہ کہوں

جب محمود صاحب کو سنایا تو انھوں نے کہا:۔ "استاد، قصور معاف "جو زمانہ کہے" یا "جس کو دنیا کہے" اہلِ زبان "زمانہ کہے" نہیں لکھتے۔

داغ سنکر چپ ہو گئے، تھوڑی دیر بعد مقطع سنانے لگے:۔

حرفِ بد منھ سے نکالا تو تمھیں جانوگے
داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برا بر نہ کہوں

محمود صاحب نے تعریف نہیں کی۔ داغ نے پوچھا "چپ کیوں ہو"۔ بولے "سخت بے ادبی ہے، مگر زبان نہیں رکتی۔ "حرفِ بد" محاورہ کب ہے۔ یوں ہونا چاہئے:۔

"اب کی کچھ منھ سے نکالا تو تمھیں جانوگے"

داغ نے سینے سے لگا لیا اور کہا شاباش، گو یہ ہمارے ہی الفاظ ہیں جو تمھارے کانوں میں پڑے ہیں مگر وقت پر ہم کو یاد نہیں آتے۔"

داغ کی اصلاحیں

(سخاوت مرزا۔ بی اے ال ال بی)

سجادہ صاحب (حضرت گنج نشین پیدری) کا بیان ہے کہ استاد داغ کے پاس تلامذہ کا ایک باقاعدہ رجسٹر رہتا تھا جس میں نام، پتہ، تاریخ وصول خط و جواب بھی درج کی جاتی تھی۔ داغ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ میں پہلے داغ کا غائبانہ شاگرد ہوا اس وقت میری عمر ۱۸ سال کی ہوگی۔ کچھ عرصہ کے بعد میں حیدر آباد گیا۔ ایک تقریب میں نواب شمس الملک ظفر جنگ نے میرا داغ سے تعارف کرایا تو داغ نے فوراً ہی پہچان لیا اور کہا کہ آیا آپ وہی ہیں جن کی غزلیں اصلاح کے لئے بیدر سے آتی ہیں بہت خلوص اور محبت سے ملے، اُس کے بعد جب کبھی بلدہ آتا تو استاد سے ضرور ملتا۔ بالمشافہ اصلاح بھی لیتا۔ طریقہ یہ تھا کہ شاگرد خود اپنی غزل پڑھ کر سناتا یا کوئی اور ممتاز شاگرد پڑھتا، اکثر احسن مارہروی پڑھا کرتے تھے، تلامذہ وقت مقررہ پر عموماً صبح کے وقت جمع ہوجاتے، یکے بعد دیگرے شاگردوں کی غزلیں پڑھی جاتیں۔ ایک شعر پڑھنے کے بعد جملہ تلامذہ سے سوال ہوتا کہ بتلاؤ اس شعر میں کیا نقص ہے۔ ہر ایک کے اظہار خیال کے بعد اُستاد کی رائے اور اصلاح مسلم سمجھی جاتی تھی اس وقت محاورہ بندی، سلاستِ زبان اور روزمرہ کے استعمال کا زیادہ خیال رکھا جاتا اور تلامذہ کو نہ صرف اس کی سخت تاکید تھی بلکہ اُسی وقت بالمشافہ صحیح استعمال کرنا سکھایا کرتے تھے۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہزاروں حیدر آبادی، تلامذۂ داغ زبان کی صفائی اور محاورہ بندی اور سلاست میں اہلِ زبان سے پیچھے نہ رہے۔ گویا حیدر آباد اس وقت جنوبی ہند کا زبردست مرکز اُردو بنا ہوا تھا، جہاں نہ صرف حیدر آباد بلکہ صوبہ مدراس و بنگلور وغیرہ کے اشخاص نے داغ کی شاگردی سے فایدہ اُٹھایا۔

افسوس ہے کہ حیدر آباد جیسے مقام میں جہاں داغ کے سیکڑوں شاگرد ہوں داغ کے اصلاحات کا ذخیرہ نہیں ملتا، پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے پاس انوار اللہ خاں انور المخاطب بہ فضیلت جنگ مرحوم استاد موجودہ حضور نظام کی ایک بیاض ہے جس میں داغ کی صرف ایک اصلاح شدہ غزل موجود ہے۔ جس کو ادارے نے شیشے کے فریم میں محفوظ کرلیا ہے (فہرست ادارہ جلد دوم صفحہ ۴۹) اور مولوی کریم الدین تلمیذ داغ، برادر زادہ عباس علی خانساماں مرحوم کے پاس ایسی سیکڑوں اصلاحی غزلیں تھیں جو افسوس ہے تلف ہوگئیں۔ ہم کو خوش قسمتی سے بقیام بیدر غیر مطبوعہ اصلاحات داغ سجادہ صاحب سے ملیں جن کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

سجادہ :۔	اعجاز حُسن سے تری جوں صبح شام غم	ہوتے ہیں روز چاک گریباں نئے نئے
اصلاح :۔	زیبِ بدن وہ دیکھ کے اسکی قبائے چست	- - - - - - - - - - - - - -
سجادہ :۔	پہلے جو راز داں تھے گئے اُن کو آپ بھول	اب راز داں ہیں آپ کے جاناں نئے نئے
داغ :۔	________________	اب راز داں بنے ہیں میری جاں،

	اُس کو خنداں دیکھ خنداں جام خنداں رہ گیا	شیشۂ گریاں بھی مجھ گریاں پہ گریاں رہ گیا
	دیکھ کر رہا جام شراب	ـــــــ میرے گریہ پہ ـــــــ
سجادہ :-	قد بالا سے تیرے یا نبی کیا سرو کو نسبت	قیامت جس کو کہتے ہیں نمونہ ہے ترے قد کا
داغ :-	- - - - - - - - - - - -	کہ طوبیٰ - - - - - - وہ سایہ ہے ـــــ
سجادہ :-	راز افشانہ ہو اسواسطے میں نے نہ کہا،	اُس ستمگر نے عدو کو ہے دکھایا کاغذ
داغ :-	- - - - - - - - - - - -	- اور اُس نے تو عدو کو بھی ـــــ
سجادہ :-	جناب جھگڑا اگر ہے تو مجھ میں تم میں ہے	خدا کو لاتے ہو کیوں بیچ میں یہ تم ہر بار
داغ :-	حضور - - - - - - - - - - -	- - - - - - - - - - - -
سجادہ :-	میری دز دیدہ نظر پہ تو لگایا الزام،	دلِ عشاق کو پھر آپ چراتے کیوں ہو
داغ :-	- - - - - - - - - - - -	ـــــ تم بھی - - - - - - -
سجادہ :-	اگر دیکھیں گے اُس کے بانکپن کو،	تو مردے چیر کر نکلیں کفن کو،
داغ :-	اگر اُس بت کے دیکھیں - - - - - - -	- - - - - - - - - - - -
سجادہ :-	ہجوم غم سے دل کمہلا رہا ہے،	چلوں کیا خاک پھر سیرِ چمن کو
داغ :-	- - - - - - - - - - - -	- - - - - میں - - - - - -
سجادہ :-	گھر سے باہر بھی تو نکلو اجی از بہر خدا،	دیکھنے کے لئے ہے عاشقِ ناشاد آیا
داغ :-	کہیں نکلو یہ تماشا دیکھو، ــــــ	دل کو تھامے ہوئے اک ــــــ
سجادہ :-	دیکھ آتے ہوئے مقتل کی طرف قاتل کو	پھر گئی آنکھ میں تلوار خدا یاد آیا
داغ :-	دیکھ کر قتل گہ عام میں اُس قاتل کو	مری آنکھوں میں پھری موت ــــــ
سجادہ :-	ہے آج کیا کہ جو نامۂ عتاب آیا	یہ بیوجہ بھلا مجھ پہ کیوں عذاب آیا
داغ :-	- - - - - - - - - - - -	یہ نامہ آیا کہ مجھ پر کوئی ــــــ
سجادہ :-	تعجب آتا ہے کیوں یک بیک پھرے مجھ سے	ذرا کہو تو یہ کیا دل میں اے جناب آیا
داغ :-	- - - - - - - - - - - -	یہ کیا خیال تجھے شوخ بے حجاب آیا

رائے استاد۔ جناب، معشوق کو نہیں کہتے (داغ)

سجادہ :-	ہمارے آگے ہی سجادہ ہیں یہ سب باتیں	مگر نہ سامنے اُن کے کوئی جواب آیا
داغ :-	بڑے زبان کے طرار تھے وہ سجادہ	میرے سوال کا اُن کو نہ کچھ ــــــ
سجادہ :-	دیکھیں تو آگے عشق یہ کیا رنگ لائے گا	کم بخت ہی گلے کا میرے ہار ہوگیا
داغ :-	- - - - - - - - گل کھلائے گا	- - - "اب" - - - - - - - -
سجادہ :-	پیاری صورت ذرا دکھانا تھا	دل کو میرے اجی لبھانا تھا،
داغ	منہ سے گھونگٹ ذرا اُٹھانا تھا	میرے دل کو ذرا جلانا تھا،
سجادہ :-	سر پہ قرآن رہے پہلو میں زنار رہے،	زاہدا دیکھ لے میں تو ہوں مسلماں ایسا
داغ :-	سر پہ قرآن گلے میں میرے زنار رہا	- - - - - تجھے میں ہوں - - - -

سجادہ :- مثالِ وحشیِ ناداں پریشاں حال پھرتے ہیں
کبھی اندر کو آتے ہیں کبھی باہر کو جاتے ہیں

داغ :- ------ مجنوں ---------
کبھی ہم گھر میں آتے ہیں کبھی باہر کو جاتے ہیں

سجادہ :- بھلا رخسار جاناں کے مقابل ہو بھی سکتے ہیں
کروں قربان ماہ و خور تیرے روئے رخشاں پر

داغ :- ------ تاباں ---------

سجادہ :- عیادت کو میری بالیں پر آتے ہی قاتل کو
ہنسی کیا آتی ہے بے طور میری چشمِ گریاں پر

داغ :- -------------
----- کھل کھلا کر آئی -----

سجادہ :- انھیں کیوں دیکھ کر سجادہ تیرا دم نکلتا ہے
ارے وہ ایسے کیسے ہیں جو ایسا دل مچلتا ہے

اصلاح داغ :- -------------
ارے وہ ہیں حسیں کیسے جو تیرا دل مچلتا ہے

سجادہ :- ذرا دل میں خیال اے شمع رو پروانہ کا بھی لا
کہ تجھکو دیکھتے ہی دیکھتے کیسے وہ جلتا ہے

داغ :- ذرا اے شمع تو بھی دیکھ پروانہ کی حالت کو
------- کیسا -----

سجادہ :- بیانِ ہجر جاں کاہ ہے سنا جاتا نہیں ہم سے
تری باتوں سے سجادہ ہمارا دل پگھلتا ہے

داغ :- بیانِ ہجر ہے جانکاہ ہم سنتے نہیں اسکو

سجادہ :- باتوں باتوں میں وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں
کچھ نئی طرز سے وہ جلوہ دکھا دیتے ہیں

داغ :- آنکھوں آنکھوں ---------

سجادہ :- قاصدا کہنا ہے جو کچھ وہ زبانی کہنا
خط نہ دینا کہ وہ اوروں کو بتا دیتے ہیں

داغ :- -------------
------- غیروں کو سنا ----

سجادہ :- خیر اتنا تو ہے اے دل کہ تسلی کے لئے
آتے جاتے رخِ روشن تو دکھا دیتے ہیں

داغ :- ---------- ۲
-------- وہ --------

سجادہ :- حضرتِ عشق کی نیرنگیاں اے دل ہیں نئی
گاہے خوش کرتے ہیں اور گاہے رلا دیتے ہیں

داغ :- -------------
گاہ گاہ ------- یہ گاہ

سجادہ :- نہیں ملتے نہ ملو پیارے صنم خوش ہی رہو
بخدا تم کو ہمیشہ یہ دعا دیتے ہیں

داغ :- ------ خوش رہو آباد رہو

سجادہ :- جب غزل میں میرے نقصان نہیں کچھ باقی
صاد پھر حضرتِ داغ اس پہ بنا دیتے ہیں

سجادہ :- جذبۂ عشق جب اٹھتا ہے تو سجادہ بہت
صبر کرتے ہیں، مناتے ہیں بٹھا دیتے ہیں

داغ :- جوش جب جذب کا اٹھتا ہے تو سجادہ وہیں

سجادہ :- شکستہ دل دکھائیں گے انھیں یوں
یہ ٹوٹا کس طرح برتن تو دیکھو

داغ :- مرا دل توڑ کر کہتے ہیں الٹا

سجادہ :- میں بے وجہ نہیں ہوں تجھ پہ قرباں
تو آئینہ رخِ روشن تو دیکھو

داغ :- میں شیدا تم پہ بے وجہ نہیں ہوں

سجادہ :- لگے مہتاب کا دھوکہ نہ کیوں کر
ذرا اس کا رخِ روشن تو دیکھو

داغ :- لگے کیوں چاند کا دھوکہ نہ تم کو

سجادہ :-	بھری محفل میں دیکھو اُٹھکے منہ ہی چوم لوں گا میں	دوبارا گر کہیں گے آپ اس منہ سے ترا کیا تھا
داغ :-	- - - - - - - - - - - -	دوبارہ آپ فرمائیں تو - - - - - - -
سجادہ :-	گلے لگتا ہے اب مجھ سے رلا کر مجھ کو محفل میں	ارے او بیوفا اُس وقت دلمیں آگیا کیا تھا
داغ :-	- - - - اب ظالم - - - - - - -	- - - - - - - - - - - - -
۲ سجادہ :-	حیا سے آنکھ نیچی صبح اُٹھکر بولے غصہ سے	بہت سر چڑھ گیا تھا رات یہ تجھ کو ہوا کیا تھا
گرہ سجادہ :-	اُنھیں منظور ہے مجھ کو جلانا ہر طرح ورنہ	عدو کے ہاتھ نامہ بھیجنے کا مدعا کیا تھا
داغ :-	- - - - - - - میرا - - - -	- - - - - - - - - - - - -
گرہ سجادہ :-	نہ لڑ اے جنگجو مجھ سے تو ہی انصاف سے کہدے	" " " " "
۲ "	دہائی دیکھئے اُن کی مرا دل لیکے کہتے ہیں	سوا اس تو تھڑے کے آپ نے مجھ کو دیا کیا تھا
۲ "	تمھیں سے پوچھتے ہیں ہم تمھیں انصاف سے کہدو	نہ تھا دل میرا مٹھی میں تو پھر تم نے لیا کیا تھا
۲ "	اُنھیں خط جب مرا پہونچا تو پوچھا یوں رقیبوں نے	ترے صدقہ مری جاں خط میں سجادہ لکھا کیا تھا

داغ کی اصلاحیں

(۲)

(یاسین علی خاں بی اے)

اصلاح کا طریقہ یہ تھا کہ ڈاک سے جو غزلیں آتیں ۔ حاضرالوقت شاگردوں میں سے کوئی سناتا جاتا آپ ہر شعر غور سے سنتے رہتے اور جہاں اصلاح کی ضرورت ہوتی بتاتے جاتے وہی الفاظ سرخی سے بنادئے جاتے اور غزلیں بعد اصلاح واپس کردی جاتیں ۔ اگر زبان ۔ محاورہ ۔ یا کسی اور چیز کی طرف توجہ دلانا ہوتا تو دو چار مختصر جملے اس امر سے متعلق لکھوا دئے جاتے ۔ آخر میں خود اس پر دستخط کردیتے ۔ اور مقامی شاگرد زیادہ تر خود اپنی غزل آپ سناتے ۔ داغ صاحب جہاں ضرورت سمجھتے ردو بدل فرمادیتے اور وہ لوگ اسی طرح بنالیا کرتے ۔ بعض دفعہ ۔ اصلاح کے دوران میں مباحث بھی چھڑ جاتے مباحث بھی چھڑ جاتے ۔ یا تو خود اعتراض کرکے شاگردوں سے اس کا جواب پوچھتے یا شاگردوں کے شکوک اور اعتراضات کا تشفی بخش جواب دیتے اور بعض دفعہ متقدمین کے کلام سے اسناد بھی پیش فرماتے ۔ داغ صاحب کا طریقۂ اصلاح ایسا نہ تھا کہ پورے شعر کاٹ کر دوسرے شعر لکھدئے یا خود اپنی طرف سے شعروں کا اضافہ کردیا ۔ جو شعر کسی وجہ سے رکھنے کے قابل نہ ہوتا وہ بالکل قلم زد کیا جاتا ۔ اور اس کا سقم یا عیب بیان کردیا جاتا ۔ ورنہ الفاظ کے تھوڑے تھوڑے ردو بدل کے ساتھ شعر میں جان ڈال دیا کرتے تھے ۔

ذیل میں داغ کی چند اصلاحیں ملاحظہ فرمائیے :-

حضرت غفراں مکاں آصف سادس :-

آصف :-	چہرے سے ان کے رنگ جو ٹپکا عتاب کا	کیا ہو چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا
اصلاح :-	چھپتا نہیں چھپائے سے چہرہ عتاب کا	ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

عزیز یار جنگ بہادر حیدر آبادی :-

کیا جانیں آب تیغ کی لذت جنابِ خضر   نازاں ہیں وہ تو اپنے ہی آبِ حیات پر

اصلاح :- - - - - - - - - - - - - -   مرتے ہیں وہ تو چشمۂ آبِ حیات پر

عبدالصمد واصفی حیدر آبادی :-

کیا نہ غیر سے اے بے وفا حیلہ   ہمارے پاس ہی آنے تجھے بہانہ ہوا

داغ نے اس شعر کو سُن کر فرمایا۔ اس میں اصلاح ہو گی اور ایک نقطہ کی۔ فرمایا دوسرے مصرع میں آنے کو آتے کر دو

نواب میر حسن علی خاں امیر حیدر آبادی :-

کبھی کچھ ہے کبھی کچھ اور ہے حالت تیری   ہم تو آسان سمجھتے تھے محبت تیری

اصلاح :- کبھی کچھ ہے کبھی کچھ اور طبیعت تیری   - - - - - - - - - - - - -

غیر کو جامِ شراب اور ہمیں کچھ بھی نہیں   یاد رہ جائے گی ساقی یہ عنایت تیری

اصلاح :- غیر کو جامِ شراب اور ہمیں صاف جواب   - - - - - - - - - - - - -

نواب میر حسن علی خاں امیر حیدر آبادی :-

بن ٹھن کے جو کل آپ گئے راہ گزر سے   دیکھا کیا تا دیر میں حسرت کی نظر سے

اصلاح :- بن ٹھن کے وہ نکلے ہیں ابھی راہگذر سے   اللہ بچائے انھیں دشمن کی نظر سے

اس نے حالِ دل سنا کب غور سے   کان آخر مدعی بھر ہی گیا،

اصلاح :- اس نے حالِ دل تغافل سے سُنا   - - - - - - - - - - - - -

امیر آیا ترے روضہ پہ یہ کہتا ہوا آیا   مرے حضرت مرے خواجہ معین الدین اجمیری

اصلاح :- امیر آیا جو روضہ پر تو یہ کہتا ہوا آیا   - - - - - - - - - - - - -

الکدم نہیں ہے زیست کی صورت کسی طرح   ممکن نہیں فراق میں راحت کسی طرح

اصلاح :- دیکھی نہ میں نے چین کی صورت کسی طرح   - - - - - - - - - - - - -

شگفتہ ہوگی نہ گلشن میں خاطر بلبل   پھریگا باغ میں لیکر کہاں کہاں صیاد

اصلاح :- ہوئی شگفتہ کہیں بھی نہ خاطر بلبل   قفس کو لے کے پھرا ہے کہاں کہاں صیاد

غیر کو دیکھتا ہے وہ ظالم،   کس سے آنکھیں وہ چار کرتا ہے

اس پر یہ بھی نوٹ کرا دیا:- دلی والے آنکھیں دو چار کرنا نہیں بولتے۔ آنکھیں چار کرنا محاورہ ہے۔

چھری کو تیری جو رُک رُک کے چلتے دیکھا ہو   اٹک اٹک کے رہی حلق میں فغاں صیاد

اصلاح :- ٹھہر ٹھہر کے قفس میں بنی مرے دم پر   اٹک اٹک کے رہی حلق میں فغاں صیاد

محمد اکبر علی خاں افسوں :-

میں خاموش بیٹھا ہوں اس بُت کے آگے   عجب طرح مطلب ادا ہو رہا ہے

اصلاح :- - - - - - - - - - - - - -   نگاہوں میں مطلب ادا ہو رہا ہے

سید مقصود حسن حیرت :- اقرار وصل صاف نہ انکار وصل صاف   تم تو کچھ ایسے چپ ہو کہ منہ میں زباں نہیں

اصلاح :- - - - - - - - - - - - - -   - - - - - - - کہ گویا زباں نہیں

داغ

پر ایک نظر

(علی کاظمی حیدرآباد دکن)

۱۸۳۱ء ۔ ۲۵ر مئی ولادت، در دہلی۔

۱۸۳۸ء ۔ داغ کے والد شمس الدین احمد خاں کو انگریزوں نے پھانسی دیدی، داغ کی والدہ داغ کو لیکر لوہارو سے دہلی چلی گئیں۔

۱۸۳۹ء ۔ داغ کی والدہ نے مرزا فخرو ولیعہد سے نکاح کیا۔

۱۸۴۶ء ۔ داغ کی شادی۔ خورشید عالم کی ولادت داغ کی والدہ کے بطن سے۔

۱۸۵۶ء ۔ مرزا فخرو کا انتقال (غدر دہلی سے دس ماہ پہلے) اور داغ قلعہ سے نکلے۔

۱۸۵۷ء ۔ غدر، اور داغ رامپور چلے گئے۔

۱۸۶۸ء ۔ گلزار داغ (دیوان اول) شایع ہوا۔

۱۸۶۹ء ۔ حجاب سے پہلی ملاقات

۱۸۸۱ء ۔ حجاب دوبارہ آئی (دوسری ملاقات)

۱۸۸۲ء ۔ حجاب سے ملنے داغ کلکتہ چلے، اپریل میں رامپور سے نکلے جون میں کلکتہ پہونچے، جولائی میں رامپور واپس ہوئے۔

۱۸۸۴ء ۔ آفتاب داغ (دوسرا دیوان) اور فریادِ داغ (مثنوی) شایع ہوئی۔

۱۸۸۶ء ۔ رامپور سے دہلی کو واپسی، دہلی میں قیام، اپریل میں حیدرآباد پہونچے، جون میں پھر واپس دہلی ہوئے۔

۱۸۸۸ء ۔ ۱۰ر اپریل کو دوبارہ حیدرآباد پہونچے اور حضور نظام کے دربار میں باریاب ہوئے۔

۱۸۹۱ء ۔ ۱۰ر فروری کو دوبارہ باریابی ہوئی ۲۴ر اکتوبر کو ساڑھے چارسو روپیہ تنخواہ تاریخ ورود سے اجرا ہوئی۔

۱۸۹۲ء ۔ مہتاب داغ (دیوان سوم) شایع ہوا۔

۱۸۹۳ء ۔ دہلی میں داماد نے انتقال کیا۔

۱۸۹۴ء ۔ ۱۰ر اگست کو ساڑھے پانچسو روپیہ تنخواہ میں اضافہ تاریخ ورود سے منظور ہوا اور ایک ہزار روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی خطابات سے سرفراز ہوئے داغ نے متعلقین کو دہلی سے حیدرآباد بلالیا۔

۱۸۹۶ء ۔ بیوی کا انتقال۔

۱۸۹۹ء ۔ حضور نظام کے ساتھ سفر کلکتہ۔

۱۹۰۰ء ۔ جنوری میں بنارس پہونچے امیر مینائی کو حضور میں باریاب کرایا اور واپس حیدرآباد آگئے۔

۱۹۰۲ء ۔ افضل گنج کے مکان سے ترپ بازار کے مکان میں منتقل ہوئے اپنی تنخواہ میں سے سات سو روپیہ بیٹی اور نواسے پر منتقل کرائے اور پھر داغ کو سات سو روپے تنخواہ صرفخاص سے اجرا ہوئی، حجاب کلکتہ سے آئی جلوۂ داغ (سوانح) شایع کی۔

۱۹۰۳ء ۔ دہلی گئے دربار دہلی میں شرکت کی۔

۱۹۰۴ء ۔ حجاب کلکتہ واپس چلی گئی۔

۱۹۰۵ء ۔ ۱۷ر فروری کو انتقال کیا عمر (بحساب سن عیسوی (۷۴) سال بحساب سنہ ہجری (۷۶) سال ہوئی (۸) سال لوہارو میں (۱۸) سال دہلی (قلعۂ معلیٰ میں) (۳۰) سال رامپور میں اور ۱۸ سال حیدرآباد رہے۔

داغ کی شخصیت

(پروفیسر شوکت سبزواری)

تنقید میں ادیب کی شخصیت بڑی چیز ہے، بلکہ تنقید کا مقصد ہی بعض لوگوں کے نزدیک شخصیت کی نقاب کشائی ہے. نقاد کا کام ہے کہ وہ ادیب کے فکر، فن اور ماحول کا صحیح اور گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی شخصیت کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لائے - یہ کام آسان بھی ہے اور دشوار بھی - آسان اس لئے کہ ادیب کی شخصیت اس کے کلام اور تحریرات ہی میں نہیں جھلکتی بلکہ اس کے نقوش اس کے روزانہ اعمال و افعال تک میں صاف اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں - ان میں سے کسی ایک کا سرسری مطالعہ اس کی شخصیت کی تصویر کشی کے لئے کافی ہوتا ہے - دشوار اس لئے کہ فنکار کی شخصیت دکھانے والے یہ آئینے کبھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں اور ایک مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان میں کسی تصویر کو وہ صحیح اور سچّا سمجھے اور کسے غلط قرار دیکر نظر انداز کردے - اس اختلاف کے اسباب ہیں لیکن میری نگاہ میں بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ ادیب کی شخصیت کے عام طور سے دو پہلو ہوتے ہیں - ایک فطری افتاد اور اس کا عام کردار - ادیب بھی ہماری طرح اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے - اس کی ایک فطرت ہوتی ہے - ایک خاص کردار ہوتا ہے جو ایک مخصوص گردوپیش میں تربیت پانے کی وجہ سے بنتا ہے - اس کی یہ فطرت اور اس کا یہ کردار اس کے عام افعال و اعمال میں جھلکتا ہے - ادیب کی زندگی کے واقعات اس کی شخصیت کے اس پہلو کے لئے ایک آئینہ ہوتے ہیں جس میں وہ پوری طرح روشن ہوکر سامنے آتی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو اس آئینہ میں جلوہ فگن نہیں ہوتا - یہ ادیب کے ذہن، فکر، اس کے ادبی نظریوں اور زندگی کے قدروں سے متعلق ہوتا ہے - ادیب اپنی روزانہ زندگی میں وہ ہوتا ہے جو حقیقت میں نہیں ہوتا - اس لئے اس کے گفتار اور کردار میں کبھی کبھی فرق ہوجاتا ہے - یہ اس کی فطری کمزوری ہوتی ہے - لیکن وہ ادیب ہے - روشن ذہن اور فکر رسا کا مالک - اس کے اپنے نظریے ہیں، مقاصد ہیں، اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنے عمل کو دیکھتا اور اچھی طرح جانچ پرکھ کر صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے - ادیب کی شخصیت کا یہ پہلو صرف اس کے کلام میں جھلکتا ہے - اس کی اس شخصیت کے اصلی خط و خال صرف اس آئینہ میں جلوہ گر ہوتے ہیں —— کہنے کو تو یہ ادیب کی شخصیت کے دو پہلو ہیں اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ادیب کی شخصیت میں اس کے یہ دونوں پہلو شامل ہیں ایک نقاد کا کام ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرے - لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ادیب کی شخصیت نام ہے اس کے دوسرے پہلو کا جس کا تعلق اس کی فنکارانہ صلاحیتوں سے ہے - ادیب اس لئے ادیب نہیں کہ وہ کھاتا پیتا، اُٹھتا بیٹھتا اور سوتا جاگتا ہے - بلکہ وہ اس لئے ادیب ہے کہ سوچتا سمجھتا ہے اچھا شعر کہتا ہے، بے مثال نثر لکھتا ہے، بلند نظریوں کا مالک ہے، اخلاقی قدریں اسے عزیز ہیں، وہ کائنات کو ایک خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے - اس کے پاس اچھے بُرے کی پرکھ کے خاص خاص معیار ہیں - یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی بعض کمزوریوں کے باعث خود اپنے مقررہ معیاروں پر پورا نہیں اُترتا - وہ بلند ہونا چاہتا ہے لیکن نہیں ہوسکتا - وہ خلاق ہے - ادب اور فن کا نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مثالی زندگی اور صالح و توانا معاشرے کا - اس کی شخصیت کا اہم عنصر اس کا

تخلیقی کردار ہے - ہمیں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہم ایک ادیب کی شخصیت کے جویا ہیں جو ہنسنے بولنے اور سونے جاگنے والی سے زیادہ حسن، حیات اور اخلاقی قدروں کی خالق ہے -

لیکن ہر ادیب اور شاعر کی شخصیت کے دو پہلو نہیں ہوتے - وہ خاص خاص ادیب ہیں جو دوگونہ شخصیت کے مالک ہیں - اُردو میں اقبال اور غالب اس زمرے میں آتے ہیں - اقبال کی جدا جدا دو شخصیتیں ہیں - ایک گفتاری یا ادبی - یہ ہمیں زیادہ عزیز ہے - دوسرے کرداری یا عملی - اقبال کی پہلی شخصیت جس میں چمک ہے، کشش اور عظمت ہے اس کے کلام میں جھلکتی ہے - دوسری شخصیت کے جلوے ہم اس بڑے شاعر کے ان خطوط میں دیکھتے ہیں جو اسنے مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھے اور جو "شاد و اقبال" کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں - اقبال کو خود اپنی شخصیت کے اس تضاد کا احساس تھا - چنانچہ اس نے ذیل کے شعر میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے :-

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے   گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

قریب قریب یہی کیفیت ہمارے دوسرے بڑے شاعر غالب کی ہے - اس کی شخصیت کے بھی دو پہلو ہیں لیکن غالب کو جس چیز نے غالب بنایا وہ اس کی شخصیت کا نظریاتی پہلو ہے جو اس کے فارسی و اُردو کلام میں جھلکتا ہے - خودداری، عزتِ نفس، پاسِ وضع، غیرت یہ اس کے اصلی جوہر ہیں - دوسرا پہلو ہمیں اس کے مکاتیب میں نظر آتا ہے جو اس کے مربی فرمانروائے رامپور اور اس کے عزیزوں کو لکھے گئے - یہ پہلے سے مختلف ہی نہیں بلکہ اس کی ضد ہیں - پہلی شخصیت غالب کی ہے - رند شاہد بازکی دوسری شخصیت اسداللہ خاں کی ہے - نجم الدولہ نظام جنگ کی -

---

معلوم نہیں آپ اسے اچھا کہیں گے یا بُرا داغ کی شخصیت اس دو رنگی سے پاک ہے - اس کا ایک ہی پہلو ہے جو اس کے کلام میں، خطوط و مکاتیب ہیں، روزانہ اعمال و افعال میں مختصر یہ کہ ہر آئینہ میں صاف جھلکتا اور روشن نظر آتا ہے - میں آسانی کے خیال سے خطوط کے آئینہ میں اس کی جھلک دکھانا چاہتا ہوں - اس طرح بحث کو سمیٹا جا سکے گا اور داغ کی شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں ہو سکیں گے - ویسے داغ کے کلام میں داغ کی جو تصویر آپ دیکھ چکے ہیں اس کے تمام نقوش وہی ہیں جو آج آپ اس کے مکاتیب کے آئینہ میں ملاحظہ فرمائیں گے -

داغ کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یک رنگی ہے - اس کی تعمیر ایک طرح کے خطوط سے ہوئی ہے جو کم و بیش ایک ہی طول کے ہیں اور "گجدار و مریز" کی کیفیت سے خالی ہیں - اس میں مختلف رنگوں کی آمیزش نہیں - داغ کی شخصیت اس لحاظ سے بڑی سادہ اور سلجھی ہوئی شخصیت ہے - داغ کا تعلق جس طبقہ سے تھا وہ ہندوستان کا خوش حال اور فارغ البال طبقہ تھا جس کی زندگی "کھاؤ، پیو اور مزے اُڑاؤ" کی صحیح اور سچی تعبیر تھی - داغ نے جب آنکھ کھولی تو اس طبقے کے اقتدار کا آفتاب گہنا چکا تھا - لیکن اس کے کچھ مٹے ہوئے اور دھندلے آثار باقی تھے - رسی جل گئی تھی پر بل نہ نکلے تھے - داغ کے بچپن اور عنفوانِ شباب کا زمانہ لال قلعہ میں گزرا - شاہزادوں کے ساتھ پل کر بڑے ہوئے اور اس ماحول میں پروان چڑھے جہاں عیش و عشرت اور کامرانی کے سارے سامان فراہم تھے - ان کی تربیت بڑے چاؤ چونچلوں سے ہوئی - داغ کی شخصیت پر ان کے اس ابتدائی زمانہ کا گہرا اثر ہے - یہ زمانہ شعر و شباب اور چنگ و رباب کے لئے سازگار تھا - "شمشیر و سناں" کا زمانہ گزر چکا تھا اور ان کی جگہ طاؤس و رباب اور نقل و کباب لے چکے تھے - یوں تو سارے جاگیردار طبقہ کا حال یہی تھا لیکن یہ فضا قلعۂ معلی پر پورے شباب کے ساتھ چھائی ہوئی تھی - شمع بجھتی ہے تو ایک دم بھڑک اُٹھتی ہے - دہلی کے لال قلعہ کی بساط اُلٹنے کو تھی اس لئے اس کی رنگینیاں انتہا کو پہونچ گئیں - رامش و رنگ اور کیف و آہنگ کی لو بڑھ گئی - داغ کو

رنگیں مزاجی اور شوخ طبعی ورثہ میں ملی تھی۔ یہ رنگینی اور شوخی قلعۂ معلی کی اس شوخ و شنگ فضا کی پیداوار سمجھئے۔ داغ کے مزاج کی یکسانی و یک رنگی کے باعث میں نے ان کی شخصیت کو سادہ بتایا تھا ورنہ داغ کی شخصیت میں رنگینی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

داغ خوش باش انسان تھے۔ حسن و جمال کے پرستار ہی نہیں بلکہ طلب گار بھی۔ یوں تو غالب بھی زندگی کو برتنا جانتے تھے لیکن غالب کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع تھا۔ وہ زندگی کو بہت سے زاویوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن داغ وسعتِ نظر کے مالک نہ تھے۔ ان کے نزدیک زندگی خوش باشی سے آگے کچھ نہیں۔ وہ زندگی کو زندہ دلی سمجھتے تھے۔ وہ صحیح معنی میں زندہ دل جئے۔ ان کی ساری شاعری زندہ دلی کی تفسیر ہے۔ ان کا کہنا ہے ؂

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے،
جان بھی نکلے تو میری جان ہنستے بولتے

داغ نے ہنستے بولتے زندگی گزار دی۔ انھیں ہر اچھی چیز پیاری تھی۔ خوش پوشی، خوش خوراکی، خوش مزاجی داغ کی زندگی تھی۔ نفاست، صفائی اور حسن ادا داغ کا فن تھا۔ داغ کی زندگی ان کے فن میں جھلکتی ہے اور ان کا فن ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔

داغ اچھا اور قیمتی کپڑا پہنتے تھے جو بہترین سلا ہوتا تھا اور اس میں صفائی اور نفاست کا خیال رکھتے تھے۔ مولانا احسن مارہروی کا بیان ہے کہ وہ روزانہ سہ پہر کو نیا جوڑا بدلتے تھے۔ تنگ مہری کا پاجامہ اور سفید کرتا معمولی لباس تھا۔ جب باہر جاتے جامہ دار کی شیروانی اور حیدرآبادی دستار یا بے پھندنے کی ترکی ٹوپی پہن لیتے۔ خوش مزاجی ان کی فطرت بن گئی تھی۔ بچوں کی طرح چہلیں کرتے۔ ان کے کلام میں جو ایک طرح کا چلبلاپن ہے وہ ان کی خوش طبعی کی ہی ایک لہر ہے داغ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پیری کے آثار کبھی نمایاں نہ ہونے پائے۔ عہد پیری کے کلام میں بھی بقول اقبال جوانی کی آگ بھری ہوئی ہے۔ داغ کا کلام پوری طرح ان کی زندگی، شخصیت، اور کردار کا پرتو ہے۔ جس طرح داغ کبھی بوڑھے نہیں ہوئے ان کا کلام بھی بوڑھا نہیں ہوا۔ اس پر جوانی کا اُبھار اور نکھار آخر وقت تک برقرار رہا۔

وقتِ آخر ہوا مگر اے داغ
ہوسِ زندگی نہیں جاتی

ان کی خوش مزاجی کی مثالیں بہت ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔ نواب بہادر حسین خاں انجم لکھنوی کو لکھتے ہیں :-

"داغ کو جلاکر خاک میں ملاکر آپ لکھنؤ چلے گئے خیر صبر و شکر۔۔۔۔ اے شخص اللہ رے تیرا دماغ! چلتے وقت ملنا اور اس تمکنت اس استغنا کے ساتھ رحم نہ آیا، ترس نہ کھایا کہ ایک کشتۂ تیغ فراق تڑپ رہا ہے اس کی دلجوئی کیجئے۔ یا اس کی تلافی یہ ہوئی کہ لو ہم جاتے ہیں۔ اچھا جاؤ! غارت ہو! دہرا صبر کرلیں گے۔"

ایک دوسرے خط میں انھی کو لکھا ہے :-

"کئی روز سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ ملاقات سے کیوں کنیاتے ہیں۔ میں رقیب نہیں ہوں۔"

منی جان طوائف کے نام ایک خط ہے جو پورا کا پورا شوخ طبعی اور ظرافت کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس میں ذیل کا پارہ خاص طور سے پرلطف ہے۔

"کیوں جی! تم سے کیونکر ملیں، تم کو کیونکر دیکھیں، کیونکر سنیں، اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں۔۔۔۔ تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی آؤ۔ ہائے مجبوری! وائے مجبوری!"

منی جان حجاب سے داغ کے دیرینہ تعلقات تھے۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں وہ حیدرآباد آئی مگر اس شان کے ساتھ

کہ جب تک نکاح نہ ہو جائے سامنے نہ آؤں گی، پردہ کروں گی۔ اس کا ذکر داغ نے ایک خط میں کیا ہے جو قاضی عبدالحمید کلکتہ کے نام ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے شوخی ٹپکتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"بی فرشتن صاحبہ مع بابو خدا بخش کے پہونچیں۔ میرا مکان بھی آسمان ہے کہ فرشتوں کا نزول ہے۔ میں رند خراباتی وہ زاہد مناجاتی۔ دیکھئے کیا ہو۔ ابھی تک مجھ کو اس پردے میں معلوم نہیں ہوا کہ وہی ہیں یا اور کوئی"

سید وحیدالدین بیخود دہلوی داغ کے شاگردانِ خاص میں سے ہیں۔ انھوں نے دیوان طلب کیا ہے۔ داغ نظام کے ساتھ شکار گاہ میں ہیں۔ وہاں سے لکھتے ہیں :۔

"دیوان کیا اس جنگل سے تھوڑی سی وحشت کہو تو بھیج دوں"

یہ شوخی، بے حجابی، بے تکلفی اور خوش مزاجی ان کے رقت قلب کی پیداوار ہے۔ داغ فطرت سے ایک درد بھرا دل لیکر آئے تھے اور اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو عیش کوشی اور لذت اندوزی کو زندگی کی عزیز ترین متاع سمجھتا ہو اس کے دل میں دوسروں کے لئے درد اور خلوص بھی ہو لیکن داغ کے مزاج میں یہ دونوں عنصر موجود تھے۔ وہ عیش کوش بھی تھے اور دردمند بھی۔ اپنے دکھ درد کو ہنس کر اڑا دیتے لیکن دوسرے کو دکھی دیکھ کر ان کا دل بھر آتا اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ وہ اپنے عزیزوں پر جان دیتے تھے۔ شاگردوں کے فدائی تھے۔ انھوں نے اپنے عزیزوں اور عام احباب و تلامذہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں ہمدردی اور دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کی خلوص و محبت سے خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اور بات بات پر دل جوئی کرتے اور دلاسا دیتے ہیں۔ اپنی چھوٹی بہن عزیز بیگم کو خط لکھا ہے۔ کوئی مقدمہ ان کے خلاف ہو گیا ہے۔ انھیں ان الفاظ میں دلاسا دیتے ہیں :۔ "تم کو ہماری جان کی قسم جو تم ذرا بھی فکر کرو۔ اگر تم ذرا سا بھی فکر کرو گی تو ہم کو بہت رنج ہوگا"

اولیا بیگم ایک اور بہن ہیں۔ ان کو خط لکھا ہے :۔

"تمھاری منھ کی بیماری کا کیا حال ہے ؟ تم نے خط میں نہیں لکھا۔ تم لوگ اپنی والدہ کی قبر پر بھی جاتی ہو ؟ ضرور وہاں جاؤ اور قبروں کا حال لکھو"

اس خط کے آخر میں عزیز بیگم کو خطاب کیا ہے :۔

"تمھاری بہو کہاں ہے ؟ کیا حال ہے ؟ غلام قدوس کیسے ہیں ؟ ہم تو ان کی خدمت کئے جاتے ہیں مگر وہ کبھی نہیں پوچھتے"

نوح ناروی ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ وہ حیدر آباد میں داغ کے ہاں مقیم ہیں۔ داغ ان پر مہربان ہیں اور انھیں کیا کچھ کھلانا چاہتے ہیں۔ اور جب وہ ان کی خواہش اور توقع کے خلاف نہیں کھاتے تو ان کے صاحبزادے ابوالحسن کو لکھتے ہیں :۔

"تمھارے والد ماجد کے یہاں آنے سے مجھے ایسی خوشی ہوئی جیسے اپنے بچھڑے ہوئے فرزند کے ملنے سے ہوتی ہے۔ مگر ایک بات سے سخت حیرت ہے کہ وہ اپنی اشتہا وہاں فروخت کر آئے ہیں یا گرو رکھ آئے ہیں یا خیرات۔ میں نے جو امتحان لیا تو مینا سے بھی کم وہ کھاتے ہیں۔ نہیں معلوم میرے گھر کا کھانا انھیں پسند نہیں آتا یا بھوک ہی گھٹ گئی ہے یا نارے والے سب اتنا ہی کھاتے ہیں۔ اگر کہتا ہوں کہ کچھ فرمائش کرو تو وہ نہیں سنتے۔ تم صاف صاف لکھو کہ وہاں ان کو کون سا کھانا پسند تھا۔ کونسی چیز مرغوب تھی۔ کہ یہاں بھی وہی پکوایا جائے۔ نمکین کون سا کھانا پسند ہے اور شیریں کون سا"

محمود رامپوری بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کو اپنے پاس بلاتے ہیں :۔

"اگر تم کو فرصت ہو اور جی بھی چاہے تو میں بیس روپے کرایہ ریل کے بھجوا دوں۔ تم مجھ سے آکر ملو"

ان کی پرخواری اور خوش خوراکی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مولانا احسن فرماتے ہیں کہ ان کے مطبخ میں مختلف قسم کے کھانے تیار ہوتے تھے۔ پلاؤ، مرغ کباب اور چٹپٹی چیزیں بہت مرغوب تھیں۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ کبھی تنہا نہیں کھاتے تھے۔ چند

شاگرد اور حاشیہ نشین احباب ضرور شریک ہوتے - میر حسن علی خاں ان کے ایک حاضر باش شاگرد ہیں - ایک مرتبہ کسی وجہ سے دو روز تک نہیں آئے - ان کو دستی رقعہ لکھا :-

"آپ کو حسب معمول روز آنا چاہئے اور ماحضر یہیں تناول فرمانا چاہئے اور اگر کھانا گوارا نہیں ہے تو بہتر ہے نہ کھائیے - مجھ کو غم بھی نہ کھلائیے آئیے آئیے ! تشریف لائیے !"

بھوگ کے بہت کچے تھے - جب کھانے میں دیر ہو جاتی تو ان کے مزاج میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی تھی - میر حسن علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے :-

"جس دن آؤں سبحان خاں بریانی ضرور پکائیں"

نوح ناروی کے صاحبزادے کے نام جو خط ہے اس کے آخر میں ہے :-

"میں نارے میں زیادہ اس واسطے نہیں ٹھہرنے کا کہ میرا کھانا دیکھ کر وہاں کے لوگ مجھے کھا جائیں گے"

اس پرخواری ہی کا اثر تھا کہ وہ اکثر بیمار رہتے تھے - درد نقرس کی تو دیرینہ اور کہنہ شکایت تھی ہی ضعف معدہ بھی بہت بڑھ گیا تھا - گاہے گاہے تخمہ یا بدہضمی کا شکار بھی ہوئے - اکثر خطوط میں انھوں نے اپنی بیماری کی شکایت کی ہے اور اس کے ہاتھوں انھیں جو تکالیف اٹھانی پڑی ہیں ان کا رونا رویا ہے - کنور اعتماد علی خاں رئیس سعد آباد کو لکھتے ہیں :-

"نواب صاحب ! میں نے درد نقرس کی نہایت تکلیف اٹھائی - ابھی صحت نہیں ہوئی مگر تکلیف ہے"

اس کے بعد کے خط میں ہے :-

"ایک مہینہ تک درد نقرس کا پابند رہا"

انہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

"شکر ہے بخیریت ہوں ، ضعف معدہ کی شکایت ہے"

داغ کی شخصیت اور ان کی شاعری کے متعلق عام اہل ذوق میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں - ان کو عام طور سے عیاش بتایا جاتا ہے - عیاش کے معنی اگر عیش پسند اور کامرانی دوست کے ہیں تو داغ ضرور عیاش تھے - اور اگر وہ اپنے عام عرفی معنی یعنی مے خوار اور دین و دیانت سے بیزار انسان کے معنی میں ہے تو داغ ہرگز عیاش نہ تھے - اس کے شاہد مولانا احسن ہیں کہ داغ نے کبھی دختِ رز کو منہ نہیں لگایا - وہ ان کے بقول اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں مولوی عبدالحق خیرآبادی اور مفتی امیر احمد امیر مینائی کا مرہون منت ہوں کہ ان دوستوں کی بدولت اس بلا میں مبتلا ہونے نہیں پایا - وہ خود کہتے ہیں اور بالکل سچ کہتے ہیں :-

گو ہے عاشق مزاج و شاہد باز داغ لیکن شراب خوار نہیں

ان کے خطوط کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی تھے - یہ اور بات ہے کہ ان کی یہ پابندی اس درجہ کی نہ تھی جو طہارت پیشہ اور زہد شعار لوگوں کے نزدیک تقویٰ کا معیار سمجھی جاتی ہے - کم سے کم ان کے دو خطوں میں روزے کا ذکر ہے - صاحبزادہ شرف یار خاں کو لکھتے ہیں :-

"داغ نواز ! تمہارے علاقے میں رمضان نہیں آیا - بھاگ کر چلا آیا - روزہ رکھتا ہوں - انتخاب کی طاقت کہاں"

ایک خط مولانا احسن کے نام ہے - اس میں بے اصلاح غزلیں واپس کرنے پر عذر پیش کرتے ہیں -

"مجھ کو بسبب صوم فرصت نہیں"

داغ کی شخصیت بڑی تاثراتی شخصیت ہے - وہ فطرتاً شاعر تھے اور شاعر بھی غزل کے جو اردو کی خالص جذباتی شاعری ہو

اس لئے ان کی شخصیت کی تعمیر میں جذبات کو بڑا دخل ہے۔ داغ کے جذبات میں وہ طہارت تو نہیں جو میر اور حسرت کے یہاں ہے اور نہ وہ عظمت اور رفعت ہی ہے جو غالب کے یہاں ہے لیکن اس میں بلا کی گرمی ہے، سوز ہے اور دل میں اُتر جانے والی نشتری کیفیت ہے۔ داغ نے بڑی لاابالی اور چونچال طبیعت پائی تھی۔ ان کی نظر بے باک تھی۔ افلاطونی محبت کے وہ قایل نہ تھے۔ حسن ان کے لئے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ غالب کی طرح "تماشائے گلشن" اور "تمنائے چیدن" ان کی نگاہ میں گناہ نہ تھا اور یہ سب کچھ ان کے افتادِ طبع کی وجہ سے تھا۔ جو انسان کو فرشتہ دیکھنا چاہتے ہیں وہ داغ کی قدر نہیں کر سکتے۔ داغ کی سیرت میں فرشتہ اور شیطان کی کشاکش نہیں۔ وہ ہر رنگ میں انسان تھے۔ داغ کی شخصیت بھرپور انسانی شخصیت ہے۔ فطرت کی کمزوری داغ کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے اور یہی جوہر داغ کی شخصیت میں صرف ہوا ہے۔ وہ انسان ہیں اس لئے انسان کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کی فطرت بچّہ کی طرح ہے جو ہر اچھے کھلونے کو دیکھ کر مچل جاتا ہے اور پھر اس کا بہلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

خود انھوں نے اپنی نظر بازی کا ذکر اس شعر میں کیا ہے۔

بُت ہی پتّھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں،

داغ صحیح معنی میں حسن پرست تھے۔ اب چاہے اسے رندی کہئے یا ہوسناکی یہ واقعہ ہے کہ وہ حسین صورت دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے۔ دل پر کس کا اختیار ہے لیکن داغ خصوصیت کے ساتھ دل کے ہاتھوں ناچار تھے۔ مہ طلعتوں کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں بلا کی درا کی آجاتی تھی۔ بیخود دہلوی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر فرمانے لگے۔ "تو تو جانتا ہے حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں۔"

داغ کو اپنے وطن دہلی سے بڑا پیار تھا۔ دکن میں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ لوگ ان کی روز افزوں ترقی دیکھ کر ان سے جلنے لگے تھے لیکن خود ان کا یہ حال تھا کہ ماہیِ بے آب کی طرح وطن کے لئے بے تاب رہتے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"سب کچھ خدا نے دیا ہے۔ کسی پردیسی کی ایسی عزت اس دربار میں نہیں روٹی بھی پچاس کو کھلا کر کھاتا ہوں مگر ہائے ہندوستان تیرا ارمان۔"

داغ تمام عمر محسود رہے لیکن حسد سے دور رہے۔ یہ ان کی سیرت کا حسین پہلو ہے کہ وہ اپنے اقران و اماثل کے فضل کمال کے لوگ معترف تھے۔ لوگ حسد سے انھیں مطاعن کا نشانہ بناتے تھے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے:-

"مجھ پر زمانہ چھری تیز کئے ہوئے ہے۔ خدا دارم چہ غم دارم۔

عشق میں گمنام کیا بدنام ہو میری شہرت نے مجھے رسوا کیا

خدا محسود رکھے۔ آمین۔"

لیکن وہ سب کے سامنے دوسروں کی تعریفیں کرتے تھے۔ امیر مینائی کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"اصل میں یہ زمین منشی امیر احمد صاحب کی نکالی ہوئی ہے۔ ۹ شعر ان کے دوسرے دیوان میں ہیں۔ بہت خوب غزل ہے استاد ہیں۔"

داغ بڑے نازک مزاج تھے۔ بقولِ غالب ان کا عقیدہ تھا۔

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے

اس لئے بے وجہ عتاب ان کو گوارا نہ تھا۔ وہ ان کے بے محل ناز اور نکتوڑے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حجاب سے خاص

لگاؤ تھا لیکن ان کی اور اس کی طبیعت میں مناسبت نہ تھی اس لئے ان بن رہتی تھی۔ ایک خط میں داغ نے اپنی نازک مزاجی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"داغ کے مزاج میں بے وجہ عتاب کی تاب نہیں"۔

عقیدے کے لحاظ سے پکے اور کٹر سُنی تھے۔ اس سلسلہ کا ایک لطیفہ مولانا احسن نے بیان کیا ہے کہ فروری ۱۹۰۲ء تھی کہ مرزا صاحب کے نام ایک کپڑے کی تھیلی میں دو کتابیں پہونچیں۔ ایک کا نام 'جلوۂ خورشید' تھا۔ دوسری کا 'زعفران زار رضا'، دونوں کتابیں نظم میں تھیں۔ بھیجنے والے کا نام محمد رضا خاں تھا۔ اوپر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ "یہ کتاب خاص مذہب اثنا عشری کی ہے۔ اہلِ سنت ملاحظہ نہ فرمائیں"۔ مرزا صاحب ان کتابوں کو دیکھ کر بہت گھبرائے مجھے مکان سے بلوایا اور فرمایا۔ بھائی فوراً ان کتابوں کو واپس کرو اور اسی وقت یہ خط لکھوایا:۔

"جناب شیعہ صاحب! آپ کا کلام میرے پاس پہونچا۔ آپ کی یاد آوری کا ممنون ہوا۔ مگر میں اہلِ سنت والجماعۃ سے حنفی المذہب ہوں۔ آپ کی ہدایت کے بموجب آپ کی کتابوں کو نہ دیکھ سکا"۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ داغ کی طبیعت میں نفاست اور صفائی زیادہ تھی۔ ان کے کلام میں جو رکھ رکھاؤ اور زبان و محاورہ کا چٹخارہ ہے وہ ان کی طبعی نفاست اور صفائی کا مرہونِ منت ہے۔ داغ کی شاعری زبان اور محاورے کی شاعری ہے۔ خود داغ کی زندگی میں ان پر اعتراض ہوا کہ داغ مضمون کہنا نہیں جانتے۔ جلیل مضمون کہنا جانتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ داغ نے جو زبان استعمال کی وہ دہلی کی شستہ رفتہ اور کوثر میں دُھلی ہوئی زبان ہے۔ داغ زبان کی صحت اور صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شاگردوں کو عام ہدایت تھی کہ کوئی لفظ غلط اور کوئی محاورہ خلاف استعمال اہلِ زبان نہ بندھے۔ صاحبزادہ مشرف یار خاں کو لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو دیوان دیکھنے کی فرصت کہاں، جو میرے مسلک کے خلاف ہو اس کو خود نکال ڈالو۔ البتہ ایک کھٹکا ہے کہ کوئی محاورہ خلاف نہ بندھا ہو"۔

محاورے کی کسی شعر میں بندش سے وہ بہت خوش ہوتے لیکن محاورے کو وہ شعر کی جان نہیں سمجھتے تھے۔ زبان کی ترقی اور بقا ان کے پیشِ نظر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ محاورات شعر میں نظم کر کے محفوظ کر دئے جائیں۔ ناطق گلاؤٹھی کو انھوں نے جو خط لکھا ہے اس میں یہ نکتہ بیان کیا ہے:۔

"یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ۔ مگر اس کا لحاظ رکھئے کہ شعر کے لئے محاورہ آجائے۔ محاورے کے لئے شعر میں سقم نہ آنے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجئے ورنہ نہیں۔ اور اس کے لئے حضرت استاد مرحوم کے کلام پر غور کیجئے کہ انھوں نے کس بے ساختگی سے محاورات کو باندھا ہے"۔

زبان اور محاورے کی بات آگئی تو یہ بھی عرض کر دوں کہ داغ زبان کے رسیا سہی لیکن شعر کے باب میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ اچھا شعر وہ ہے جو گھُلا ملا اور پر اثر ہو چنانچہ انھوں نے لاڈلے صاحب واقف کو لکھا تھا:۔

"تمہاری طبیعت زبردست مضمون آور ہے مگر گھلے ملے شعر پر اثر کم کہتے ہو"

داغ کے کلام کی خصوصیات یوں تو بہت ہیں لیکن ان کا اپنا رنگ، جس میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے شعر کا یہی وصف ہے جسکو حضرت داغ نے گھُلے ملے اور پر اثر ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ گھُلا ملا کلام وہ ہوتا ہے جس میں زبان، اسلوب، اور مضمون میں پوری

ہم آہنگی اور لطیف تناسب پایا جائے۔ داغ کے کلام میں یہ ہم آہنگی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ داغ نے عام طور سے عوام کے جذبات بیان کئے ہیں اور ان کے لئے جو زبان اور طرزِ بیان اختیار کیا ہے وہ بھی عوامی ہے۔ اکثر اہلِ علم سستے بازاری جذبات اور عوام کے جذبات میں فرق نہیں کرتے اسی طرح ان کے نزدیک عامیانہ زبان اور عوام کی زبان ایک چیز ہے۔ اس لئے داغ پر جو لے دے ہوئی ہے اور امیر کے ساتھ ان کی شاعری کو بھی پست کہکر بدنام کیا گیا ہے اس میں اس غلط فہمی کو بھی دخل ہے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج کے اچھے اور بلند نظر نقاد تک اس میں مبتلا ہیں۔

میر و نظیر کے بعد اُردو میں داغ عوامی شاعر ہیں۔ اگرچہ وہ میر و نظیر دونوں سے مختلف ہیں۔ میر کا اسلوب بڑا ہی گھلا ملا اور لوچدار ہے۔ اس میں اثر اور خلوص بھی ہے لیکن وہ شوخ، البیلی اور دل لبھانے والی کیفیت نہیں جو داغ کے کلام کی امتیازی شان ہے۔ نظیر نظم نگار ہیں۔ غزل گو کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مقام نہیں۔ داغ اُردو کے تنہا غزل گو شاعر ہے جس نے معاملاتِ محبت بڑے صاف اور دا شگاف انداز میں بیان کئے۔ ویسے تو جرأت اور مومن بھی اسی کوچے کے ہیں لیکن داغ کی سی گھلاوٹ اور لگاوٹ، داغ کی سی بے تکلفی اور انوٹ یا دل کو مسوس کر رہ جانے والی کیفیت ان کے یہاں کہاں۔

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ میں یہ کہ رہا تھا کہ داغ نے دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کی جس میں لاکھوں بناؤ کے باوجود ایک طرح کا الھڑپن ہے داغ دہلی کے تھے۔ دہلی کی زبان پر مٹے ہوئے تھے۔ خود اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ وہ دہلی کے خاص خاص الفاظ اور محاورے نظم کر کے ان کو حیاتِ جاوید بخشدیں اور شاگردوں کو بھی ہدایت تھی کہ وہ دہلی کی زبان لکھیں اس زمانہ میں گلدستہ زبانِ دہلی کے نام سے راسخ نے ایک مجموعہ شائع کرنا شروع کیا تھا جس میں دہلوی شعراء کا کلام چھپتا تھا۔ اس کے بقا کا حضرت داغ کو بہت خیال تھا۔ چنانچہ بیخود دہلوی کو یکے بعد دیگرے دو خط لکھے ہیں اور دونوں میں ان کو تاکید کی ہے کہ وہ اس گلدستہ میں اپنا کلام شایع کرائیں۔ فرماتے ہیں:-

”گلدستہ زبانِ اُردو جو راسخ نے نکالا ہے اس کو رونقِ کلام سے دو کہ زبانِ دہلی ختم ہوئی جاتی ہے“

اور شاید اسی جذبہ کے تحت وہ دہلی کے الفاظ و محاورات کا ایک لغت طیار کرانا چاہتے تھے۔ مولانا احسن اس خدمت پر مامور تھے۔ وہ الفاظ و محاورات کا ایک لغت تیار کرانا چاہتے تھے۔ مولانا احسن اس خدمت پر مامور تھے۔ وہ الفاظ اور محاورے جمع کرتے تھے اور داغ سند کے شعر کہتے تھے۔ مولانا احسن جب تک دکن میں مقیم رہے یہ کام بحسن و خوبی انجام پاتا رہا۔ لغت کے کچھ اجزا ”فصیح اللغات“ کے نام سے شایع بھی ہوئے، لیکن مولانا احسن کے حیدرآباد سے چلے آنے کے بعد یہ کام جاری نہ رہ سکا۔ مولانا احسن کا بیان ہے کہ استاد کو آخر عمر تک اس کا افسوس رہا۔

داغ کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا اور اگرچہ وہ بڑے عالم نہ تھے لیکن زبان کی پرکھ کا فطری مذاق رکھتے تھے۔ زبان کے مسئلے اور ادبی لطیفے اور نکتے جو ان کے مختصر سے مجموعۂ خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں ان سے ان کے اس ذوق کا پتا چلتا ہے اس نوع کے اشعار انھوں نے بہت کہے ہیں جن میں زباندانی پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً:-

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

چند ادبی نکتے اس موقع پر بیان کر دئے جائیں تو شاید بے جا نہ ہو۔ مولانا احسن کے خط میں اپنے بعض شاگردوں کی شکایت کی ہے کہ وہ بے اصلاح غزلیں چھپوا دیتے ہیں اور ان میں زبان کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔

”کسی شخص نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا حالانکہ اہلِ دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔ کسی صاحب نے لفظ میت جو بکسرِ یائے تحتانی ہے اس کو بفتح یا باندھا۔ تُو کے قافیہ میں آبرو کو مونث باندھا۔ وہ بھی مذکر ہے۔“

یہ عجیب بات ہے کہ داغ ایجاد کو مذکر بتاتے ہیں حالانکہ امیر مینائی نے اپنے ایک خط میں (مکاتیب امیر صفحہ ۱۴۲) لکھا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں مونث ہے۔ مولانا احسن نے استفسار کیا تھا کہ طرز مونث ہے یا مذکر۔ ٹوپی اوڑھنا صحیح ہے یا ٹوپی پہننا طرز کے بارے میں لکھا مونث ہے۔ ہرگز مذکر نہیں۔ اور اوڑھنے کو قلم زد کر دیا اور پہننے کو بحال رکھا۔ اس سے داغ کی سیرت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ داغ بڑی مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے جس کا خمیر رواداری اور لحاظ سے ہوا تھا۔ مولانا طباطبائی کہتے ہیں کہ میں نے ورے اور پرے کے باب میں داغ سے تحقیق چاہی تو انھوں نے کہا آپ لوگوں کی خاطر سے میں نے ان لفظوں کو ترک کر دیا ہے۔ ٹوپی اوڑھنا دہلی میں آج بھی بولا جاتا ہے اور اس سے پہلے بھی بولا جاتا تھا لیکن لکھنؤ والوں کو ٹوپی پہننے پر اصرار تھا۔ داغ کا اس کو قلم زد کر دینا بھی اہلِ لکھنؤ کی خاطر داری کے لئے تھا۔ میت بفتح یا اُردو میں عام ہے۔ دہلی والے اسی طرح بولتے ہیں۔ انشا اور حالی نے بھی اس کو صحیح بتایا ہے لیکن اہلِ لکھنؤ بکسر یا بولتے اور باندھتے تھے۔ اس میں بھی داغ نے رواداری برتی۔

داغ کا ایک مصرعہ ہے:۔ "میں نے وہ رنج اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے" مولانا احسن نے یہ مصرعہ طرح کر دیا۔ اس پر انھیں تنبیہ فرمائی اور لکھا کہ مصرعِ طرح کرنا تم کو نہیں آتا۔ اس میں "جانتا" کا الف دبتا ہے جو مخل فصاحت ہے۔ ایک خط میں شتر گربہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ دوسرا شعر درست ہے۔ حضرت کا لفظ تم کے ساتھ بھی آتا ہے۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔

مولانا ابو الحسن ناطق گلاوٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے "جوبن" کی تحقیق چاہی تھی۔ اس کا جواب دیتے ہیں۔ "لفظ جوبن کے متعلق میں پھر یہی کہتا ہوں کہ اس کا استعمال بمعنی پستان اہلِ لکھنؤ کا اختراع ہے۔ دہلی والے اس معنی میں نہیں بولتے۔ آپ نے جو مولانا راسخ کا شعر پیش کر دیا ہے اُسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کس دُھن میں لکھ گئے۔ مولوی صاحب آپ کے دوست ہیں۔ انہی سے پوچھئے کہ آپ نے دہلی میں اس لفظ کا ایسا استعمال کہاں سنا ہے۔ آخر آپ خود بھی تو نواحِ دہلی کے باشندے ہیں اور میرے نزدیک بڑی حد تک آپ کے قصبات کی زبان مستند ہے۔ غور کیجئے کہ کیا وہاں کے شرفاء یا عوام میں اس لفظ کا یوں استعمال ہے، دہلی کے استعمال میں بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح

عجب جوبن برستا ہے کسی پہ جب وہ لڑتے ہیں ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں،

اس میں زبان کے جو نکات اور اس کے مستند ہونے کا جو معیار داغ نے بتایا ہے وہ اصول لسانیات پر کس قدر صحیح ہے اسکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔

آخر میں داغ کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی وضاحت ضروری ہے۔ جو ان کے کلام اور خطوط میں جھلکتا ہے اور داغ کی عام مقبولیت میں بھی اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ آمد اور آورد پر اہلِ علم نے بڑی نازک بحثیں کی ہیں اور نکتے نکالے ہیں۔ لیکن اس پر بھی انکا صحیح مفہوم آئینہ نہیں ہوا۔ آمد اصل میں بے ساختہ پن ہے اور بے ساختہ پن کے معنی ہیں تکلف، تصنع اور بناوٹ سے کلام کا پاک ہونا۔ فطری سادگی بھی یہی ہے۔ اور اسے آمد اس لئے کہتے ہیں کہ جو لوگ صحیح معنی میں ادیب یا فن کار ہیں۔ یعنی فن اور ادب کا فطری ذوق رکھتے ہیں ان کی طبیعت کو ادب سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔ وہ جب فکر سخن کرتے ہیں تو جو کچھ فی البدیہہ بلا کاوش اور مشقت کے انکے ذہن میں آتا ہے وہ بڑا ہی گھلا ڈھلا ہوتا ہے۔ اس میں تازگی ہوتی ہے، توانائی ہوتی ہے، اثر اور جادو ہوتا ہے ------

------------- فن کار کے ذہن میں جو کچھ نازل ہوتا ہو اسمیں ایک الہامی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کو بنانے سنوارنے اور نوک پلک سے درست کرنے کی فن کار کو ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ عالمِ بالا سے خود ڈھل کر آتا ہے۔ یہ کیفیت داغ کے کلام کی ہے۔ وہ بڑا ہی گھلا ڈھلا ہے۔ اس میں سادگی ہے، نکھار ہے، شادابی ہے، صناعی

اور پرکاری سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں - اس کی نزاکت اور لطافت کسی تراش خراش کی متحمل نہیں - یہ ریشم کے تار ہیں - بلبلے ہیں چھوا نہیں کہ ٹوٹے - داغ نے ایک خط میں اپنے فکر سخن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"یہاں جو کچھ میں بکتا ہوں وہ فی البدیہہ ہوتا ہے - یہ دو دو گھنٹے کی فکر ہے جو ملفوف بھیجتا ہوں - حضوری فرمائشات ایسی ہی ہوتی ہیں - زبان کا لطف ہے اور فی الفور اس کی تعمیل کی جاتی ہے"

ان کے خطوط فی البدیہہ لکھے جاتے تھے - مولانا احسن کا کہنا ہے کہ جس طرح شعر کہنے میں وہ زیادہ تامل نہیں کرتے تھے اور عام شعراء کی طرح خط لکھنے یا لکھوانے میں بھی غور و فکر کے عادی نہ تھے - سوچ سوچ کر ایک جملہ نہیں بولتے تھے بلکہ بے تکلف اور بے ساختہ لکھواتے چلے جاتے تھے - یہ بھی نہیں دیکھا گیا کہ بعض لوگوں کی طرح پہلے کوئی فقرہ غلط لکھوا دیا یا جلدی میں بول دیا اور پھر اس کو قلم زد کر دیا گیا - بلکہ وہ جو کچھ بولتے اور لکھواتے وہ سوچ سمجھ کر بولتے اور لکھواتے تھے جس میں پھر رد و بدل کی گنجایش نہیں ہوتی تھی اس مفہوم کو انھوں نے غزل کے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے :-

سمجھو پتھر کی تم لکیر اسے ، جو ہماری زبان سے نکلا

داغ کی شخصیت میں نظم و ضبط ہے ، پختگی اور سنگینی ہے ، اور یہ بھی شاید اس یک رنگی کا اثر ہے جس کا ذکر میں ابتدائی سطروں میں کر چکا ہوں - وہ بڑے بے جھجک واقع ہوئے تھے - ان میں ذرا جھجک نہ تھی - ان کے دل میں چور نہ تھا - وہ زندگی کو مختلف خانوں میں بانٹنے کے روادار نہ تھے - ان کی خلوت میں بھی جلوت کی شان پائی جاتی تھی - زاہد ریاکار کی طرح "چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" ان کا شعار نہ تھا - جسے لوگ عریانی بتاتے ہیں وہ ان کے نزدیک عریانی نہیں اس لئے کہ وہ لاگ لپیٹ کے قایل نہ تھے - جو ان کے دل میں ہوتا وہی ان کی زبان پر بے تکلف آجاتا - لوگ خلوت میں جو زبان پر لانے سے ڈرتے تھے داغ جلوت میں کہ ڈالتے تھے - اب آپ کو اختیار ہے اسے عریانی کہئے یا فحاشی داغ اسے شاعرانہ کمال سمجھتے ہیں - اقبال بھی اسے کمالِ فن سمجھا کئے -

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے ، یعنی یہ لیلیٰ یہاں بے پردہ واں محمل میں ہے

میں اسے داغ کی بے جھجک شخصیت کی ایک جھلک کہتا ہوں -

تری طبیعتِ روشن اک آفتاب ہے داغ
کبھی چھپائے سے یہ جلوہ گر نہیں چھپتی

"من و یزداں" کا دوسرا اڈیشن

زیر طبع ہے

مارچ میں شایع ہو جائے گا - قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

منیجر نگار

داغ کے بعض مشہور تلامذہ

(پروفیسر نفیس سندیلوی)

احسن مارہروی - (۱۸۷۶ - ۱۹۴۰ء)

سید شاہ علی احسن اسمِ گرامی۔ شاہ میاں صاحب عرفیت اور احسن تخلص تھا۔ وطن قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ تھا۔
مولانا ۱۸۷۶ء میں بمقام مارہرہ پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں فصیح الملک کی شاگردی اختیار کی اور کچھ عرصے حیدر آباد میں انکی خدمت میں حاضر رہکر "فصیح اللغات" کی ترتیب میں مصروف رہے آپ ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں اُردو لکچرر ہوگئے پھر ۱۹۲۳ء میں مسلم یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ دو رسالے "ریاضِ خلیل" مارہرہ سے اور "فصیح الملک" ۱۹۰۵ء میں لاہور سے نکالے۔ مشاعروں کا شوق ہمیشہ رہا۔ مولانا موصوف نے ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو بمقام پٹنہ بمرض سرطان انتقال فرمایا۔
تصانیف میں جلوۂ داغ یعنی حیاتِ داغ - ۲- انشائے داغ یعنی مکتوبات داغ - ۳- تاریخ نثر اُردو - ۴ کلیات ولی اور یادگارِ داغ یعنی حضرتِ داغ کا آخری دیوان، یادگار ہیں۔
ان کے کلام میں داغ کا رنگِ تغزل بہ لحاظ سلاست زبان و روانی پایا جاتا ہے اور کہیں کہیں لطافت اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ مگر کلام میں ہمواری اور سوز و گداز نہیں ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

نالہ جب تک رسا نہیں ہوتا | بابِ تاثیر وا نہیں ہوتا
غلط ہے کون کہتا ہے کہ ہے غفلت سرا دنیا | یہاں تو ہجر کی شب بھی نہ موت آئی نہ خواب آیا
جما ہوا ہے تصور کچھ اس طرح دل میں | کہ خواب میں بھی اسی کا خیال ہوتا ہے

اختر نگینوی:- سید محمد اختر نام اختر تخلص سادات و روسائے ضلع بجنور میں سے تھے۔ اُن کے تین دیوان شایع ہوچکے ہیں۔ پہلا دیوان نظم دل افروز ۱۳۱۹ھ میں داغ کے زمانۂ حیات میں شایع ہوا تھا ———— جس میں ان کا ایک قطعہ تاریخ بھی ہے۔ دوسرا دیوان ضیائے اختر داغ کی وفات کے بعد چھپا۔ تیسرا دیوان انوارِ اختر ۱۳۵۸ھ میں شایع ہوا۔ آپ کو حضرت داغ کے ساتھ جو محبت و عقیدت تھی وہ بہت کم تلامذہ کو ہوگی۔ آپ کے پاس حضرت داغ کے بہت کثرت سے غیر مطبوعہ خطوط تھے۔
نمونۂ کلام یہ ہے:-

کیا نہیں کرتے کیا نہیں ہوتا | اُن سے وعدہ وفا نہیں ہوتا
یہی دیوانگی ہے اور کیا دیوانگی ہوگی، | یونہیں بیٹھے بٹھائے قصد زنداں کو رہا ہوں میں
ہر چند ظرف ساقی و پیمانہ ایک ہے | لیکن مرا بھی مشربِ رندانہ ایک ہے

اشک دہلوی:- سید قطب الدین احمد اشک ابن سید علیم الدین احمد ساداتِ حسینی سید میر ہاشم فارسی کی اولاد میں تھے اپنے کو دہلوی لکھتے تھے لیکن درحقیقت وہ قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ کے قدیم باشندے تھے۔ مرزا داغ کے دورِ اول کے شاگرد اور بے تکلف

دوست تھے۔ گلزارِ داغ مطبوعہ ۱۲۹۶ھ میں ان کا ایک قطعۂ تاریخ موجود ہے، انھوں نے داغ کی پوری پوری پیروی کی ہے۔ پختگی، روانی، صفائی اور سادگی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ ان کا دیوان چھپا نہیں۔

خوفِ رنجش نہ کچھ اندیشۂ بیداد آیا   لکھ دیا خط میں انھیں وقت پہ جو یاد آیا

جو خوں آلود پیکاں ہو نکالو میرے سینے سے   جو خوں آلود حسرت ہو وہ میرے دل میں رہنے دو

ذیل کا مشہور شعر جو سہل ممتنع کی اچھی نظیر ہے مرزا داغ سے منسوب کیا جاتا ہے درحقیقت اشک کا شعر ہے:-

انھیں اور ہیں کون بہکانے والے   یہی آنے والے یہی جانے والے

آصف - (۱۲۸۳ھ - ۱۳۲۹ھ) — نظام الملک میر محبوب علی خاں، آصف جاہ ششم۔ ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ فنِ شعر سے خاص شغف تھا۔ کلام میں صفائی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

ابھی آنسو پلک تک آیا تھا،   ابھی دیکھا تو ایک دریا تھا

انجام دیکھنا دلِ خانہ خراب کا   اس پر پڑے گا صبر مرے اضطراب کا

تحریرِ محبت نے کیا ان کو خفا اور   تدبیر تو کی اور تھی قسمت سے ہوا اور

جھگڑے تو ہزاروں ہیں مگر بات ہے اتنی   ہم تم سے وفا کر کے پشیمان بہت ہیں

سر اقبال - (۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸ء) ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنے وطن سیال کوٹ میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کے کئی دور ہیں، پہلا دور جب وہ انگلینڈ نہیں گئے تھے اور قومی نظمیں لکھتے تھے۔

دوسرا دور وہ ہے جب وہ یوروپ میں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں فارسی میں زیادہ کہا مگر اسلامی جذبہ اس زمانہ کے کلام میں جھلکنے لگا تھا اور فلسفۂ شاعری پر غالب آگیا تھا۔

تیسرا دور یورپ سے واپسی پر ہوتا ہے جب وطنی جذبے کی جگہ ملّی جذبے نے لے لی۔ تفصیل کے ساتھ ان کی شاعری پر لکھنے کی ضرورت نہیں زندہ جاوید شاعر تھے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالمِ بقا کی طرف رحلت فرمائی۔

تصانیف میں بانگِ درا، ضربِ کلیم، بالِ جبریل اردو میں اور اسرارِ بیخودی، ارمغانِ حجاز، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ وغیرہ فارسی میں شایع ہوکر سرمۂ چشمِ بصیرت بن چکی ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر   مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ   سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ   فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ   کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے   قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

بیباک، شاہ جہاں پوری:- میاں سید احمد حسین ساداتِ شاہ جہاں پور سے تھے، بیباکؔ تخلص فرماتے۔ پہلے خیالؔ شاہجہانپوری سے اصلاح لی پھر فصیح الملک حضرتِ داغ کے شاگرد ہوگئے۔ استاد کے بہت بڑے ارادت مند تھے۔ شعر پوری قوت سے کہتے۔

سید صاحب مرحوم کے کلام میں داغ کے رنگ کے علاوہ کہیں کہیں مومن خاں کا بھی رنگ پایا جاتا ہے:-

یہاں یہ حال کہ ہم دل کو خاک کر بیٹھے   وہاں یہ ذکر کہ اہلِ وفا سے کچھ نہ ہوا

یہ بھی خدا کی شان کہ اک حرفِ آرزو   اس بے وفا کے واسطے افسانہ ہوگیا

جور پر صبر تو ارباب وفا کرتے ہیں — غم اگر حد سے گزر جائے تو کیا کرتے ہیں
قابلِ داد ہے یہ شانِ کرم بھی ان کی — کشتۂ ناز کے جینے کی دعا کرتے ہیں

کرتے ہیں آپ کس سے تغافل کہ ہم نہیں — یہ آخری نگاہ ہے آنکھوں میں دم نہیں
میں جس کو کہہ سکوں وہ نہیں مدعا مرا — تم جس کو سن سکو وہ مرا حالِ غم نہیں

بیخود دہلوی :- حاجی مولوی سید وحیدالدین احمد دہلوی - سید صاحب ۱۲۷۹ھ میں بمقام بھرت پور پیدا ہوئے - تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی - ابتداء میں مولانا حالی کو اپنا کلام دکھایا پھر مولانا نے لے جاکر داغ کا شاگرد کرا دیا -

۱۳، ۱۴ سال کی عمر سے آپ شعر کہتے ہیں - آپ کا کلام دلی کی ٹکسالی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے - غزلیات میں داغ کا پرتو نظر آتا ہے متروکات کے بھی سختی سے پابند ہیں، روزمرہ، روانی اور صفائی بھی ہے مگر پُرگوئی کے سبب کیفیت مفقود ہے - آپ کے دو دیوان گفتارِ بیخود اور درِ شہوارِ بیخود شایع ہو چکے ہیں -

اس وقت دلی میں آپ کا دم بہت غنیمت ہے اگرچہ عرصہ سے آپ گوشہ نشین ہو چکے ہیں -

اور تو تم سے کیا نہیں ہوتا — ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا
بات سننے میں کیا قباحت ہے — ہر سخن مدعا نہیں ہوتا
آپ لائے ہیں ہم پیام اپنا — دوسرے سے ادا نہیں ہوتا

چٹکیاں لینے لگی، دل میں کسی کی یاد بھی — جب ہنسی آئی تو لب پر آگئی فریاد بھی
کیا خبر ہے اس تسلی کا اثر کب تک رہے — تم نے وعدہ تو کیا - لیکن رہے گا یاد بھی

جگر مرادآبادی :- علی سکندر جگر ابن مولوی علی نظر 'نظر' ابنِ حافظ مولوی محمد نور 'نور'، مرادآباد میں اقامت اختیار کر لی - حضرتِ جگر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے - بقولِ حضرتِ نوح ناروی صرف دو تین غزلیں آپ نے مرزا داغ کو دکھائی ہیں - منشی حیات بخش رسا تلامذہ داغ اور منشی امیراللہ تسلیم سے بھی مشورۂ سخن کیا ہے - جناب سیماب کو بھی یہ ادعا ہے کہ حضرت جگر نے مجھ سے بھی اصلاح لی ہے (واللہ اعلم)

حضرت اصغر سے ملنے کے بعد حضرتِ جگر میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا - حضرت جگر نے اکثر اپنے اشعار میں نہایت خلوص و ادب سے ان کا ذکر کیا ہے - حضرتِ جگر کی ابتدائی شاعری کا اندازہ ان کے پہلے دیوان "داغِ جگر" سے لگایا جا سکتا ہے - جس میں سادگی، شوخی اور معاملہ بندی پائی جاتی ہے - دوسرے دور میں ان کے کلام میں سرمستی، کیف و رنگینی پیدا ہو گئی ہے اور کہیں کہیں معرفت کی چاشنی بھی ہے، اب ادھر چند سال سے ان کے کلام میں وہ کیف و دل آویزی نہیں رہی - ان کے کلام میں حشو و زواید اور نامانوس تراکیب کے ساتھ فنی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں، پڑھنے کا انداز نہایت دلپذیر ہے - اُن کا کلام ان ہی کی زبان سے سننے میں زیادہ لطف ہے - ان کے ترنم نے نوجوان طبقہ پر خاص اثر کیا ہے -

جوش ملسیانی :- آپ کا نام لبھورام اور جوش تخلص ہے، یکم فروری ۱۸۸۲ء کو قصبہ ملسیان ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے - ۱۹۰۲ء میں حضرتِ داغ کی شاگردی اختیار کی اور بعد میں نسیم بھرت پوری کو بھی چند غزلیں دکھائیں، غزل اور نظم دونوں خوب کہتے ہیں - کلام میں صفائی اور پختگی پائی جاتی ہے - آپ کا مجموعۂ کلام "بادۂ سرجوش" شایع ہو چکا ہے -

حسن بریلوی :- حاجی مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی، حضرت شاہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے چھوٹے بھائی - شعر و سخن کا طبعی و فطری ذوق تھا - غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے مالک تھے - مزاج میں شوخی و شگفتگی اور زندہ دلی تھی - حضرتِ داغ کے ارشدِ تلامذہ میں شمار تھا - نعتیہ کلام میں ان کا دیوان ذوقِ نعت اور عاشقانہ میں ثمرِ فصاحت، یادگار ہے - مولانا حسن مرحوم نے

۲؍ شوال ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو رحلت فرمائی۔

چشمِ خونبار خدا رحم کرے   تیرا رونا نہیں دیکھا جاتا
الفت ان کی نہیں چھوڑی جاتی   حال دل کا نہیں دیکھا جاتا

دادِ شوریدہ سری کس سے ملے گی یارب   جس جگہ میں ہوں وہاں در نہیں دیوار نہیں

رسا بلند شہری:- منشی سید حیات بخش رسا فخر تلامذہ داغ، ساداتِ قصبہ کا سنہ ضلع بلند شہر سے تھے، مولوی حامد حسن قادری نے انکو فرخ آباد کا باشندہ لکھا ہے جو غلط ہے یہ ضرور ہے کہ وہ کچھ عرصہ فرخ آباد میں بہ سلسلۂ ملازمت رہے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں رام پور میں جو ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا اس میں حضرت مضطر ان کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ رام پور میں ان کی غزل بہت کامیاب رہی۔ مضطر نے نواب صاحب سے ان کی سفارش کی کہ ان کو درباری شعراء میں رکھ لیا جائے چنانچہ نواب صاحب نے ان کو بمشاہرہ ۶۰ روپے ملازم رکھ لیا اور عدالت ہائے ریاست میں وکالت کی اجازت بھی دیدی آخر وقت تک وہیں رہے اور شاید مرض فالج میں ۱۹۱۳ء میں انتقال کیا۔

وہ داغ کے بہترین مقلد تھے۔ شعر بہت بامزہ، صاف اور شوخ کہتے تھے۔ زبان میں ایک عجیب لوچ اور شیرینی ہے۔ اسلوب بیان میں لطافت اور دلکشی ہے۔ ان کا دیوان نہ چھپ سکا۔ مولانا حسرت موہانی مرحوم نے مختلف جرائد سے ان کا کلام جمع کر کے ایک مختصر مجموعہ غزلیاتِ رسا مرتب کیا ہے۔

مہر گوالیاری:- منشی نراین پرشاد ورما مہر ریاست گوالیار کے باشندے تھے۔ مرزا داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا۔ شعر بہت بامزہ اور صاف کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا داغ کے ہندو تلامذہ میں ان سے بہتر کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ ان کا دیوان "شعاعِ مہر" شایع ہو چکا ہے۔

ابھی کچھ اور پروانے گلے ملنے کو باقی ہیں،   ذرا تھمنا ابھی رخصت نہ اے شمعِ سحر ہونا
کچھ کہہ سکے نہ داورِ محشر کے سامنے   آنکھیں بھر آئیں اس کو گنہگار دیکھ کر
جان کر تجھ کو جفا کار۔ وفا کی میں نے   جو خطا کی نہیں جاتی وہ خطا کی میں نے
ہاتھ اٹھے تو ادا حرفِ تمنا نہ ہوا   اس دعا گو کو دعا کا بھی سلیقہ نہ ہوا
ان کی خدمت میں رسا بھی ہوگا   کبھی یوں حکمِ خدا بھی ہوگا
کھل جائے بھرم ضبطِ محبت کا نہ ان پر   ڈرتا ہوں کہیں آنکھ میں آنسو نہ بھر آئے

سائل دہلوی:- نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل ابن نواب مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب، ابن نواب ضیاء الدین احمد نیر۔ رئیس دہلی اور جاگیردار لوہارو ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ فصیح الملک مرحوم کے شاگرد ہو گئے نیز ان کا دوسرا عقد ان کی پالک صاحبزادی سے ہوا۔ حضرتِ سائل مرحوم دلی کے آخری یادگار شاعر تھے، نہایت وجیہہ، سرخ و سپید رنگ، اس پر چوگوشیہ ٹوپی، مغلی انگرکھا بہترین لباس زیبِ تن فرماتے۔ جامہ زیبی اور خوش الحانی ان پر ختم تھی۔ اور جس انداز و خوش الحانی سے پڑھتے وہ قابلِ دید و شنید تھی۔ مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے کے وہ ہی موجد ہیں۔ بڑے حاضر طبع شاعر تھے جو کچھ فکر اول میں موزوں ہو جاتا تھا اس پر نظرثانی نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں ایک طرح کی ناہمواری پائی جاتی ہے۔ ان کا کوئی دیوان نہیں چھپا۔ متعدد بیاضوں میں ان کا کلام تھا۔

دو چار مل کے بیٹھ گئے بزمِ عیش ہے   دو چار خم لنڈھا دئے میخانہ ہو گیا
کل شب کو بزمِ مے میں، عدو میہماں نہ تھا   بگڑو نہیں، خفا نہ ہو۔ جانے دو۔ ہاں نہ تھا

خموشی میں ہے عرضِ حال کیا کیا — کوئی سمجھے ہمارا مدعا کیا

ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں لیکن سلیقے سے — نہ قطرہ آستیں پر ہے نہ دھبہ جیب و دامن پر

یہ بھی کوئی رونا ہے کہ دو اشک بھر آئے — آنکھوں میں لہو بن کے دل آئے جگر آئے

سیماب اکبرآبادی - (۱۲۹۹ھ - ۱۹۵۱ء) - عاشق حسین نام - سیماب تخلص، شیخ احمد حسین صدیقی کے صاحبزادے - ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے تحصیل علم کے بعد کچھ عرصہ ریلوے کے محکمہ میں ملازم رہے - وہاں سے مستعفی ہوکر زبان و ادب کی خدمت کے خیال سے آگرہ میں قصر الادب کی بنیاد ڈالی اور ایک ہفتہ وار پرچہ تاج اور ایک ماہانہ پرچہ شاعر نکالا جس نے ان کی شاعری اور شہرت کو فروغ دیا - مرحوم خود بھی شہرت کے بڑے دلدادہ تھے - ان کا رنگِ سخن داغ سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے غزلیں اور نظمیں وغیرہ سب کچھ بہت کہا ہے - مگر بقول حضرتِ نیاز فتحپوری "حضرت سیماب دل سے نہیں دماغ سے شاعری کرتے ہیں"

آغا شاعر دہلوی :- آغا مظفر بیگ نام، شاعر تخلص - ۱۸۷۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے - شاعری کا شوق پیدا ہوا تو نواب احمد سعید خاں طالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے پھر ۲۵، ۳۰ سال کی عمر میں حیدر آباد پہونچکر فصیح الملک مرحوم کی شاگردی اختیار کی اور عرصہ تک ان کی خدمت میں حاضر رہے - ان کو غزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن پر بھی قدرت حاصل تھی پڑھنے کا انداز ایسا دلکش تھا کہ بڑے بڑے ترنم والے منہ دیکھتے رہ جاتے تھے اگرچہ ترنم سے نہیں پڑھتے تھے -

اسی رفتار سے اُٹھے گی قیامت اک دن — یہ خبر ہم کو ترے نقشِ قدم دیتے ہیں،

محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا — اِدھر بات کی چشم تر ہوگئی

بزم دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے — ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

طپش مارہروی :- محمد یوسف حسن نام، طپش تخلص - مارہرہ ضلع ایٹہ کے رہنے والے - رام پور کے درباری شاعر تھے - کلام میں روزمرہ پختگی اور سلاست پائی جاتی ہے - آدمی طبیعت دار تھے -

شبِ غم کا - مرا - اک ساتھ قصہ مختصر ہونا — اِدھر دم توڑنا میرا - اُدھر پیدا سحر ہونا

نگاہیں ملتے ہی یوں کام کر جانا محبت کا — نہ ان کو کچھ خبر ہونا، نہ مجھکو کچھ خبر ہونا

کتنا طویل عمرِ دو روزہ کا ہے بیاں — دو دن کی زندگی کا اک افسانہ ہوگیا

وہاں تو سہل ہے ہر بار جلوہ گر ہونا — یہاں تو ہوش میں آنا محال ہوتا ہے

متین مچھلی شہری :- مولوی متین الدین احمد متین مچھلی شہر ضلع جون پور کے رہنے والے - اس وقت تلامذۂ داغ میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں، بڑا پختہ اور مربوط شعر کہنے والوں میں ہیں، کلام میں روانی اور سنجیدگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے :-

نگاہِ مہر اگر مجھ پر تری اے ماہ رو ہوتی — یہ کیوں جورِ فلک ہوتا یہ کیوں دنیا عدو ہوتی

کہوں عشقِ بتاں کا راز کس سے کون سمجھے گا — کلیم اللہ مل جاتے تو ان سے گفتگو ہوتی،

اللہ رے بدگمانی انھیں خط میں لکھدیا — باتیں نہ کیجئے گا مرے نامہ بر سے آپ

محمود رام پوری :- محمود علی خاں محمود خلف اشرف علی خاں رام پوری نواب مرزا داغ کے عزیز ترین شاگرد تھے -

حضرت محمود ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے - مولوی عبدالرحمٰن اور میاں منصور شاہ منصور سے فارسی پڑھی اور منشی عیوض علی سے فنِ خوش نویسی حاصل کیا - شعر کی طرف طبیعت مائل دیکھکر شاہ صاحب نے داغ کا شاگرد کرادیا، ان کے والد مرزا داغ کے خاص دوست تھے - مرزا داغ کی طلبی پر حیدر آباد تشریف لے گئے انھوں نے اپنے تلامذہ کی اصلاحات کا کام ان کے سپرد کردیا یہ کئی کئی غزلیں روزانہ بناتے اور واپس کردیتے - مرزا داغ کو ان کی اصلاحوں پر اتنا اعتماد تھا کہ اصلاح شدہ غزلوں کو کبھی ملاحظہ نہ فرماتے

صحت زبان کا بڑا خیال تھا - کلام میں شوخی، روانی سلاست، برجستگی، معاملہ بندی کے ساتھ سوز و گداز بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے -

میں مرگیا تو خاک بھی ان کو نہ غم ہوا　　بولے کہ ایک چاہنے والا تو کم ہوا
غیر بھی اب متحمل ہیں، دعا دو ہم کو　　آگیا تم کو سلیقہ ستم آرائی کا
جب کہا اس نے آج کیوں چپ ہو　　پھر شکایت کا حوصلہ نہ ہوا

ناطق گلاؤٹھوی :- آپ کا اسم گرامی سید ابو الحسن - ناطق تخلص - اور گلاوٹھی ضلع بلند شہر وطن ہے - ۱۴ - ۱۵ سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں - مرزا داغ کے آخر زمانہ کے شاگرد ہیں، آپ کے تلامذہ میں مولوی عبدالباری آسی الدنی زیادہ مشہور ہوئے - مرزا داغ کی شاگردی سے پہلے وہ جلال لکھنوی، بیاں میرٹھی اور اطہر ہاپوڑی کو اپنا کلام دکھاتے رہے :-

صبحِ وصال ان کی بلائے کے مرگئے　　ہم مرتے مرتے ایک بڑا کام کر گئے
وہ بیخودی میں خود کو مرا ان سے پوچھنا　　اور ان کا مسکرا کے یہ کہنا کہ مرگئے
پریشاں خاطری تو لے دلِ اندوہ گیں نکلی　　جگر کی پھانس تھی - اچھا ہوا جانِ حزیں نکلی
وہاں پہونچا دیا ہے ہم کو طوفانِ حوادث نے　　جہاں گرداب میں آکر کوئی کشتی نہیں نکلی

نسیم بھرت پوری :- سید شبیر حسن نام - نسیم تخلص پہر سر ریاست بھرت پور کے باشندے - ریاست میں سب انسپکٹر پولیس تھے داغ کے دورِ دوم کے شاگرد تھے اس زمانہ میں وہ ان کے بہترین شاگردوں میں تھے - زبان مرزا داغ کی سی تو نہیں لیکن پھر بھی بہت صاف ہے، کلام میں بلندیِ خیال اور چستی ترکیب نہیں - عین عالمِ جوانی میں انتقال کیا - ان کا ایک مختصر سا دیوان چھپ گیا ہے -

اب حشر میں ہو فیصلۂ ظلم و ستم بھی　　اللہ بھی ہے - غیر بھی ہیں - تم بھی ہو - ہم بھی
ہم تھے اور صبح اک قیامت تھی　　وہ تو رخصت ہوئے گلے مل کے
جان سے تنگ ہیں دنیا سے گزرنے والے　　اے اجل آکہ مرے جاتے ہیں مرنے والے
دل ہو بے چین کہ مضطر ہو جگر کچھ ہو نسیم　　ہاتھ سینہ پہ نہیں وہ کبھی دھرنے والے

نوح ناروی :- آپ کا اسمِ گرامی محمد نوح اور نوح تخلص ہے - آپ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں بمقام بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی پیدا ہوئے - شعر کا شوق پیدا ہوا تو شروع میں میر نجف علی مرحوم سے اصلاح لی پھر فصیح الملک مرحوم کے شاگرد ہوگئے اور استاد کی قدم بوسی کے لئے حیدر آباد تشریف لے گئے، کچھ عرصہ خدمت میں رہنے کے بعد واپس تشریف لے آئے اور اس کے بعد بہت زیادہ مشقِ سخن فرمائی اور غزلیں بغیر اصلاح واپس آنے لگیں - آپ اس وقت داغ کے تلامذۂ ارشد میں سے ہیں - لطف زبان، سلاست و روانی، روز مرہ، الفاظ کی تکرار، تقدیم و تاخیر، شوخی، معاملہ بندی آپ کے کلام کی خاص خصوصیت ہے لیکن کلام میں اثر اور سوز و گداز نہیں ہے - روز مرہ اور لطفِ زبان اور اسلوبِ بیان نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے - غرض فصیح الملک مرحوم کی جملہ خوبیاں آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں - آپ کے تین مجموعہ کلام سفینۂ نوح، طوفانِ نوح اور اعجازِ نوح شایع ہو چکے ہیں -

وہ کہتے ہیں اُدھر مری انجمن میں، مگر میں نہیں اب وہاں جانے والا　　کہ اکثر بلایا - بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اُٹھایا، اُٹھا کر - نکالا
سنتے رہے ہیں آپ کے اوصاف سب ہم　　ملنے کا آپ سے کبھی موقع نہیں ملا
پہلے میرا حال سن - پھر سن کے میرا حال دیکھ　　دیکھ کر پھر غور کر پھر غور کر کے دل سے پوچھ
اور تو الفت نہ نبھنے کا سبب کوئی نہیں　　یا بُرائی آپ میں ہے یا برائی ہم میں ہے
بدلی بھی اُٹھی، بارش بھی ہوئی، شیشے بھی کھلے، ساغر بھی چلے　　ہشیار سب اپنے کام سے ہیں - میخانے میں غافل کوئی نہیں

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)
اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو
جذبات نگاری، سلاست بیان
رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ
سے فن انشاء میں بالکل پہلی
چیز ہیں اور جن کے سامنے
خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے
ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے
اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا
گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر
طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ
کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر
افسانہ جو اردو زبان میں
بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری
کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی
زبان و تخییل اسکی نزاکت
بیان اسکی بلندی مضمون
اور اسکی انشاء عالیہ سحر
حلال کے درجہ تک پہونچتی
ہے۔ یہ اڈیشن نہایت
صحیح اور خوشخط ہے
قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ
تمہید کے ساتھ بہترین
ہندی شاعری کے نمونے
پیش کر کے ان کی ایسی
تشریح کی ہے کہ دل بیتاب
ہو جاتا ہے۔ اردو میں بھی یہ
پہلی کتاب اس موضوع
پر لکھی گئی ہے جس میں
ہندی شاعری کے بے مثل
نمونے نظر آتے ہیں۔
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز
کے دو علمی مضامین
شامل ہیں:-
(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم
کی روحوں کے ساتھ
(۲) مادئین کا مذہب
نہایت مفید و دلچسپ
کتاب ہے۔
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب
کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق
کی تمام نشہ بخش کیفیات
اسکے ایک ایک جملہ میں موجود
ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ
اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر
بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ
اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔
تازہ اڈیشن نہایت صحیح و
خوشخط، سرورق رنگین
قیمت بارہ آنے
علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے
مطالعہ سے ایک شخص انسانی
ہاتھ کی شناخت اور اس
کی لکیروں کو دیکھ کر
اپنے یا دوسرے شخص کے
مستقبل، سیرت، عروج و
زوال، موت و حیات
صحت و بیماری، شہرت و
نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی
کر سکتا ہے۔
قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا
مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے
کہ ہمارے ملک کے ہادیان
طریقت و علمائے کرام کی
اندرونی زندگی کیا ہے اور
ان کا وجود ہماری معاشرت و
اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ
سم قاتل ہے۔ زبان، پلاٹ و
انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ
ان افسانوں کا ہے وہ صرف
دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری
جو ادبیات و تنقید عالیہ کا
عجیب و غریب ذخیرہ ہے
ایک بار اس کو شروع کر دینا
آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی
جدید اڈیشن ہے جس میں
صحت اور نفاست کاغذ
و طباعت کا خاص اہتمام
کیا گیا ہے۔
قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات
کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے
ایران و ہندوستان کا اثر جرمن
شاعری پر۔ فارسی زبان کی
پیدائش پر سرسری نظر۔ اردو
شاعری پر ایک تبصرہ۔ اردو
غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی
نقشہائے رنگ رنگ (غالب
کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ)
ادبیات اور اصول نقد
فنون ادبیہ حقیقت نگاری
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ
معرکۃ الآرا مقالہ جس میں
انہوں نے بتایا ہے کہ
مذہب کی حقیقت کیا
ہے اور دنیا میں یہ کیونکر
رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ
کے بعد انسان خود فیصلہ
کر سکتا ہے کہ مذہب کی
پابندی کیا معنی رکھتی ہے
قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۲۹ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو نقد و نظر پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ٹامس ہنڈس "کی مشہور عالم کتاب "اسلام کے مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اسوقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ سنہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر متعدد نے حصہ لیا ہے۔ اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپکو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، قیام حیدر آباد، زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور انکے فن شعر گوئی پر بھی ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ